....اور ایک بت شکنؒ پیدا ہوا

(حصہ اوّل، حصہ دوم)

(سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی داستان)



....اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

دوسرا حصہ

سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ

علم و عرفان پبلشرز

34۔ اردو بازار، لاہور، فون: 7232336 فیکس: 7352332

www.ilmoirfanpublishers.com. E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

فہرست

پیش لفظ

عالمِ اسلام خصوصاً پاکستان بڑے ہی پُرخطر دور سے گزر رہا ہے۔ یہود اور ہنود نے ایسا حملہ کیا ہے جس کے آگے ہماری نوجوان نسل بلکہ اس نسل کے ماں باپ بھی ہتھیار ڈالتے جا رہے ہیں۔ یہ حملہ ہمارے تفریح کے ذرائع پر کیا گیا ہے۔

تفریح کے ذرائع کیا ہیں؟ — رسالے، فلمیں اور ناول — تفریح انسانی فطرت کی ایک ضرورت ہے جس سے انسان کو محروم نہیں کیا جا سکتا، محروم کرنا بھی نہیں چاہیئے کیونکہ مسلسل کام کاج اور سنجیدہ سوچوں سے اعصاب ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ تھکے ماندے اعصاب، دل اور دماغ کو سکون دینے کے لیے تفریح لازمی ہے۔

ہمارے دو سب سے بڑے دشمنوں — یہودیوں اور ہندوؤں — نے انسانی فطرت کی اس ضرورت کو سمجھتے ہوئے خفیہ طریقوں سے ہمارے لٹریچر میں فحاشی اور جنسی لذّت کے جراثیم چھوڑ دیئے ہیں۔ چونکہ ہر کس و ناکس کہانی پڑھنا اور فلم دیکھنا چاہتا ہے اس لیے ان اخلاق سوز کہانیوں کو مقبولیّت حاصل ہو گئی ہے اور اس کے نتائج اس صورت میں سامنے آئے ہیں کہ ہمارے بچّے اخلاقی لحاظ سے تباہ ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیئے کہ دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا ہے۔

مکتبہ داستان لمیٹڈ اس محاذ پر دشمن کا مقابلہ کرنے اور اپنے نوجوانوں کو جسمانی اور نفسیاتی تباہی سے بچانے کے لیے ایسا لٹریچر پیش کر رہا ہے جو آپ کے اور نوجوانوں کے اس فطری مطالبے کو پورا کرتا ہے کہ کہانی کا انداز ناصحانہ نہ ہو تفریحی ہو اور اس میں سنسنی خیزی اور سسپنس ہو اور جذبات میں ہلچل مچا دے۔

"ایک اور بت شکن پیدا ہوا" ہماری تاریخ کی روئیداد ہے جس کا ہیرو سلطان محمود غزنوی ہے لیکن ہر کہانی میں آپ کو کچھ دوسرے ہیرو بھی ملیں گے۔ یہ کہانیاں تفریح مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ایمان افروز بھی ہیں اور یہ ہماری اُن روایات کا عکس پیش کرتی ہیں جو اسلام اور ہمارے قومی تشخص کی ضامن ہیں۔

عنایت اللہ
مدیر "حکایت" لاہور

نگرکوٹ کی نرتکی

نگرکوٹ ہندوستان کا ایک مشہور قلعہ ہوا کرتا تھا۔ وہ دور قلعوں کا ہی تھا۔ ان کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ ایک سے ایک وسیع اور مضبوط قلعہ تھا لیکن نگرکوٹ کے قلعے کو خصوصی شہرت اس لیے حاصل تھی کہ اس کے اندر بہت بڑا مندر تھا مندر بجائے خود ایک قلعہ تھا۔ اس کے کمرے بھول بھلیوں جیسے تھے۔ اس کا تہ خانہ بھی تھا۔ اس کے مندر میں گھوڑے اور ہاتھی گم ہو جاتے تھے مندر کی حفاظت کے لیے اس کے اردگرد قلعہ تعمیر کر دیا گیا تھا۔

یہ قلعہ اور اس کے اندر کا مندر بھارت کے مشہور شہر کانگڑہ کے قریب ایک پہاڑی پر تعمیر کیا گیا تھا اس سے یہ ناقابل تسخیر ہو گیا تھا۔ قلعے پر یلغار کرنے کے لیے پہاڑی پر چڑھنا پڑتا تھا لیکن قلعے والوں کے تیر اور بڑے بڑے پتھر جو اوپر سے پھینکے جاتے تھے حملہ آوروں کو قلعے تک نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ اس وقت جب سلطان محمود غزنوی نے پشاور، بھیرہ اور ملتان پر قبضہ کر کے ایسی پوزیشن حاصل کر لی تھی جیسے خنجر بھارت ماتا کے دل میں اتر گیا ہو، نگرکوٹ کا قلعہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے لیے غیر معمولی اہمیت کا مقام بن گیا...

اس اہمیت کی وجہ اس مندر کا بڑا پنڈت رادھاکشن تھا جو کٹر برہمن اور اپنے کردار کا آدمی تھا۔ مندروں کے اندر کی دنیا کی جو باتیں مشہور تھیں، ان سے یہ مندر پاک تھا۔ پنڈت رادھاکشن نے ایسا ماحول بنا رکھا تھا کہ وہاں عبادت کا مطلب صرف عبادت تھا۔ وہاں عورتیں بھی جایا کرتی تھیں لیکن پنڈت نے حکم جاری کر رکھا تھا کہ کوئی عورت کسی پنڈت کے پاس نہیں بیٹھ سکتی اور مرد اور عورتیں اکٹھے عبادت

نہیں کر سکتے۔ عورتیں اس کی عقیدت مند تھیں اور ہندوؤں کے رواج کے مطابق عورتیں اس کے پاؤں چھو کر ہاتھ اپنے ماتھے کو لگانے کی کوشش کرتی تھیں لیکن وہ کسی عورت کو، وہ بچی ہو خواہ بوڑھی اپنے قریب نہیں آنے دیتا تھا۔

مندر میں چند اور پنڈت اور چیلے چانٹے بھی تھے۔ عورت کے معاملے میں وہ ان پر بہت سختی کرتا اور ان پر نظر رکھتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ عورت فساد کی جڑ ہے اور عورت میں ایسا جادو ہے جو مرد پر سوار ہوتا ہے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا اور وہ بدی کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ اسی نظریے کے تحت وہ نوجوانی میں تارک الدنیا ہو گیا اور ہمالیہ کی برف بستہ وادیوں میں چلا گیا تھا جہاں سے ہندوؤں کا مقدس دریا گنگا نکلتا ہے۔

پندرہ برس میں اس کا من مر گیا۔ اس کے نفسانی جذبات سرد پڑ گئے اور وہ گنگا کے ساتھ ساتھ پاپیادہ اتر آیا تھا۔ کانگڑہ کے قریب نگر کوٹ کی ایک پہاڑی پر اس نے یہ مندر دیکھا تو وہ اس میں چلا آیا۔

اب اس کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھی لیکن اس کے چہرے پر اور ڈیل ڈول میں بڑھاپے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کی آنکھوں میں جوانی کی چمک ابھی موجود تھی۔ درخت چناروں کی طرح سفید بھی چال میں جنگجو ہمالیے کا جلال تھا۔ وہ اپنی مثال دے کر کہا کرتا تھا کہ میرا جسم دنیا کے لہو و لعب سے اور عورت کے لمس سے پاک رہا ہے اس لیے یہ ایک سو سال تک بھی ایسا ہی تندرست اور تنومند رہے گا اور وہ کہا کرتا تھا کہ جس نے اپنی روح کو پاک رکھا اس کا جسم سدا جوان رہے گا۔

مذہب کے معاملے میں وہ کٹر تھا۔ رامائن اور مہابھارت اسے زبانی یاد تھیں۔ اس کی زبان میں جادو تھا۔ لوگ اسے اوتار (پیغمبر) بھی کہا کرتے تھے۔ اسے ہندو مت کا ستون بھی اور قلعہ دار بھی کہا کرتے تھے۔ راجوں مہاراجوں پر وہ اپنا حکم چلایا کرتا تھا۔ اور راجے مہاراجے اس کے قدموں میں بیٹھ کر بھول جایا کرتے تھے کہ وہ حکمران ہیں اور ان کی رعایا ان کے آگے سجدے کیا کرتی ہے۔

نگر کوٹ کے مندر میں دولت اور زر و جواہرات کے انبار لگے ہوئے تھے۔ تمام راجے مہاراجے مندر کو باقاعدگی سے دل کھول کر نقدی اور سونے چاندی کی صورت میں

تحفے بھی دیا کرتے تھے۔ کانگڑہ کے تمام کسان اور زمیندار مندر کو مالیہ ادا کرتے تھے۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ اس علاقے کی کھیتیاں مندر کی ملکیت تھیں اور کسان مندر کے مزارعے تھے۔ اس دولت کو پنڈت رادھا کشن نہ خود اپنے استعمال میں لاتا تھا، نہ کسی دوسرے پنڈت کو ہاتھ لگانے دیتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ یہ ملک اور ہندو مت کے دفاع کے لیے وقف ہے۔ اس کا کچھ حصہ غریبوں اور یتیموں کی امداد اور تعلیم پر خرچ ہوتا تھا۔

۱۰۰۸ء (۳۹۸ھ) کا واقعہ ہے جب سلطان محمود غزنوی نے پہلے اٹک کے گرد و نواح میں لاہور کے مہاراجہ انند پال کو شکست دے کر بھگایا تھا اور وہ کشمیر چلا گیا اور اپنی راجدھانی سے لمبا عرصہ غیر حاضر رہا۔ پھر سلطان نے بھیرہ کے راجہ بجی رائے کو شکست دی اور فوراً بعد ملتان پر حملہ کر کے ہندوؤں اور عیسائیوں کے آلۂ کار قرامطیوں کی گدی الٹائی اور ملتان کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور پھر انند پال کے بیٹے سکھ پال نے سلطان محمود سے بھیرہ کے میدان میں شکست کھا کر ہتھیار ڈالے اور اسلام قبول کر لیا۔ اس نے سلطان کی غیر حاضری میں غزنی کی فوج کو دھوکہ دے کر بھیرہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر بری طرح ناکام رہا اور سلطان محمود نے غزنی کی خانہ جنگی سے فارغ ہو کر بھیرہ میں آ کے سکھ پال کو عمر بھر کے لیے قید میں ڈال دیا۔

۱۰۱۰ء میں اسلام کا کانٹا مہابھارت کے دل میں اتر گیا تو نگر کوٹ میں پنڈت رادھا کشن کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ اسے مسلمانوں کی فتوحات کی اطلاعیں بھیرہ، پشاور اور لاہور سے ملی تھیں اور اسے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ مہاراجہ انند پال راجدھانی سے غیر حاضر ہے۔ پنڈت رادھا کشن نے ہندوستان کی ریاستوں اجین، قنوج، گوالیار، کالنجر (موجودہ کوٹلی آزاد کشمیر) اور اجمیر کے راجوں مہاراجوں کو نگر کوٹ بلایا۔ سب نے حکم کی تعمیل کی۔

"کیا تم سب نے عیش و عشرت کا پھل پا لیا ہے یا کچھ اور مانگتے ہو؟" — پنڈت رادھا کشن نے مندر میں بٹھا کر ان مہاراجوں سے کہا۔ "تمہاری شکست کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم نے اپنے محل سورگ کی طرح بنا رکھے ہیں۔ تمہیں سلاتی ہیں تو عورتیں، تمہیں جگاتی ہیں تو عورتیں، تمہیں نہلاتی ہیں تو عورتیں اور عورتیں بھی وہ جو حسن میں بے مثال اور بے حیائی میں لاجواب ہیں۔ تم پیاس میٹھی شراب

سے بچھاتے ہو۔"

"شکست راجہ انند پال نے کھائی ہے"۔ ایک مہاراجہ نے کہا "مسلمان جب میرے مقابلے میں آئیں گے تو ...."

"اس دیس کے ہر ہندو نے شکست کھائی ہے"۔ پنڈت رادھا کشن نے گرج کر کہا۔ "کیا تم ہندو نہیں ہو؟ غزنی کے ایک مسلمان سلطان نے ہندو دھرم کو شکست دی ہے۔ یہ تمہاری شکست ہے، یہ میری شکست ہے۔ کیا بھیرہ اور ملتان کے مندر تمہارے لیے مقدس نہیں؟ مسلمانوں نے دیوی دیوتاؤں کے جو بت اور اوتاروں کی جو مورتیاں توڑ پھوڑ کر باہر پھینکیں اور مسلمانوں نے جنہیں اپنے اور اپنے گھوڑوں کے قدموں میں روندا، ان کا تمہارے دھرم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا؟ جہاں سنکھ اور گھڑیال بجتے تھے، جہاں کے پر لوبے اور جہاں کی ہوائیں بھجن اور اشلوک سنا کرتی تھیں وہاں اب اذانیں سنائی دیتی ہیں۔"

راجوں مہاراجوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ پنڈت کہہ رہا تھا۔ "وہاں کی اذانیں مجھے یہاں سنائی دے رہی ہیں۔ میں راتوں کو سوتا نہیں۔ مجھے ہری کشن اور ہری رام کی بجائے اذانیں سنائی دے رہی ہیں۔ میں مندر کے اندر جانے سے ڈرتا ہوں۔ مجھے بت غصے سے گھورتے ہیں۔ میں نے مورتیوں کے چہروں پر قہر دیکھا ہے۔ مجھے یہ سارا مندر، یہ قلعہ اور یہ پہاڑ جس پر یہ کھڑے ہیں، سب ہلتے اور لرزتے ہوئے لگتے ہیں۔ کیا تم برداشت کر لو گے کہ مسلمان یہیں بھی آکر توڑ دیں اور اس مندر میں بھی اذانیں گونجیں؟"

"ایسا نہیں ہو گا مہاراج!"۔ سب کی پرعزم آوازیں اٹھیں۔ "ہم اپنا سب کچھ قربان کر دیں گے۔ اس دیس میں جو مسلمان آ گئے ہیں، ان میں سے کوئی بھی زندہ واپس نہیں جائے گا۔"

"وہ واپس نہیں جائیں گے"۔ پنڈت رادھا کشن نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "وہ یہاں تک آئیں گے۔ میں اپنی روح کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، اپنی عقل کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ آئیں گے۔ وہ اس لیے آئیں گے کہ تم یہاں نہیں ہو۔ تم عورت اور شراب کے نشے میں گم ہو گئے ہو۔ کیا مسلمان حسین اور جوان ناچنے گانے والیوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں جس طرح تم اس اونچے مندر میں آئے ہو اور اپنے ساتھ پاپ

کا سارا سامان لائے ہو .... میں کیوں پریشان ہو رہا ہوں؟ مجھے نیند کیوں نہیں آتی؟ میں راتوں کو گنگا ماتا کی آغوش میں ڈوب کر کیوں رویا کرتا ہوں؟ میری کوئی راجدھانی نہیں، میری کوئی ریاست نہیں جس کا مجھے غم ہو لیکن میری آنکھوں سے دیکھو، میری عقل سے سوچو۔ یہ سارا دیش میرا دیش ہے۔ یہ لڑائی کسی زمین کے لیے نہیں لڑی جا رہی۔ یہ ہندو دھرم اور اسلام کی لڑائی ہے۔ محمد بن قاسم کے بعد ہمارے دادا پردادا نے بڑی مشکل سے اسلام کو اس دیش سے نکالا تھا مگر آج اسلام ایک بار پھر طوفان کی طرح آیا ہے اور تم عیش و عشرت میں بدمست ہو ...

"تم مذہب کو بھول جاؤ۔ اپنے آپ کی سوچو۔ تم شکست کھا گئے تو کہاں جاؤ گے؟ .... تمہاری لاشوں کو کریا کرم نصیب نہ ہو گا۔ زندہ رہو گے تو مسلمانوں کے قید خانے میں پڑے گلتے سڑتے رہو گے اور تمہاری بیٹیوں کے ساتھ مسلمان وہی سلوک کریں گے جو تم ان ناچنے گانے والیوں کے ساتھ کر رہے ہو جنہیں تم یہاں بھی اپنے ساتھ لائے ہو۔"

پنڈت کی آواز میں اور اس کے الفاظ میں ایسا تاثر پیدا ہوتا چلا گیا کہ راجوں مہاراجوں کا خون کھولنے لگا۔ وہ بھڑک بھڑک کر سلطان محمود پر جوابی حملے کی باتیں کرنے لگے۔ وہ غزنی کی فوج کو اپنی متحدہ فوج سے بھیرہ اور ملتان میں محصور کر کے ختم کرنے کی باتیں کر رہے تھے ..

"عقل سے کام لو"۔ پنڈت نے کہا۔ "اپنی تمام فوجوں کو اکٹھا کر کے پشاور کی طرف کوچ کر دو اور مسلمانوں کے سلطان کو وہاں کہیں پہاڑی علاقے میں گھسیٹ کر لے جاؤ اور اسے وادیوں میں گھما گھما کر مار دو اور غزنی پر چڑھائی کر دو۔ بھیرہ اور ملتان خود ہی تمہاری جھولی میں آ گریں گے۔ اگر تم پشاور کے قریب لڑو گے تو تمہارے مقابلے میں غزنی کی فوج کا تیسرا حصہ ہو گا۔ بھیرہ اور ملتان سے جانے والی کمک کو تم راستے میں روک سکو گے۔"

کچھ دیر جنگ کی تکنیک پر بحث ہوتی رہی۔ سب مہاراجہ انند پال کی کمی محسوس کر رہے تھے۔ پنڈت نے کہا کہ معلوم ہوا ہے کہ وہ کشمیر میں ہے۔ اسے واپس بلایا جائے ".... اور اپنی اپنی ریاست میں منادی کرا دو کہ مسلمانوں کو یہاں سے نکالنے کے لیے

فوجوں کو ہتھیاروں، جانوروں، اناج، کپڑوں، خیموں اور سامان کی ضرورت ہے" پنڈت نے کہا۔ "اس کے لیے رقم چاہیے۔ ہر وہ آدمی جو لڑ سکتا ہے، فوج میں شامل ہو جائے۔"

"ہم لاہور میں دوبار ایک ایک جوان لڑکی کی جان کی قربانی بھی دے چکے ہیں" ایک راجہ نے کہا "معلوم ہوتا ہے بھگوان ہم پر اتنے ناراض ہیں کہ دونوں قربانیاں قبول نہیں ہوئیں۔"

"اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لڑکیاں پاک نہیں تھیں" پنڈت رادھا کشن نے کہا۔ "میں پنڈتوں کو جانتا ہوں۔ وہ لڑکیوں کو بہت دن اپنے پاس رکھتے ہیں اور دیوتاؤں کی امانت میں خیانت کرتے ہیں۔ ایسے بدکار پنڈتوں کے ہاتھوں دلائی ہوئی قربانی قبول نہیں ہو سکتی.... میں یہ سوچ چکا ہوں۔ دیوی ایک انسان کی قربانی مانگتی ہے۔ یہ قربانی کم میں سے کسی ایک کی رقاصہ کی دی جائے گی۔ رقاصہ ایسی ہونی چاہیے جو بہت ہی خوبصورت ہو، جوان ہو اور جو اپنے راجہ کو بہت عزیز ہو اور اس کا مسلمان ہونا ضروری ہے۔"

"مگر رقاصہ پاک نہیں ہو سکتی مہاراج!" ایک راجے نے کہا۔ "اور آپ کہہ رہے ہیں کہ مسلمان بھی ہو۔"

"اسے کوئی پنڈت بری نیت سے اپنے پاس نہ رکھے" پنڈت نے کہا "میں اسے پاک کرتا ہوں.... اسے میں اس مندر میں رکھوں گا۔ تم دیکھنا اس کی جان قبول ہوتی ہے یا نہیں۔ رقاصہ کا انتخاب میں خود کروں گا۔"

ان تمام ریاستوں میں جو آدھے ہندوستان میں پھیلی ہوئی تھیں، مندروں میں گلیوں میں، بازاروں میں گھروں میں ہندوؤں کی زبان پر یہی الفاظ چڑھ گئے "مسلمان فتح پہ فتح حاصل کرتے آ رہے ہیں۔ انہوں نے پشاور سے لے کر ملتان تک تمام جوان ہندو لڑکیاں اپنی فوج میں تقسیم کر دی ہیں۔ مندروں میں گھوڑے اور بیل بندھے ہوتے ہیں۔ ہتھیار ڈالنے والے فوجی زندہ میں مگر کوڑھی ہو گئے ہیں۔ دیوتاؤں کا قہر ہے یہ سب پر گرے گا۔"

ہر کسی پر خوف طاری ہوا جا رہا تھا۔ مندروں میں پنڈت مذہب کی باتیں کم کرتے اور مسلمانوں کے خلاف نفرت زیادہ پھیلاتے تھے۔ انہوں نے سب سے زیادہ عورتوں کو ڈرایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ (گردیزی اور عتبی کے الفاظ میں) "ہندو عورتوں نے اپنے زیورات بیچ کر قیمتیں اپنے راجاؤں کے حوالے کر دیں جن عورتوں کے پاس زیورات نہیں تھے، انہوں نے سوت کات کر بیچا اور پیسے خزانے میں جمع کرا دیے۔ غریب عورتوں نے مزدوری کر کر کے بھی خزانے کو پیسے دیئے۔ جسے دیکھو، وہ پیسہ کمانے اور خزانے کو دینے کی فکر میں تھا جوان آدمی فوج میں شامل ہونے لگے۔ وہ اپنے گھوڑے بھی ساتھ لے گئے۔"

ایک جنون تھا جو ہندو قوم پر طاری ہو گیا تھا۔ آتش فشاں پہاڑ کے اندر لاوا اُبل رہا تھا اور اندر سے پہاڑ گھٹتا جا رہا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ پہاڑ کا دہانہ پھٹے گا تو لاوا ساری دنیا کو نیست و نابود کر دے گا۔

سلطان محمود غزنوی اس پہاڑ کے دامن میں بیٹھا تھا۔ وہ اپنے اُن بھائیوں کے خلاف لڑ کر آیا تھا جو اس کے ارادوں اور اس کے ایمان سے بے پرواہ، اس کی سلطنت غزنی پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے جتن کر رہے تھے۔ ان ایمان فروشوں کے عزائم کو کچلنے کے لیے غزنی کی سرحدوں پر کافی فوج رکھنے کی ضرورت تھی۔ اگر وہاں یہ صورت حال نہ ہوتی تو وہ فوج ہندوستان میں کام آ سکتی تھی بھیرہ اور ملتان کی لڑائیوں میں اس کی فوج کی بہت سی نفری ماری گئی تھی۔ اس نے اس کمی کو نئی بھرتی سے کسی حد تک پورا کر لیا تھا لیکن یہ کافی نہیں تھی۔

سلطان اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا کہ ہندو راجے اس سے شکست دب گئے۔ اُن کا جوابی حملہ لازمی تھا۔ سلطان وقت حاصل کرنے کی خواہش لیے ہوئے تھا۔ اسے راجہ انند پال کی طرف سے زیادہ خطرہ تھا، اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ تمام راجے مہاراجے متحد ہو کر بھی آ سکتے ہیں۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ اس نے اپنی فوج کو آرام سے نہ بیٹھنے دیا۔ ٹریننگ میں زیادہ وقت صرف کرتا اور فوج میں ڈسپلن پر زیادہ زور دیتا تھا۔ یہ کام

فوج کے امام کرتے تھے جو فوج کو اس جنگ کی غرض و غایت بتاتے رہتے تھے۔

سلطان محمود نے اپنی فوج کو مالِ غنیمت سے کبھی محروم نہیں رکھا تھا لیکن انہیں مفتوحہ علاقے میں لوٹ مار کی کبھی اجازت نہیں دی تھی۔

اُس نے تمام ہندو ریاستوں کی راجدھانیوں میں اپنے جاسوس پھیلا رکھے تھے۔ ان جگہوں کے مقامی مسلمان ان جاسوسوں کی بہت مدد کرتے تھے۔ ان میں ایمان فروش بھی تھے جو سلطان کے جاسوسوں کو پکڑوا بھی دیا کرتے تھے۔ بہرحال سلطان کو اطلاعیں ملتی رہتی تھیں کہ دشمن کیا کر رہا ہے۔

راجہ انند پال کشمیر سے لاہور واپس آ گیا تھا۔ اُس نے وہاں سے کچھ فوج اکٹھی کر لی تھی۔ وہ شکست کھا کر گیا تھا۔ اُس نے سلطان محمود سے صلح اور امن کا معاہدہ کرنے کی ایک کوشش کی تھی۔ مؤرخوں میں اس کا ذکر صرف البیرونی نے کیا ہے جس کی تحریریں مستند مانی جاتی ہیں۔ البیرونی سلطان محمود غزنوی کے ساتھ تھا۔ وہ بہت سے اہم واقعات کا عینی شاہد ہے۔ سلطان محمود غزنوی جب بھیرہ اور ملتان کی فتح کے بعد غزنی اس اطلاع پر گیا تھا کہ کاشغر کی فوج نے اُس کی سلطنت پر حملہ کر دیا ہے تو اُسے وہاں زندگی اور موت کا معرکہ لڑنا پڑا تھا۔ بعض اوقات اُس کی کامیابی مخدوش نظر آنے لگتی تھی۔ سلطان کی اس کیفیت کی اطلاع کسی طرح راجہ انند پال تک پہنچ گئی۔ البیرونی لکھتا ہے کہ انند پال نے اپنے ایک قاصد کے ہاتھ سلطان محمود کو یہ تحریری پیغام بھیجا۔

"مجھے پتہ چلا ہے کہ ترکوں نے آپ کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور وہ خراسان تک پھیل گئے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں پانچ ہزار سواروں، دس ہزار پیادوں اور ایک سو ہاتھیوں کے ساتھ آپ کی مدد کو آ سکتا ہوں، اور اگر آپ پسند کریں تو میں اپنی جگہ اپنے بیٹے کو بھیج دوں گا اور اُس کے ساتھ فوج اس سے دگنی بھیجوں گا۔ اس اقدام اور پیش کش سے آپ جو بھی تاثر لیں گے، میں اسے نظر انداز کرتا ہوں۔ آپ نے مجھ پر فتح پائی ہے، میں نہیں چاہتا کہ کوئی آپ پر فتح پائے۔"

اس پیغام اور اس پیش کش سے اندازہ ہوتا ہے کہ راجہ انند پال سلطان محمود سے کس قدر خائف تھا اور اُس میں اب لڑنے کی جرأت نہیں رہی تھی لیکن محمود جس قدر قابل جرنیل تھا، اتنا ہی قابل سیاست دان تھا۔ اُسے معاہدوں کے سلسلے میں ہندوؤں کی ذہنیت کا پتہ چل چکا تھا۔ اُسے مدد کی ضرورت تھی لیکن وہ ہندو راجے کی مدد کا خواہشمند نہیں تھا۔ اُس نے یہ خطرہ بھی دیکھا کہ راجہ انند پال اُسے فوجی مدد کا جھانسہ دے کر یہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے کہ سلطان غزنی میں ہی لڑتا مرتا رہے۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ راجہ فوج لے آئے اور سلطان کو کسی خطرناک صورتِ حال میں چھوڑ کر دشمن سے جا ملے۔

"کیا انند پال تاریخ کو اور ہمارے آنے والی نسلوں کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ میں ہندوؤں کی مدد سے جیتا تھا؟" — سلطان محمود نے انند پال کا پیغام اپنے سالاروں اور مشیروں کو پڑھ کر کہا۔ "اس میں کوئی اور خطرہ نہ بھی ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دو ایسے مذہبوں کے حکمران جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، دوست بن جائیں۔ میں ایسی پیش کش قبول نہیں کر سکتا۔ اپنے مذہب کے دشمن کو دوست نہیں بنایا جا سکتا۔"

اُس نے انند پال کے قاصد کو زبانی جواب دیا کہ اپنے راجہ سے کہنا کہ ہمارا اور آپ کا سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ ہمارے درمیان امن ناممکن ہے۔

اس جواب کے بعد راجہ انند پال لاہور آ گیا۔ صلح کی پیش کش مسترد ہو جانے کے بعد اُس کے لیے اب یہی راستہ رہ گیا تھا کہ سلطان محمود سے فیصلہ کن معرکہ لڑے۔ اُس کے پاس فوج کی کمی نہیں تھی۔ اُس نے آتے ہی اپنے وزیر، اپنے جرنیلوں اور اپنے مشیروں کی کانفرنس بلائی اور ان سب کو بتایا کہ وہ بہت تھوڑے سے وقت میں تیاری کر کے بھیرہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اس پر بحث کے دوران یہ مسئلہ بھی زیرِ بحث آیا کہ سلطان محمود نسبتاً کم فوج سے اتنی بڑی فوج کو کس طرح شکست دے دیتا ہے۔

"اُسے آج تک ہم اور سورگباشی مہاراجہ جے پال بے خبری میں نہیں دبوچ سکے۔" ایک جرنیل نے کہا۔ "اُسے اتنی قبل از وقت ہماری پیشقدمی کی اطلاع مل جاتی ہے کہ وہ اپنی فوج کو نہایت اچھی ترتیب میں تقسیم کر لیتا ہے۔ ہم ہر بار اُس کی گھات میں آئے ہیں۔ اس

سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے جاسوس بہت ہوشیار ہیں۔ یہ جاسوس ہمارے درمیان گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔"

"یہاں مسلمانوں کی جو تھوڑی سی آبادی ہے، ان میں اُس کے جاسوس ہیں" ــــ راجہ انندپال نے کہا۔ "کیوں نہ اس پوری آبادی کو صاف کر دیا جائے۔"

"یہ اقدام ہمیں کوئی فائدہ نہیں دے گا" ــ وزیر نے کہا۔ "یہ لوگ یہاں سے بھاگ جائیں گے۔ جاسوس فوراً نکل جائیں گے۔ ایسی کارروائی کریں کہ ہمیں جاسوس مل جائیں۔ یہاں کے مسلمانوں کو اپنا دشمن نہ بنائیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ کتنے ہی مسلمان ہمارے لیے مخبری اور جاسوسی کرتے ہیں۔ مسلمان کی مخبری مسلمان ہی کر سکتا ہے۔ ہم ایسا انتظام کریں گے کہ مسلمان گھرانوں پر نظر رکھیں اور خفیہ طریقے سے پتہ چلائیں کہ کون جاسوس ہے۔ اگر ایک پکڑا گیا تو ہم طریقے جانتے ہیں کہ اُس سے معلوم کیا جائے کہ یہاں کون کون جاسوس ہے۔"

"یہ کام آج ہی شروع کر دو" ــ راجہ نے کہا۔ "اور فوج کو تیار کر دو۔"

"لوگ بہت مدد کر رہے ہیں" ــ وزیر نے کہا۔ "مندروں میں پنڈتوں نے لوگوں کو جنگی تیاری اور فوج کی ضروریات کے متعلق بتلایا ہے" ــ وزیر نے بتایا کہ لوگوں کو کیا کچھ بتایا جا رہا ہے اور لوگ کس طرح مدد دے رہے ہیں۔

راجہ انندپال کے راج محل میں گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والوں کا انچارج شعیب ارمغانی نام کا ایک مسلمان تھا جو گھوڑوں کو سدھانے کا ماہر اور شہسوار تھا۔ وہ پشاور کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ راجہ جے پال کے آخری دور میں یہاں آیا تھا۔ اُس وقت وہ نوجوان تھا اور اب پختہ کار جوان بن چکا تھا۔ اُس نے بڑے خود سر اور عادی بے لگام گھوڑوں کو بھی رام کر لیا تھا۔ راجہ جے پال کے بعد اُس کا بیٹا راجہ انندپال بھی اسے بہت چاہتا تھا۔

گھوڑوں کی مہارت کے علاوہ اُس میں کچھ اور خوبیاں بھی تھیں جن کی بدولت وہ محل کی رانیوں اور راجکماریوں کو بھی اچھا لگتا تھا۔ ایک تو وہ خوبرو تھا۔ اُس کا رنگ گورا اور آنکھیں سبز تھیں۔ دوسرے یہ کہ اُس کی زبان میں چاشنی تھی اور اُس کے ہونٹوں پر

تبسم رہتا تھا۔ وہ دراز قد اور گٹھے ہوئے جسم کا جوان تھا۔ گھوڑے بھی جیسے اُس سے محبت کرتے تھے۔ اُس کی وفاداری میں کسی کو شک نہیں تھا۔ اُس کی وفاداری بھی ایسی کہ اُس کے متعلق راج محل میں کہتے تھے کہ یہ نام کا مسلمان ہے۔

محل کے عملے میں چند ایک مسلمان ملازم بھی تھے جو چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھے۔

راجہ انندپال کے نئے حکم کے مطابق خفیہ طریقے سے ان سب کی نگرانی ہونے لگی۔ ہندو فوجی مسلمانوں کے بھیس میں انہیں جانچنے اور پرکھنے لگے۔ ہندوؤں کی ذہین اور چالاک لڑکیاں مسلمان لڑکیوں کے بھیس میں مسلمانوں کے گھروں میں جاتیں، محمود غزنوی کے حق میں اور ہندوؤں کے خلاف باتیں کرتیں اور مسلمان عورتوں سے اُن کے مردوں کے خیالات اور خفیہ سرگرمیوں سے متعلق پتہ چلانے کی کوشش کرتیں۔ ہندو مرد آج کی پولیس کی طرح مسلمان مردوں سے ملتے۔ راز و نیاز کی باتیں کرتے۔ اپنے آپ کو سلطان محمود کے جاسوس کہتے۔ اس خفیہ مہم میں کئی ایک مسلمان پکڑے گئے۔ جس کسی پر ذرا سا شک ہوتا تھا، اُسے بھی پکڑ لیتے اور یہ سب "تشدد" کی چکی میں پسنے لگے۔

شعیب ارمغانی پر شک کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اُس کی سرگرمیاں گھوڑوں تک محدود تھیں۔ اُس پر صرف اس بنا پر شک کیا جا سکتا تھا کہ وہ اکیلا رہتا تھا۔ اُس وقت تک اُسے دو تین بچوں کا باپ بن جانا چاہیے تھا لیکن وہ اکیلا تھا۔ اگر اس کی بیوی پشاور میں تھی تو اُسے کبھی بھی لاہور نہیں لایا تھا۔ اگر اُس نے شادی نہیں کی تھی تو اب تک کر لینی چاہیے تھی۔ یہی ایک پہلو تھا جو اُس کے خلاف کچھ شک پیدا کر سکتا تھا لیکن ہندو اُسے اپنی خفیہ مہم سے محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ اُس نے کئی بار سلطان محمود کے خلاف باتیں کی تھیں۔ اُسے کبھی مسجد میں جاتے نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ نماز روزے سے بھی فارغ تھا۔ اُس کے متعلق معلوم کر لیا گیا تھا کہ وہ کسی مسلمان سے نہیں ملتا۔

ایک شام وہ اپنے گھر میں اکیلا تھا۔ اُس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک سیاہ ریش اجنبی کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک عورت تھی جس نے چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ اس اجنبی نے اپنا تعارف یوں کرایا کہ وہ پشاور

کا تاجر ہے اور سامان لے کر آیا ہے، اور اُس کے ساتھ اس کی جوان سال بیٹی ہے جسے وہ اس لیے ساتھ لایا ہے کہ اس کی بیوی مر چکی ہے اور گھر میں اور کوئی نہیں جس کے پاس وہ بیٹی کو چھوڑ کر آتا۔ بیٹی کی خواہش سیر کی بھی تھی، اس لیے وہ اسے ساتھ لے آیا ہے۔ وہ پشاور کی زبان بول رہا تھا۔

"سرائے میں رہائش کا انتظام اچھا ہے"۔ اجنبی نے کہا۔ "لیکن اتنی جوان اور ایسی خوبصورت بیٹی کو سرائے میں رکھنا ٹھیک نہیں۔ سنا ہے ہندو فوج چھاپے مارتی رہتی ہے اور مسلمانوں کو شک میں پکڑ لیتے ہیں۔ کسی نے آپ کے متعلق بتایا ہے کہ آپ اکیلے رہتے ہیں اور لوگ آپ کی شرافت اور نیت کی تعریف کرتے ہیں۔ مجھے آپ کے گھر کا راستہ دکھایا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ ہمارے ہی وطن کے رہنے والے ہیں"۔

"ایک مسلمان کسی مسافر پر اپنے گھر کا دروازہ بند نہیں کر سکتا"۔ ارمغانی نے کہا۔ "اور جہاں ایک مسلمان خاتون کی عزت کا معاملہ ہو وہاں میں ساری رات پہرہ بھی دے سکتا ہوں۔ مسلمان ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہوا کرتے۔ آؤ، اپنی بیٹی کو لے آؤ۔ میرے گھر میں بہت کمرے ہیں"۔

وہ دونو اُس کے ساتھ اُسی کے کمرے میں آ گئے۔ خاتون نے دیئے کی روشنی میں چہرے سے نقاب ہٹایا تو ارمغانی کو دھچکہ سا لگا۔ وہ عورت نہیں، جوان لڑکی تھی اور اُس کے حسن میں کوئی ایسی کشش تھی کہ ارمغانی سُن ہو کے رہ گیا۔ اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا — "آپ نے اچھا کیا ہے کہ سرائے میں نہیں ٹھہرے۔ چھپا کر رکھنے والی چیز وں کو ایک نہیں سات پردوں میں چھپا کر رکھنا چاہیئے"۔

انہیں بٹھا کر وہ دوڑتا ہوا باہر نکلا اور بازار سے مہمانوں کے لیے کھانا لے آیا۔ لڑکی نے برقعہ نما چادر بھی اتار دی تھی۔ اُس کا قد اور سراپا اس قدر دلنشیں تھا کہ ارمغانی اُس سے نظریں نہ ہٹا سکا۔ راج محل کی نوکری میں کئی لڑکیوں نے ارمغانی پر ڈورے ڈالے تھے لیکن اُس نے اپنے دامن کو ہر کسی سے پاک رکھا تھا۔ راجہ انند پال کی دو راجکماریاں

اُس سے گھوڑ سواری سیکھنے آتی تھیں۔ دونو کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ خود گھوڑے پر نہ بیٹھیں، ارمغانی انہیں اٹھا کر گھوڑے پر بٹھائے۔ وہ گھوڑ سواری سیکھ چکیں تو بھی کہتی تھیں کہ نہیں، وہ ابھی طاق نہیں ہوئیں۔

یہ دونو خوبصورت لڑکیاں تھیں لیکن ارمغانی اِن کے اتنے واضح اشاروں کو بھی یوں نظر انداز کر دیتا تھا جیسے وہ بدھو اور جاہل ہو یا اس کے سینے میں مرد کا دل ہی نہ ہو۔ ایک بار ایک راجکماری گھوڑا سرپٹ دوڑانے کے بہانے اُسے دریا کے کنارے جنگل میں لے گئی تھی اور وہاں جا کر ارمغانی سے کہا کہ میرے گھوڑے پر میرے پیچھے سوار ہو جاؤ، مجھے ڈر آتا ہے۔ ارمغانی نے انکار کر دیا تھا۔ راجکماری نے پہلے التجا کی کہ آ جاؤ میرے پیچھے اور مجھے اپنے بازوؤں میں پکڑ لو۔ وہ نہ مانا تو راجکماری نے اُسے حکم دیا کہ میرے پیچھے بیٹھو۔ ارمغانی نے مسکرا کر انکار کر دیا تھا۔ راجکماری غصے سے گھوڑا واپس لے آئی تھی۔

اس معاملے میں وہ پتھر تھا لیکن اپنے مہمان کی بیٹی کو دیکھ کر اُس نے اپنے آپ میں ایسی ہلچل محسوس کی جس سے وہ آشنا نہیں تھا۔ وہ اِس لڑکی کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر اتنا بھروسہ تھا کہ اُس کی نیت بد نہیں ہو سکتی تھی، پھر بھی اُس کے دل میں یہ خواہش تڑپ لی کہ اُس کا مہمان ذرا باہر چلا جائے اور وہ اس لڑکی کے ساتھ باتیں کرے۔ لڑکی اُسے دیکھتی تھی تو اُس کے ہونٹوں پر شرمیلا سا تبسم آ جاتا تھا۔ یہ تبسم ارمغانی کے پاؤں اکھاڑ دیتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ارمغانی نے مہمانوں کو اُن کا کمرہ دکھایا۔ لڑکی اُسی کمرے میں رہ گئی اور لیٹ گئی اور اُس کا باپ ارمغانی کے کمرے میں آن بیٹھا۔ گپ شپ چلی تو مسلمان ہونے کی وجہ سے سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کی باتیں ہونے لگیں۔ دونو نے خوشی کا اظہار کیا۔ مہمان کی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ سلطان محمود کا شیدائی ہے اور وہ صرف تاجر ہی نہیں، علم و فضل پر بھی دسترس رکھتا ہے۔ اُس نے محمد بن قاسم کی بھی باتیں کیں اور کہنے لگا کہ اُس کا بس چلے تو سارے ہندوستان کو مسلمان کر دے۔ اُس نے اس پریشانی کا بھی اظہار

کیا کہ سلطان محمود کے پاس فوج کی کمی ہے اور اگر تمام راجوں نے اُس پر حملہ کر دیا تو مسلمانوں کی فوج مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ ارمغانی نے کہا کہ مسلمان کو اپنے اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

"لیکن مسلمان کو بھی کچھ کرنا چاہیے" — مہمان نے کہا۔ "ہم دو مسلمان یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم اُس سلطان کی کیا مدد کر رہے ہیں جو کافروں کے دیس میں اللہ اور رسول ﷺ کا پیغام لے کر آیا ہے اور کفر کی ساری طاقتیں اس کے خلاف ہیں... میں تجارت کر رہا ہوں اور تم ہندوؤں کی نوکری کر رہے ہو؟"

"ضرورت پڑی تو میں نوکری چھوڑ دوں گا" — ارمغانی نے کہا۔

"نہیں" — مہمان تاجر نے کہا۔ "میں نے تمہارے ساتھ یہ باتیں اس لیے کی تھیں کہ دیکھوں کہ تم کیسے مسلمان ہو اور اسلام کے ساتھ تمہارا رشتہ کتنا ہے.... میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم اپنے رسول ﷺ کے نام پر مر مٹنے والے مسلمان ہو۔ میں تمہارے ساتھ دل کی بات کر سکتا ہوں۔ تم نے نوکری چھوڑ دینے کی بات کی ہے۔ یہ غلط ارادہ ہے۔ تم اس نوکری کو سلطان محمود کے فائدے کے لیے استعمال کر سکتے ہو۔ تم راج محل میں کام کرتے ہو۔ تمہارے گھر کا راستہ دکھانے والوں نے مجھے بتلایا ہے کہ گھوڑوں کا استاد ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کی فوج کے بڑے بڑے ناکم اور محل کی شہزادیاں بھی تمہیں جانتی ہیں.... تمہیں کرنا کچھ بھی نہیں۔ یہ معلوم کرتے رہو کہ راجہ کے ارادے کیا ہیں۔ یہاں کی فوج کی تیاریاں دیکھتے رہو اور یہ اطلاعیں سلطان تک پہنچاتے رہو۔"

"کیا تم یہ کام کرتے ہو؟" — ارمغانی نے پوچھا۔

مہمان عجیب سی ہنسی ہنس کر بولا۔ "بے شک میں تاجر ہوں لیکن تجارت کے سلسلے میں مجھے لاہور آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی.... میں اونٹوں پر سامان لاد کر اس لیے یہاں آیا ہوں کہ دیکھوں کہ راجہ انند پال کیا کر رہا ہے اور وہ کب تک مسلمانوں پر حملے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ دراصل سلطان کو بھی وقت چاہیے۔ اُس کی فوج کا جانی نقصان بہت ہوا ہے۔ اس کمی کو پورا کرنا ہے۔"

"تمہیں کس نے بھیجا ہے؟" — ارمغانی نے پوچھا۔ "یا یہ کام اپنے جذبے کے تحت کر رہے

"میرا تعلق براہِ راست سلطان محمود غزنوی سے اور اس کے سالار ابو عبداللہ الطائی سے ہے" — مہمان نے جواب دیا۔ "یہاں مجھے کسی ایسے آدمی کی مدد کی ضرورت ہے جو راج محل اور راج دربار کے اندر کے حالات جانتا ہو۔ وہ آدمی تم ہو۔ مجھے تمہارے گھر کا راستہ دکھانے والے آدمی میرے اپنے ہیں۔ انہوں نے مجھے تمہارے پاس کچھ سوچ سمجھ کر بھیجا ہے۔"

"وہ کون ہیں؟"

"مجھے اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہیے" — مہمان نے کہا۔ "یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تم پر اعتبار نہیں۔ میں صرف احتیاط کر رہا ہوں۔ سب کچھ بتا دوں گا۔ تم یہ بتاؤ کہ میرا ساتھ دو گے، اگر دھوکہ دو گے تو پچھتاؤ گے۔"

ارمغانی کا سر جھک گیا۔

"میرے جذبے کا اندازہ اس سے کرو کہ میں اپنی بیٹی کو سلطان محمود کی فتح کے لیے استعمال کرنے کو تیار ہوں" — مہمان نے جذبات سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ایسی خوبصورت لڑکی پتھروں کے بھی دل چیر کر راز لے آئے گی۔ ہو سکتا ہے ہمیں کوئی تباہ کاری کرنی پڑے۔"

"میری دو باتیں دھیان سے سنو میرے تاجر دوست!" — ارمغانی نے کہا۔ "ایک یہ کہ بیٹی کو اس کام میں استعمال نہ کرنا۔ مسلمان کی بیٹی میدانِ جنگ میں لڑ سکتی ہے اور ہماری بہنیں لڑی بھی ہیں لیکن انہیں جاسوس بنا کر کفار کے حوالے کرنا کفر ہے۔ یہ گناہ کفار کیا کرتے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے راجہ کا نمک کھایا ہے۔ میں نے راجہ کی خدمت کی ہے اور راجہ نے مجھے اتنی اُجرت دی ہے جس کا میں حقدار نہ تھا۔"

"ایک طرف تم اسلام اور اسلامی غیرت کی باتیں کرتے ہو، دوسری طرف تم اسلام کے دشمن کا نمک حلال کر رہے ہو" — مہمان نے کہا۔ "میں نے سنا تھا تم بہت جرأت والے اور ایمان والے ہو۔"

"مجھ میں دونوں چیزیں ہیں" — ارمغانی نے کہا۔ "جرأت بھی، ایمان بھی، لیکن میں یہ نہیں کہلاؤں گا کہ مسلمان نمک حرام ہوتے ہیں۔"

"پھر تو مجھے لاہور سے جلدی نکل جانا چاہیئے" مہمان تاجر نے کہا۔ "ورنہ تم مجھے اور میری بیٹی کو پکڑوا دو گے۔ میرے یہاں کے آدمیوں نے مجھے بتایا ہے کہ مسلمانوں کو شک اور شبے میں پکڑ رہے ہیں"۔

ارمغانی اٹھا اور طاقچے سے قرآن اُٹھا کر دونوں ہاتھوں میں لیا اور مہمان کے آگے کر کے کہا۔ "اِس پر ہاتھ رکھو"۔ مہمان نے ہاتھ رکھا تو ارمغانی نے کہا۔ "میں خدا اور رسولؐ کے اِس پاک کلام کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہیں اور تمہاری بیٹی کو دھوکہ نہیں دوں گا..... اب تم قسم کھاؤ کہ تم بیٹی کو اس کام میں استعمال نہیں کرو گے اور تم سلطان محمود غزنوی کو دھوکہ نہیں دو گے"۔

مہمان نے قسم کھالی۔ کچھ دیر سوچ میں پڑا رہا پھر کہنے لگا۔ "تم نے بیٹی کے متعلق قسم لے کر مجھ پر ظلم کیا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میں کتنا خطرناک کام کر رہا ہوں۔ میں پکڑا گیا تو میری بیٹی کا انجام بہت بُرا ہوگا۔ کیا تم میری بیٹی کی ذمہ داری قبول کر سکتے ہو؟ فی الحال اسے کچھ دن اپنے پاس رکھو۔ میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں شاید باہر چلا جاؤں"۔

"کسی کی جوان بیٹی کو اپنے پاس رکھنا بڑی ہی نازک ذمہ داری ہے"۔ ارمغانی نے کہا۔ "میں انکار بھی نہیں کر سکتا اور میں اقرار سے بھی گھبراتا ہوں"۔

مہمان تاجر اُٹھ کھڑا ہُوا اور سر جھکا کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر بعد رُک کر بولا۔ "اگر میں اپنی بیٹی تمہیں پیش کر دوں تو اسے بیوی بنا لو گے؟ میں اپنے ہاتھوں شادی کرا دوں گا"۔

"آپ نے مجھ میں ایسی کونسی خوبی دیکھی ہے کہ اپنی اتنی خوبصورت بیٹی کی شادی مجھ جیسے عام آدمی کے ساتھ کر رہے ہیں؟"۔ ارمغانی نے کہا۔ "میں اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا"۔

"تم میں یہ خوبی دیکھی ہے کہ تم جاسوس نہیں ہو"۔ مہمان نے کہا۔ "میں اسی لیے تم سے پوچھ رہا تھا کہ تم جاسوسی کر سکتے ہو یا نہیں۔ تم وفادار ملازم ہو، اس لیے میری بیٹی کا مستقبل محفوظ رہے گا۔ جاسوس کی زندگی کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بیویوں کو اپنے ساتھ بھی نہیں رکھ سکتے۔ میری بیٹی کے لیے دولت مندوں کے رشتے مل رہے ہیں۔ پشاور میں غزنی کی فوج کے ایک نائب سالار نے مجھ سے رشتہ مانگا تھا۔ میں نے انکار

کر دیا۔ میں کسی امیر کبیر کو رشتہ نہیں دوں گا کیونکہ وہ ایک بیوی سے مطمئن نہیں ہُوا کرتے"۔

شعیب ارمغانی کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ تو اس لڑکی کو دیکھتے ہی اُس کے حُسن سے مسحور ہو گیا تھا۔ اس کے لیے مزید بحث کی گنجائش نہیں تھی۔

اگلی صبح ارمغانی کا مہمان یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ شام کو واپس آئے گا۔ ارمغانی لڑکی کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ اُس نے لڑکی کے لیے ناشتے کا انتظام کیا اور اُس کے آگے ناشتہ رکھ کر اُس سے نام پوچھا۔ اُس نے بتایا۔ "زرفہ"۔

"کیا باپ نے تمہیں بتایا ہے کہ وہ تمہاری شادی میرے ساتھ کر رہا ہے؟"۔ شعیب ارمغانی نے پوچھا۔

لڑکی نے نگاہیں نیچی کر کے سر اتنا جھکا لیا جیسے زمین میں دھنس جانا چاہتی ہو۔

"مجھے جواب دو زرفہ!"۔ اُس نے لڑکی کا سر اوپر اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "مجھے اچھی طرح دیکھ لو۔ اگر مجھے اپنے قابل سمجھو تو بتا دو۔ میں تمہیں تمہاری مرضی کے بغیر ساری عمر کے لیے اپنی زنجیروں میں نہیں باندھوں گا۔ میں انکار کر دوں گا"۔

زرفہ نے زبان سے کچھ بھی نہ کہا۔ ارمغانی کا ایک ہاتھ اپنے دونوں میں تھام کر پہلے اپنے ہونٹوں سے پھر اپنی آنکھوں سے لگایا اور پھر اُس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر دبایا۔ تب اُس نے ارمغانی کو نظر بھر کر دیکھا۔ ارمغانی کے ہاتھ گھوڑوں کے جسموں کے لمس کے عادی تھے۔ وہ گھوڑوں کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے جوانی گذار رہا تھا۔ وہ اتنے نازک ہاتھوں اور اتنے نرم اور ملائم بالوں کے لمس سے ناآشنا تھا جو اس لڑکی کے تھے۔ اُس نے ایسی نیلی آنکھیں اتنی قریب سے کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اُس پر خمار طاری ہو گیا۔

شام کو زرفہ کا باپ آیا تو اُس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ انہوں نے زرفہ کی شادی شعیب ارمغانی کے ساتھ کر دی۔ باپ نے زرفہ کو نقد رقم دی، کپڑے دیئے اور سونے کے زیورات دیئے اور وہ اُسی شام چلا گیا۔ اُس کے جانے کا انداز ایسا تھا جیسے ارمغانی کو اپنی بیٹی دینے ہی آیا ہو۔

اس رات ارمغانی کو کئی بار شک ہوا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ ذرا سی دیر میں زردہ اُس کے ساتھ یوں کھل گئی جیسے وہ ایک مدت سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ لڑکی ارمغانی پر طلسم کی طرح طاری ہو گئی۔ ارمغانی کی جذباتی حالت ایسی ہو گئی جیسے چشمے پر آ کر اُسے پتہ چلا ہو کہ وہ پیاس سے مر رہا ہے۔

"تمہارا باپ سلطان محمود کے متعلق بہت جذباتی ہے"۔ ارمغانی نے زردہ سے کہا۔ "تم جانتی ہو کہ اُس کے ارادے کیا ہیں؟"

"اگر میں آپ سے کہوں کہ وہی ارادے میرے ہیں جو میرے باپ کے ہیں تو آپ کیا کریں گے؟"۔ زردہ نے کہا۔ "میرے باپ نے آپ کے ساتھ جو باتیں کی تھیں، وہ سب مجھے بتا گئے ہیں"۔

"اور یہ بھی کہہ گئے ہوں گے کہ تم مجھے جاسوسی کے سلسلے میں اُس کی مدد پر آمادہ کرو"۔ ارمغانی نے کہا۔

"ہاں!"۔ زردہ نے کہا۔ "میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔ وہ مجھے کہہ گئے ہیں کہ میں آپ کو اسلام کی خاطر کام کرنے کے لیے تیار کروں کیونکہ آپ کو راجہ نے ایسی جگہ دے رکھی ہے جہاں سے آپ بڑے قیمتی راز حاصل کر سکتے ہیں"۔

"کیا تم نے اسی مقصد کے لیے میرے ساتھ شادی کی ہے؟"۔ ارمغانی نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تم مجھے انعام کے طور پر دی گئی ہو"۔

"نہیں"۔ زردہ نے جذباتی لہجے میں جواب دیا۔ "خدا نے آپ کو مجھے انعام کے طور پر دیا ہے۔ آپ میری زندگی کے ساتھی ہی نہیں، میرے دل اور میری روح کے مالک ہیں۔ میں نے آپ کو کل ہی دیکھا ہے نا! مگر ایسے لگتا ہے جیسے ہر لمحہ میری آنکھوں کے سامنے رہے ہیں۔ میرے دل میں جو کچھ ہے وہ آپ کا ہے ... میرا ہر راز آپ کا ہے۔ آپ کسی وہم میں مبتلا نہ ہوں۔ ہم باپ بیٹی اسلام کی شمع کے پروانے ہیں۔ میرے والد پر یہ جنون طاری ہے کہ سارے ہند میں اسلام پھیلانا ہے۔ وہ جس مسلمان سے ملتے ہیں، اُس سے پہلی بات یہ پوچھتے ہیں، 'سلطان محمود غزنوی کی فتح کے لیے تم کیا کر رہے ہو؟'۔ مسجد میں جاتے ہیں تو سلطان محمود کی فتح اور ہندوؤں کی شکست کے لیے دعائیں کرتے اور کراتے ہیں۔ وہ

مجھے تیغ زنی، گھوڑ سواری اور تیر اندازی کی بہت مشق کرا چکے ہیں۔ ایک بار انہوں نے مجھے کہا تھا کہ بیٹی! ہو سکتا ہے میں تمہاری شادی نہ کر سکوں۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ تم اسلام اور سلطان محمود کے نام پر قربان ہو گی"۔

ارمغانی نے محسوس کیا کہ لڑکی کے خیالات اپنے باپ جیسے ہیں اور اس میں باپ والا جوش و خروش ہے۔

"تمہیں یہ کس نے بتایا ہے کہ میں غزنی والوں کا جاسوس ہوں؟"۔ ارمغانی نے پوچھا۔

زردہ نے اپنا ایک بازو اُس کی گردن کے گرد لپیٹ لیا اور اُس کے اتنا قریب ہو گئی کہ دونوں کے گال چھونے لگے۔

"مجھے معلوم نہیں کہ والد کو آپ کے متعلق کس نے بتایا تھا"۔ زردہ نے جواب دیا۔ "مجھے انہوں نے کہا تھا کہ ہم جس آدمی کے پاس جا رہے ہیں، وہ ہمارے کام کا آدمی ہے"۔ زردہ نے منہ اُس کے اور قریب کر کے رازداری سے کہا۔ "اگر آپ سچ کہہ رہے ہیں کہ آپ سلطان محمود کے خفیہ آدمی نہیں تو مجھے مایوسی ہوئی ہے"۔

"پھر تمہارے دل سے میری محبت نکل جائے گی؟"

"محبت تو روح میں اتر گئی ہے"۔ زردہ نے جواب دیا۔ "میرا مطلب یہ ہے کہ ہمیں غزنی کی فوج کی اتنی مدد کرنی چاہیے کہ وہ اگر سارے ہند پر نہیں تو آدھے ملک پر قابض ہو جائے اور یہاں کا بچہ بچہ مسلمان ہو"۔

"تمہیں کس نے یہ بتایا ہے کہ صرف جاسوسی سے ہی غزنی والوں کی مدد کی جا سکتی ہے؟"۔ ارمغانی نے پوچھا۔ "اور بھی کئی طریقے ہیں"۔

"میرے والد صرف جاسوسی کی باتیں کرتے ہیں"۔ زردہ نے کہا۔ "ایک عورت یہی کام کر سکتی ہے لیکن میرے والد مجھے بتا گئے ہیں کہ تم نے ان سے قرآن پر قسم لی ہے کہ وہ مجھے اس کام کے لیے استعمال نہیں کریں گے ... میں ایسا کام نہیں کروں گی جس میں میری عصمت کو خطرہ ہو لیکن میں صرف بیوی بن کر نہیں رہ سکتی۔ آپ وہ کام کریں جو آپ کو میرے والد بتا گئے ہیں۔ یہ میری روح کی آرزو ہے"۔

شعیب ارمغانی نے اُسے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔

اُس رات کے بعد ارمغانی کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ کام سے وقت نکال کر گھر چلا جاتا اور زرفہ کے ساتھ چند منٹ گذار کر واپس چلا جاتا۔ زرفہ اُس کی بیوی تھی لیکن کبھی کبھی وہ اُسے اس طرح دیکھنے لگتا جیسے اُسے اُس سے کوئی چھین کر لے جائے گا۔ زرفہ اس کی محبت کا جواب دیوانہ وار محبت سے دیتی لیکن وہ ہر رات اُسے اکساتی کہ وہ ہندمیں اسلام کی فتح کے لیے کچھ کرے۔ اس معاملے میں بھی وہ اتنی ہی جذباتی تھی جتنی ارمغانی کی محبت میں دیوانی۔

دس بارہ روز گذرے ہوں گے۔ آدھی رات تک وہ دونوں راز و نیاز اور پیار و محبت میں محو رہے۔ ارمغانی پر نیند کا غلبہ ہو رہا تھا۔ زرفہ کے حسن و جوانی نے اُس پر اپنا خمار طاری کر دیا تھا۔ اس کیفیت میں زرفہ نے آہ بھر کر کہا۔ "آپ کے جسم کی تپش اور آپ کی محبت کا سرور مجھے جنت میں پہنچا دیتا ہے۔ جنت اس سے زیادہ دلنشیں نہیں ہو سکتی، مگر اس نشے میں جب غزنی کے وہ جوان یاد آتے ہیں جو اتنی دُور آ کر شہید ہوئے ہیں تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ شہیدوں کی روحیں مجھے لعنت ملامت کرتی ہیں کہ تم عیش و عشرت میں پڑی ہوئی ہو، اور تمہیں اپنی روح کی مسرت کا کوئی خیال نہیں۔"

اُس نے بے تاب ہو کر ارمغانی کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور بولی۔ "میری روح کا گلا گھونٹ دو تاکہ میں صرف خوبصورت جسم بن جاؤں اور تم اس کے ساتھ کھیلتے رہو۔ اگر ہم ان شہیدوں کے عزم کو جنہیں وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں، پورا نہیں کر سکتے تو ہمیں اپنا مذہب تبدیل کر لینا چاہیئے۔"

ارمغانی پر خمار طاری تھا۔ یہ خمار اُس کی عقل پر غالب آ گیا۔ اُس نے کہا۔ "زرفہ! میں اپنی قسم توڑنے سے ڈرتا تھا۔ میں نے مسجد میں قرآن پر حلف اٹھایا تھا کہ جان دے دوں گا، اپنا اور اپنے کسی ساتھی کا راز کسی قیمت پر نہیں دوں گا۔ آج میں اپنی قسم اس لیے توڑ رہا ہوں کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم میری بیوی ہی نہیں، میرے ان ساتھیوں کی طرح میری ساتھی بھی ہو جو میری طرح حلف اٹھا کر پشاور سے آئے تھے....

میرا راز سن لو۔ میں غزنی کی فوج کا جاسوس ہوں۔ میں نے نوجوانی میں غزنی جا کر جاسوسی کی تربیت حاصل کی اور یہاں آیا تھا۔ مجھ میں ہنر یہ تھا کہ گھوڑا کتنا ہی اکھڑ اور منہ زور ہو، اُسے اپنا غلام بنا لیتا ہوں۔ خدا نے مجھے چند اور خوبیاں بھی دی ہیں۔ یہاں آیا تو مجھے ہندوؤں نے یہ ملازمت دے دی ....

"میری قربانی کا اندازہ کرو زرفہ! میں نے اپنی جوانی کی اُمنگیں قربان کر دیں۔ شادی نہ کی۔ میں نے راتیں تنہا گذاری ہیں۔ تم جیسی حسین لڑکیوں نے مجھے محبت کے پیغام دیئے۔ راجکماریوں نے میرے جسم پر قبضہ کرنے کے لیے مجھے لالچ دیئے۔ میرے انکار پر مجھے مروا دینے کی دھمکیاں بھی دیں لیکن میں عورت کے لیے پتھر بنا رہا۔ لاہور اور بھٹنڈہ میں غزنی کے جو جاسوس ہیں، وہ میری کمان میں ہیں۔ وہ میرا گروہ تھا جس نے ہندوؤں کی ہر پیشقدمی کی اطلاع سلطان محمود تک اتنی قبل از وقت پہنچائی ہے کہ سلطان نے حملہ روکنے کی پیش بندی بھی کر لی اور گھات بھی لگائی ....

"میں وہ آنکھ ہوں جس سے سلطان محمود غزنی سے دیکھ سکتا ہے کہ لاہور میں کیا ہو رہا ہے۔ میرا گروہ وہ کان ہیں جن سے سلطان محمود اُن گھوڑوں کے ٹاپ بھی سُن سکتا ہے جو اُس کی طرف لاہور سے چلتے ہیں۔ میرے گروہ نے یہاں فوج کی رسد اور سامان کا ذخیرہ بھی جلایا ہے۔ اب راجہ انندپال سلطان پر جوابی حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ ہم اس کی رسد ایک بار پھر جلانے کی کوشش کریں گے تاکہ سلطان کو تیاری کا وقت مل جائے ....

"زرفہ! میں نہیں بتا سکتا کہ میں کتنے دن اور تمہیں نظر آتا رہوں گا۔ تم نے اُس آدمی کے ساتھ شادی کی ہے جو جلاد کی تلوار کے نیچے کھڑا ہے۔ میں تمہارے والد کو یہ راز نہیں دے سکتا تھا کیونکہ وہ میرے لیے اجنبی تھے۔"

زرفہ نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا اور بولی۔ "آپ نے میری روح کو مسرتوں سے سرشار کر دیا ہے۔ مجھے آپ نے روحانی سکون دیا ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ مجھے آپ جہاں بھی استعمال کریں گے، میں ہر شکل میں آپ کے ساتھ ہوں گی۔ آگ لگانے اور آگ میں کود جانے سے بھی نہیں ڈروں گی۔"

"میں مرجانا پسند کروں گا، تمہیں کسی مشکل میں نہیں ڈالوں گا۔" ارمغانی نے کہا۔ "اگر

پکڑا گیا یا مارا گیا تو تمہیں بہت دن پہلے بتا دوں گا کہ تمہیں کہاں جانا ہے۔"

"مجھے اپنے ایک دو ساتھیوں کے ٹھکانے بتا دیں۔" زرذہ نے کہا۔ "تاکہ آپ زیادہ دنوں کے لیے غیر حاضر ہو جائیں تو میں اُن سے معلوم کر لیا کروں۔"

"ہم نے یہ راز اپنی ماؤں کو بھی کبھی نہیں دیے۔" ارمغانی نے کہا۔ "تمہیں اگر میری غیر حاضری میں یہاں سے غائب کرنے کی ضرورت پڑی تو میرے ساتھی خود آ کر تمہیں لے جائیں گے۔ اُن کے پاس میری کوئی ایسی نشانی ہوگی جسے دیکھ کر تمہیں اعتبار آ جائے گا کہ تمہارے ساتھ دھوکہ نہیں ہو رہا۔"

زرذہ نے جب ایک بار پھر کہا کہ اُسے اپنے ایک یا دو ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے بتا دے تو ارمغانی نے غصے سے کہا۔ "زرذہ! اپنی زبان سے یہ سوال دھو ڈالو۔ میں اس راز پر تمہاری محبت کو بھی قربان کر سکتا ہوں۔"

دو چار دن اور گذر گئے۔ زرذہ ارمغانی کی بیوی بن کر خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھی لیکن ارمغانی نے اُس پر اپنا آپ ظاہر کر دیا تو وہ مسرت سے سرشار رہنے لگی...

ایک رات وہ بہت دیر عشق و محبت کے راز و نیاز میں کھوئے رہے۔ ارمغانی دن بھر سے گھوڑے کے ساتھ بھاگ بھاگ کر تھکن سے چُور تھا۔ زرذہ کے ساتھ وہ زیادہ دیر جاگتا رہا اور سو گیا۔ زرذہ کی آنکھ نہ لگی۔

وہ تھوڑی دیر ارمغانی کو دیکھتی رہی۔ اُس کی نیند جب بے ہوشی کی صورت اختیار کر گئی تو وہ اٹھی اور بے پاؤں صحن میں نکل گئی۔ ذرا سی دیر کھڑی رہی پھر ڈیوڑھی میں چلی گئی۔ صدر دروازے کے ساتھ کان لگائے اور صحن میں چلی گئی۔ داخل کر کمرے میں گئی۔ ارمغانی کو دیکھا وہ خراٹے لے رہا تھا۔ زرذہ پھر صحن میں چلی گئی۔ وہ بے چین تھی۔ دبے پاؤں چلتی تھی۔

اُسے بلی کی دھیمی سی میاؤں سنائی دی۔ بلی باہر بولی تھی یا چھت پر۔ زرذہ دبے پاؤں ڈیوڑھی میں گئی اور صدر دروازے کی زنجیر کھول دی کواڑ ذرا سا کھول کر دیکھا۔ باہر تین آدمی کھڑے تھے۔ ایک نے سرگوشی میں پوچھا۔ "سو رہا ہے؟"

زرذہ نے فوراً جواب نہ دیا۔ ذرا سوچ کر بولی۔ "ابھی جاگ رہا تھا۔ شاید اب تک سو گیا ہو۔ میں ڈیوڑھی میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تم باہر ہی ٹھہرو۔ میں دیکھتی ہوں سو گیا ہوا تو آ کر دروازہ کھول دوں گی۔"

وہ زنجیر چڑھا کر تیزی سے اُس کمرے میں گئی جہاں ارمغانی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ زرذہ نے اُسے جھنجھوڑ کر جگایا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھا۔ کمرے میں دیا جل رہا تھا۔ ارمغانی نے گھبرا کر پوچھا کیا بات ہے۔

"زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ارمغانی!" زرذہ نے بڑی تیزی سے بولتے ہوئے کہا۔ "بھاگ جاؤ۔ یہاں زیادہ دیر نہ رکنا۔ میں نے تمہیں دھوکہ دیا ہے۔ میرا باپ مجھے دھوکے کا ذریعہ بنا کر لایا تھا۔ میرا باپ تاجر نہیں۔ راجہ آنند پال کا جاسوس ہے۔ ہم پشاور سے نہیں بھٹنڈہ سے آئے ہیں۔ ہم ملتان میں تمہارے متعلق کسی نے شک ظاہر کیا تھا کہ تم غزنی والوں کے جاسوس ہو مگر کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ تم سے ایک تو یہ معلوم کرنا تھا کہ تم جاسوس ہو یا نہیں، اور اگر ہو تو تمہارے ساتھی کون کون ہیں...

"میرا باپ بھٹنڈہ سے یہاں آیا تو اسے یہ کام دیا گیا کہ تم سے راز لے۔ وہ پشاور کا تاجر بن گیا اور مجھے ساتھ لے آیا۔ اُس نے تمہارا پردہ اٹھانے کی بہت کوشش کی لیکن تم نے راز نہ دیا۔ میرے باپ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مجھے تمہاری بیوی بنا دیا۔ یہ میرے حُسن اور میری جوانی کا اثر تو ضرور تھا لیکن میں نے جس طرح تم پر اپنا نشہ طاری کیا، یہ میرا کمال تھا۔ تم مرد ہو اور عورت مرد کی خطرناک کمزوری ہوتی ہے۔ میرا تو کام ہی یہی ہے۔ میں نے تمہارے سینے سے راز نکال لیا۔"

شعیب ارمغانی مسحور کیے ہوئے آدمی کی طرح سُن رہا تھا۔ باہر ایک بار پھر بلی کی میاؤں سنائی دی۔ زرذہ اور تیزی سے بولنے لگی۔

"تم جب اپنے کام پر چلے جاتے تھے تو ایک عورت میرے پاس آتی تھی۔ میں اُسے بتلایا کرتی تھی کہ راز لیا ہے یا نہیں۔ آخر ایک دن میں نے اُسے بتایا کہ یہ آدمی بڑا خطرناک جاسوس ہے۔ مجھے کہا گیا کہ تمہارے ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے معلوم کروں۔ ہم نے

سے مجھے یہ راز نہ دیا۔ میں نے اپنے باپ کو اطلاع بھیجی کہ یہ راز لینا ناممکن ہے۔ مجھے اطلاع دی کہ آج میں جاگتی رہوں۔ باہر بلی کی میاؤں سنائی دے گی تو میں دروازہ کھول دوں۔ تین آدمی آئیں گے ان میں میرا باپ بھی ہوگا۔ وہ تمہیں پکڑ لیں گے۔ اور تمہیں تمہارے سینے سے راز نکالنے کے لیے مجھے استعمال کریں گے یا تمہیں اذیتیں دیں گے .... مجھ سے تفصیل سے نہ پوچھنا وہ آ گئے ہیں۔"

"پھر دروازہ کیوں نہیں کھولا؟" ارمغانی نے پوچھا اور اچھل کر اٹھا۔ اس نے کمرے میں رکھی ہوئی برچھی اٹھالی اور بولا۔ "جا بدکار! اپنی عصمت سے کھیلنے والی! جا، اور تینوں کو اندر بلا لے .... میں خود جا کر دروازہ کھولتا ہوں۔ دیکھ تیرا شکار کس طرح تین آدمیوں میں سے نکل کر غائب ہوتا ہے۔"

زرفہ اٹھ کر اس سے لپٹ گئی ۔۔۔ "ارمغانی میری بات سن لو۔ خدا کے لیے باہر نہ جانا۔ میری بات سن لو۔"

تینوں آدمی باہر کھڑے بے تاب ہوئے جا رہے تھے۔ ایک نے کہا ۔۔ "اب تک دروازہ کھل جانا چاہیے تھا۔"

"لڑکی دھوکہ نہ دے جائے" ۔۔ ایک اور نے کہا ۔۔ "اس نے اندر سے زنجیر کیوں چڑھا دی ہے؟"

"تمہاری بیٹی اس کی غلام ہوگئی ہے" ۔۔ ایک نے زرفہ کے باپ سے کہا ۔۔ "تم ہو تو بڑے عقلمند لیکن عقل والے بیوقوفوں سے دھوکہ کھایا کرتے ہیں۔"

"ذرا سا اور انتظار کر لو" ۔۔ زرفہ کے باپ نے کہا۔

اندر زرفہ شعیب ارمغانی سے کہہ رہی تھی "میرا فرض یہی تھا کہ تمہیں پکڑوا دیتی۔ میں نے اپنے باپ کا حکم مانا اور اسے تمہاری ڈھکی چھپی اصلیت بتا دی ہے۔ مگر میں جو سراپا دھوکہ بن کر آئی تھی، تمہارے مردانہ حسن اور تمہارے اسلامی جذبے کی زنجیر دل میں جکڑی گئی۔ مجھے تمہاری بیوی جو بنایا گیا تھا، یہ فریب تھا لیکن میرے دل نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو جاؤں۔ میں کوئی شریف لڑکی نہیں لیکن مجھے جو ملا جسم

کا شیدائی ملا۔ تم نے مجھے روحانی محبت سے سرشار کیا۔ تم نے محبت کا یہ ثبوت دیا کہ اپنا حلف توڑا اور مجھے اپنا سمجھ کر راز دے دیا۔ میرے اندر اسلام کا جذبہ بیدار ہو گیا ....

میں نے اپنے باپ کا حکم اس لیے مانا کہ بچپن میں میری ماں مر گئی تھی۔ باپ نے مجھے ماں کی طرح پالا۔ اس نے مجھے شہزادی بنایا۔ میں جوان ہوئی تو اس کا ہر ناجائز حکم بھی مانا۔ اس نے میرے ذریعے ہندو حاکموں اور ان کے ذریعے راجہ کی خوشنودی حاصل کی۔ اس نے اپنا ایمان بیچ ڈالا اور خوب دولت کمائی۔ اس نے مسلمان ہو کر مسلمانوں کو ہندوؤں کے ہاتھوں ذلیل و رسوا کرایا۔ میں اسی کو زندگی سمجھتی رہی مگر تم نے مجھ پر جس دنیا کے دروازے کھولے ہیں، اس سے میں ہمیشہ ناآشنا رہی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ خاوند کی محبت عورت کی جنت ہے ....

"میں نے باپ کا حکم پورا کر دیا ہے۔ میں نے دروازہ کھول لینے تک دل میں یہی ارادہ رکھا ہوا تھا کہ تمہیں پکڑوا دوں گی لیکن دروازہ کھولا اور ان تین آدمیوں کو دیکھا تو مجھ پر ایسا خوف طاری ہو گیا جیسے یہ تینوں میرا سینہ چیر کر میرا دل نکال لے جانے کے لیے آئے ہوں۔ مجھے اپنے باپ سے کہیں زیادہ تم عزیز لگے۔ ان کے لیے میں جسم ہوں۔ میری روح کو تم نے جگایا ہے۔ میں نے جھوٹ بولا اور انہیں کہا کہ تم جاگ رہے ہو، ذرا انتظار کرو۔ وہ انتظار کر رہے ہیں۔ اوپر چلے جاؤ ارمغانی! پیچھے سے کود جاؤ۔"

"اور تم؟"

"شاید کبھی ملیں" ۔۔ زرفہ نے کہا ۔۔ "زندہ رہے تو ملیں گے۔"

باہر تین آدمی پریشان ہونے لگے تھے۔ ایک نے کہا کہ میں پچھواڑے چلا جاتا ہوں، مجھے گڑبڑ نظر آ رہی ہے ۔۔ وہ ادھر کو چل پڑا۔

یہ آدمی جب پچھواڑے گیا تو ارمغانی منڈیر سے اتر چکا تھا اور دیوار کے ساتھ پاؤں جما رہا تھا۔ بلندی زیادہ نہیں تھی۔ اس آدمی نے ارمغانی کو للکارا۔ ارمغانی اوپر سے کودا اور دوسری طرف دوڑ پڑا۔ اسے دیکھنے والے نے شور مچایا لیکن ارمغانی گلی میں [illegible] گیا۔ وہ گلیوں میں دوڑا جا رہا تھا اور اس کے تعاقب میں تین آدمی تھے۔ اب رات کا اندھیرا خاتمہ ہو رہا تھا۔

وہ کھلے علاقے میں چلا گیا جہاں مکان ایک دوسرے سے الگ الگ تھے۔ ایک حویلی کے ارد گرد فصیل تھی اور فصیل کے ساتھ جھاڑیاں اور اونچی گھاس تھی۔ وہ فصیل کے ساتھ چھپ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے تعاقب میں آنے والے وہاں رُک گئے اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ ارمغانی بیٹھے بیٹھے سرک گیا اور فصیل کے پھاٹک تک جا پہنچا۔ وہ پھاٹک کے اندر جا کر فصیل کے دوسری طرف چلا گیا۔ وہ اُٹھا نہیں۔ یہ حویلی کا باغیچہ تھا۔

اُسے تلاش کرنے والے پھاٹک تک آئے۔ کسی نے کہا کہ یہاں نہیں ہو سکتا۔ وہ نکل گیا ہے۔ وہ چلے گئے۔ کچھ دیر بعد ارمغانی اُٹھا۔ اُس نے دیکھا کہ حویلی کے ایک کمرے میں روشنی ہے۔ اُسے وہاں رُکنا نہیں چاہیے تھا لیکن خطرہ تھا کہ اُسے تلاش کرنے والے ابھی دور نہیں گئے ہوں گے۔ وہ بیٹھ گیا۔

اِس حویلی سے وہ واقف تھا لیکن یہاں کبھی آیا نہیں تھا۔ یہ راجہ انندپال کی ایک رقاصہ اور مغنیہ کی حویلی تھی۔ مسلمان تھی لیکن سمرتی کہلاتی تھی۔ اپنے فن اور جسمانی حُسن میں یکتا تھی۔ اپنی قدر و قیمت جانتی تھی۔ اُس نے راجہ انندپال سے اپنی یہ شرط منوالی تھی کہ وہ محل میں نہیں رہے گی۔ چنانچہ وہ اس حویلی میں رہتی تھی جس کے آگے چھوٹا سا خوشنما باغیچہ تھا۔ سمرتی ہر رات اور ہر کسی کے لیے ناچنے والی رقاصہ نہیں تھی۔ اُسے اُس وقت راجہ بلایا کرتا تھا جب کوئی مخصوص مہمان آیا ہوتا تھا۔ وہ اُڑنے والی تتلی تھی۔ کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔

اُس رات جب ارمغانی اُس کے باغیچے میں چھپا بیٹھا تھا، وہ ذرا دیر پہلے راج محل سے آئی تھی۔ کسی دوسری ریاست کا راجہ آیا ہوا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے بیٹھی کپڑے بدل رہی تھی۔ اُس کی جوانی کے چند دن ہی باقی تھے۔ اُس نے اپنی بوڑھی خادمہ سے کہا ”آج تو تھک گئی ہوں۔“

”رقاصہ جب تھکن محسوس کرے، اُسے شادی کر لینی چاہیے۔“ خادمہ نے اُسے کہا ”لیکن ناچنے گانے والیاں سمجھتی ہیں کہ وہ سدا حسین اور جوان رہیں گی اور اُن پر بھنورے منڈلاتے رہیں گے۔“

”میں تو ابھی جوان ہوں“ سمرتی نے مسکرا کر کہا۔

”میں بھی یہی کہا کرتی تھی“ خادمہ نے کہا ”تم میرے متعلق جانتی ہو گی کہ میں بھی رقاصہ تھی۔ تم نے جو شہرہ پایا ہے، وہ میں نے بھی پایا تھا۔ تم جس طرح کسی انسان کو پلے نہیں باندھتی اس طرح میں بھی بڑے بڑے سرداروں کو دھتکار دیا کرتی تھی۔ مجھے میرے پیشے کی بوڑھی عورتیں کہا کرتی تھیں کہ کسی کے ساتھ اب شادی کر لو اور یہ پیشہ چھوڑ دو۔ میں بھی تمہاری طرح کہا کرتی تھی کہ میں تو ابھی جوان ہوں ... دیکھ لو آج تمہاری خادمہ ہوں۔ بہت خوار ہوئی ہوں۔ میں نے شادی کی اُس وقت سوچی تھی جب میرا جسم ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ میری دہلیز پر ماتھے رگڑنے والوں نے مجھے دھتکار دیا۔ کسی بوڑھے نے بھی مجھے قبول نہ کیا۔“

سمرتی نے پہلی بار محسوس کیا کہ جوانی ڈھلنے والی ہے۔ اُس کی خادمہ نے اُسے ایسا ہولناک خاکہ دکھایا کہ اُس پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔

باہر کتے کے بھونکنے کی آواز آئی، پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے کتے نے کسی کو پکڑ لیا ہو اور اُسے بھنبھوڑ رہا ہو۔ یہ سمرتی نے حویلی کی رکھوالی کے لیے کتا رکھا ہوا تھا۔ رات کو اسے کھول دیا کرتی تھی۔ اُس کی ایسی خوفناک آواز پر سمرتی اور خادمہ باہر کو دوڑی گئیں۔ اُس کا خونخوار کتا کسی آدمی پر جھپٹ رہا تھا۔ سمرتی نے دوڑ کر کتے کو پکڑا۔ کتے نے غصے میں اِس کے ہاتھ پر بھی پنجہ مار دیا۔

”کون ہو تم؟“ — اُس نے اس آدمی سے پوچھا جسے کتے نے پکڑ لیا تھا۔ وہ بیٹھ گیا تھا۔ ”کوئی چور ڈاکو ہو؟“

”اگر چور ڈاکو ہوتا تو یہاں نہ کھڑا رہتا“ — اُس آدمی نے کہا ”میرا نام شعیب ارمغانی ہے۔“

”گھوڑوں کا استاد؟“

”ہاں سمرتی جی!“ — ارمغانی نے کہا۔

”یہاں کیا لینے آئے تھے؟“ — سمرتی نے کہا ”اندر چلو۔ اگر تم بھاگے تو جانتے ہو

کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

ارمغانی جب اندر روشنی میں گیا تو اُس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ اُس کے دونوں بازوؤں اور ایک ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ کتے نے اُس کی کھال ادھیڑ دی اور ٹانگ پر کاٹا بھی تھا۔

"میں نہیں مان سکتی کہ تم یہاں چوری کرنے آئے تھے"، سمرتی نے کہا۔ "تم ان لوگوں میں سے ہو جو میرے جسم کے شیدائی ہیں۔ تمہیں میری خوبصورتی اور جوانی یہاں لائی ہے۔ تم سمجھتے ہوگے کہ میں یہاں اکیلی رہتی ہوں۔ میرا کتا شیر اور چیتے کو بھی اس باغیچے میں نہیں ٹھہرنے دیتا۔" سمرتی نے خادمہ سے کہا۔ "اس کے زخم دھونے کے لیے پانی گرم کرو۔ صاف کپڑا اور شراب لے آؤ۔ اس کے زخموں پر باندھوں۔ شراب اور جلا ہوا سرت زخم کو بہت جلدی ٹھیک کر دیتا ہے۔"

خادمہ چلی گئی تو ارمغانی نے سمرتی سے کہا۔ "تمہارے کتے نے مجھے تمہارے باغیچے میں پکڑا ہے نا، اس لیے تم مجھے چور کہہ سکتی ہو۔ مجھے بدکار بھی کہہ سکتی ہو جو تمہیں اکیلا جان کر آدھی رات کو آیا ہے۔... غور سے سنو سمرتی! تمہیں اپنے جس حسن اور جوانی پر اتنا زیادہ ناز ہے اسے اگر میری آنکھوں سے دیکھو تو اپنے آپ سے نفرت کرنے لگو۔"

"کیا تم مجھ سے نفرت کرنے چوروں کی طرح یہاں آئے ہو؟"

"جسے میں چاہتا ہوں اور جو مجھے چاہتی ہے، اگر اُسے دیکھ لو تو تم آئینے میں اپنی صورت دیکھنی چھوڑ دو"۔ ارمغانی نے کہا۔ "دل سے یہ وہم کہ میں تمہاری خاطر آیا ہوں، اور غرور کہ تم بہت حسین ہو نکال دو۔ تم راجہ اننداپال کی راجکماریوں سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو۔ میں انہیں دھتکار چکا ہوں۔"

"پھر یہاں کیوں آئے تھے؟"

سمرتی کے ایک ہاتھ کی اُلٹی طرف کتے نے پنجہ مار دیا تھا۔ وہاں سے خون کے دو تین قطرے فرش پر گرے۔ ارمغانی اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کے خون کے قطرے پہلے ہی گر رہے تھے۔ ارمغانی نے نیچے دیکھا۔ سمرتی کا خون اُس کے خون کے ساتھ مل گیا تھا۔

"اپنے خون کو دیکھو"۔ ارمغانی نے سمرتی سے کہا۔ "میرے خون کے ساتھ مل کر اس کا رنگ چمک آیا ہے۔ جانتی ہو کیوں؟... دونوں خون ایک ہیں۔ تم نے اپنے خون کو تکبر، غرور اور گناہ سے بدرنگ کر رکھا ہے۔ یہ اپنے خون سے ملا تو اپنے اصلی رنگ میں آگیا ہے۔... حیران ہو کے مجھے نہ دیکھو رقاصہ! اب میں تمہیں سمرتی نہیں کہوں گا۔ تمہارا اصلی نام مجھے معلوم نہیں... میں ہندوانہ نام سے ایک مسلمان لڑکی کی توہین نہیں کروں گا۔ میں کہہ رہا تھا کہ میرا اور تمہارا خون ایک ہے اور یہ اُن باپوں کا خون ہے جو ایک تھے اور ہو سکتا ہے کہ میرا اور تمہارا خون ایک ہی باپ کا ہو۔"

"تم کوئی پاگل معلوم ہوتے ہو۔"

"تم جانتی ہو میں کون ہوں؟" ارمغانی نے کہا۔ "میں تمہیں تمہارے خون کی اصلیت دکھا رہا ہوں۔ رقص اور موسیقی تمہارا مذہب نہیں۔ حسن اور جوانی اور تمہاری آواز کا جادو تمہاری ملکیت نہیں۔ کل پرسوں تم ان سب سے محروم ہو جاؤ گی۔ آج تم مجھے کہہ رہی ہو کہ میں چوروں کی طرح تمہارے گھر میں آیا ہوں، پھر تم دعا کیا کرو گی کہ مجھ جیسا کوئی جوان چوروں کی طرح تمہارے گھر میں آئے، مگر کوئی نہیں آئے گا۔ تم راتوں کو اس کتے کو باندھ کے رکھا کرو گی کہ کوئی تمہارے گھر آئے۔ تم دیکھنا کہ اس کتے کے سوا اس گھر میں کوئی نہیں آئے گا... ایک نیکی کرو۔ مجھے پناہ دو۔"

"کیوں؟" سمرتی نے پوچھا۔ "کیا کر کے بھاگے ہو؟"

"تمہیں ایک لڑکی کے ایثار کی کہانی سناؤں گا"۔ ارمغانی نے کہا۔ "وہ تم سے زیادہ جوان ہے، تم سے زیادہ حسین ہے، اُس کے حسن میں وہ جادو پورے جوبن پر ہے جو تم گنوا چکی ہو۔ وہ تم سے زیادہ گناہگار ہے لیکن اُس نے اپنا گھر جنت میں بنا لیا ہے۔... مجھے پناہ دو۔ اپنی نوکرانی کو یہاں نہ آنے دینا۔ اپنے زخم میں خود صاف کر لوں گا۔ اسے کہو کہ کسی کو نہ بتائے کہ میں یہاں ہوں۔"

سمرتی کو خادمہ پہلے ہی کچھ ایسی باتیں کر چکی تھی جن سے اُس کے دل پر بوجھ تھا۔ اب ایک جوان اور دلکش مرد جو اُس کا قیدی اور زخمی تھا، اُسے کہہ رہا تھا کہ اُس کے

حسن وجوانی کا جادو ختم ہو چکا ہے۔ اُس کے دل کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ اُس نے خادمہ کو یہ کہہ کر کمرے سے نکال دیا تھا کہ کسی سے ذکر نہ کرے کہ یہاں کوئی آیا تھا۔ سمرتی نے شعیب ارسغانی کے زخم اپنے ہاتھوں شراب سے دھوئے۔ ان پر سفوف اور کورے سوت کی راکھ باندھی۔ ٹانگ کے زخم گہرے تھے۔

ارسغانی نے سمرتی کے ہاتھ کا زخم صاف کیا، اور اس پر سفوف رکھ کر پٹی باندھی۔ اس دوران ارسغانی اسے زرفہ کی بات پوری تفصیل سے سُناتا رہا۔ اُس نے کچھ بھی نہ چھپایا، جھوٹ نہ بولا۔ یہ بھی بتایا کہ وہ سلطان محمود کے لیے جاسوسی کرتا ہے۔ اسلام کی عظمت اور ہندوؤں کی اسلام دشمنی کی باتیں کیں۔ اُس نے کہا کہ زرفہ کو باپ نے عیش اور گناہ میں ڈال کر اُسے شہزادی بنایا تھا۔ اُس کی فریب کاری کامیاب تھی لیکن روحانی محبت نے اس لڑکی کے سینے میں مسلمان لڑکی کو جگا دیا تو اُس نے ایسا کام کیا کہ خدا کا دل جیت لیا۔

"ٹھہرو" سمرتی نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "آج رات کالنجر کا راجہ آیا ہوا ہے۔ مجھے اسی کے لیے بلایا گیا تھا۔ راجہ انند پال نے اُسے میرے متعلق بتایا تھا کہ یہ مسلمان ہے اور میری بڑی ہی عزیز اور قیمتی رقاصہ۔ کالنجر کے راجہ نے کہا تھا کہ میں مسلمانوں کی جو خوبصورت لڑکی دیکھتا ہوں، اُسے اغوا کرا کے رقاصہ یا فاحشہ بنا دیتا ہوں۔ مسلمانوں کی نسل ختم کرنے کا یا اِن میں بدی پیدا کرنے کا یہی طریقہ ہے، اور اگر آپ بھی یہی طریقہ اختیار کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے ملک میں جو مسلمان رہ جائیں گے، اُن کا پیشہ ناچ گانا اور عصمت فروشی ہو گا۔"

سمرتی نے ارسغانی کو راجہ کالنجر کی یہ بات سنائی تو اُس کی آنکھیں بھر گئیں۔ ارسغانی نے اُس کے اندر احساس بیدار کر دیا تھا۔ اُسے یاد آ گیا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ ارسغانی نے اُس کی یہ بات سُنی تو اُس نے ایسی باتیں کیں جنہوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

"میں مسلمان بیٹیوں کی عصمت پر قربان ہو رہا ہوں"۔ ارسغانی نے کہا۔ "غزنی سے اتنی دُور آ کر شہید ہونے والے تم جیسی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت کی خاطر شہید ہوتے ہیں۔ تم کھلونا ہو اور یہ کھلونا پرانا ہو رہا ہے۔ زرفہ بن جاؤ اپنی رُوح کو پہچانو۔"

یہ رقاصہ ایسی صورت حال سے کبھی دوچار نہیں ہوئی تھی۔ اُسے ایسی کڑوی

کسیلی باتیں کسی نے کبھی نہیں کہی تھیں۔ اُسے اُس کے حسن وجوانی اور رقص کی تعریفیں کرنے والے ملا کرتے تھے۔ اب اُس کے اندر ایک انکشاف اُبھرنے لگا۔ "تم بھی فریب ہو اور تمہارے چاہنے والے بھی فریب ہیں۔"

"زرفہ کو شاید میں نے دیکھا ہے" سمرتی نے کہا۔ "اگر وہی ہے تو بہت خوبصورت لڑکی ہے... تم اُسے چاہتے ہو؟"

"میری رُوح اُسے چاہتی ہے"۔ ارسغانی نے کہا۔ "تم نے اس محبت کا ذائقہ نہیں چکھا"۔

"اگر میں تمہیں پناہ دوں تو... تو مجھے اس محبت کے ذائقے سے سرشار کر سکتے ہو؟" سمرتی نے کہا۔ "میرے اندر معلوم نہیں کیا ہونے لگا ہے جیسے زمین زلزلے سے ہل رہی ہو۔"

"مجھے بھائی بنا سکتی ہو؟" ارسغانی نے کہا۔ "رُوح کو سرشار کرنا ہے تو دل میں بہن کا رشتہ بیدار کر دو۔"

"تم میری پناہ میں رہو گے ارسغانی! لیکن"... وہ کہتے کہتے رُک گئی۔ اچانک اُس نے ارسغانی کے گال اپنے ہاتھوں کے پیالے میں تھام لیے اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ... تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میرے سامنے زرفہ کا نام نہ لینا... ہاں تم ٹھیک کہتے ہو کہ وہ تمہاری بہن نہیں لیکن تم اُس کی خاطر سب مجھے دھوکہ دو گے۔" اُس نے ارسغانی کے گال چھوڑ دیئے اور ان ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

"تم تو راجوں مہاراجوں اور بادشاہوں کے دلوں پر حکومت کرتی ہو، مجھ سے یہ ڈر کیوں؟"

"میں نہیں بتا سکتی"۔ سمرتی نے کہا۔ "میں نہیں جانتی کیا جواب دوں... تم میری پناہ میں ہو۔ میری ملکیت ہو... ہم... ہم اب... میں نہیں سمجھ سکتی کہ کیا کہوں... ہم ایک ہیں"۔ اُس نے فرش پر دیکھ کر کہا۔ "ہمارا خون ایک ہے۔ تم نے میری آنکھوں میں وہ روشنی پیدا کر دی ہے جو اپنے خون کو پہچان لیتی ہے... سو جاؤ... ارسغانی! سو جاؤ۔ زخم ٹھیک ہونے تک تمہیں پکڑنے کوئی نہیں آئے گا۔"

شعیب ارمغانی کو تلاش کرنے والے مایوس ہو کر اُس کے گھر چلے گئے۔ دروازے پر دستک دی تو زرد نے دروازہ کھولا۔ اُس کے باپ نے اس سے پوچھا کہ وہ نکل کس طرح گیا ہے۔

"وہ جاگ رہا تھا" زرد نے کہا "تم لوگ بار بار بلّی کی آواز نکالتے تھے۔ میں تمہیں خاموش کرانے کو آئی تو اُس نے دیکھ لیا۔ وہ بہت چالاک اور عقل مند آدمی ہے۔ اُس نے مجھ سے کچھ بھی نہ کہا۔ دوڑ کر چھت پر چلا گیا۔ پھر مجھے تم میں سے کسی کا شور سنائی دیا۔ یہ سب تمہاری غلطی ہے۔ مجھے اتنے دن اُس کی بیوی بنائے رکھا اور حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔"

پھر شہر میں اور گردونواح میں اُس کی تلاش شروع ہو گئی۔

چار پانچ دن گزر گئے۔ ہر مسلمان گھر کی تلاشی اس طرح لی گئی کہ جانوروں کی کھرلیوں میں سے چارہ بھی اُٹھا کر دیکھا گیا۔ ارمغانی کی انہیں بھنک بھی نہ ملی۔

نگرکوٹ کے پنڈت رادھا کشن کو اطلاع ملی کہ راجہ انندپال لاہور واپس آ گیا ہے تو اُس نے راجہ کو نگرکوٹ بلا بھیجا۔ قاصد کے آتے ہی انندپال نے تیاری اور فوری روانگی کا حکم دے دیا۔ دوسرے راجوں کی طرح وہ بھی نگرکوٹ کے مندر کا احترام کرتا اور وہاں کے ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن اب اُس کی ضرورت مختلف تھی۔ وہ پنڈت کے حکم سے دوسرے راجوں سے بہت سی فوجی مدد لینا چاہتا تھا تا کہ سلطان محمود کو فیصلہ کن شکست دی جا سکے۔

وہ مہاراجوں والی شان و شوکت سے نگرکوٹ گیا۔ اُس کے ساتھ ایک قافلہ تھا جس میں اُس کا محافظ دستہ تھا۔ دس بارہ پالکیاں تھیں جن میں سے ایک میں اُس کی عزیز ترین رقاصہ سمرلی تھی اور باقی پالکیوں میں اُس کی اپنی اور سمرلی کی خادمائیں تھیں۔ سمرلی اپنی بوڑھی خادمہ کو اپنے گھر چھوڑ آئی تھی اور سختی سے کہہ آئی تھی کہ ارمغانی کو ایک راز کی طرح چھپا کے رکھے۔ اُس کے ساتھ جو خادمائیں تھیں، وہ جوان لڑکیاں تھیں۔ قافلے میں دیگر ضروری سامان کے چھکڑوں کے علاوہ سازندے بھی تھے۔ راجہ نے نگرکوٹ میں مندر والی پہاڑی کے دامن میں ایک سرسبز اور خوشنما جگہ کیمپ لگایا۔ وہ چار پانچ دنوں کے سفر کے بعد وہاں پہنچا تھا۔ اس لیے تھکن نے اُسے اُسی وقت اوپر مندر میں نہ جانے دیا۔

پنڈت رادھا کشن کو اطلاع ملی تو اُس نے نیچے پیغام بھیجا کہ وہ راجہ کے استقبال کے لیے شام کے بعد نیچے آئے گا۔

وہ شام کے بعد نیچے آیا تو راجہ انندپال نے آگے بڑھ کر اُس کے پاؤں چھوئے اور ماتھا اپنی آنکھوں سے لگائے۔ پنڈت کو شک ہونے لگا جیسے یہ جنگل نہیں کسی مہاراجہ کا محل ہے۔ اوپر شامیانے اور اردگرد خوشنما کپڑے کی قناتیں تھیں۔ فانوس اور مشعلیں جل رہی تھیں۔ قالین بچھے ہوئے اور گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے۔ پنڈت بیٹھا ہی تھا کہ پہلے چار لڑکیوں نے رقص شروع کیا۔

رقص کے دوران پنڈت نے راجہ سے کہا "آپ شاید وہ راجہ انندپال نہیں ہیں، جن کے باپ نے اور آپ نے بھی مسلمانوں سے پے بہ پے شکستیں کھائی ہیں۔ آپ کے باپ نے خودکشی کر لی تھی اور آپ شاید بھاگ گئے تھے!... اگر آپ وہی ہیں تو آپ کی شکست کی وجہ یہ ہے جو آپ مجھے خوش کرنے کے لیے دکھا رہے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ہمارے مہاراجے میدان جنگ میں بھی اسی شان و شوکت سے جایا کرتے ہیں۔"

"مہاراج!" راجہ انندپال نے کہا "مرنے سے پہلے ہم دل بہلاوے کا بندوبست ساتھ رکھتے ہیں۔"

"مگر آپ مرے نہیں۔" پنڈت نے کہا "اتنی بار شکست کھا کر بھی آپ زندہ ہیں، اور آپ صرف اس لیے زندہ ہیں کہ اپنی بہشت خود بنا کر اسی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ میں نے آپ کو اسی لیے بلایا ہے کہ آپ کو بتاؤں کہ آپ کی شکست کی وجہ کیا ہے۔ جسم کی لذت اور سرور حاصل کرنے والوں کا انجام یہی ہوا کرتا ہے۔"

اتنے میں لڑکیاں رقص کرتی ہوئی یوں ایک طرف کو غائب ہو گئیں جیسے ہوا میں تیرتی ہوا میں تحلیل ہو گئی ہوں۔ سازوں کی دھن بدل گئی۔ نئی دھن کا تاثر ایسا تھا کہ پنڈت بھی چونک اُٹھا۔ ایک طرف سے سمرلی یوں آئی جیسے جل پری پانی میں تیرتی آ رہی ہو۔ وہ پنڈت کے قریب آ گئی۔ اُس کے ہونٹوں پر مخمور سا تبسم تھا۔ اُس نے جسم کو ناگن کی طرح بل دے کر پنڈت کو جھک کر سلام کیا۔ فانوسوں کی روشنی میں سمرلی کا حسن سحر انگیز ہو گیا تھا۔ راجہ انندپال نے پنڈت رادھا کشن کے چہرے پر ایسا تاثر دیکھا جیسے پنڈت مسحور ہوا جا

رہا ہو۔

سمرتی کا جسم ہوا میں جھولتی، پھولوں سے لدی ہوئی ڈالی کی طرح سازندوں کی تھرکتی ہوئی پرسوز لَے پر جھومنے لگا تو پنڈت نے راجہ انندپال سے پوچھا "ہندو یا مسلمان؟"

"مسلمان!" راجہ انندپال نے جواب دیا۔ "اس پیشے میں ہم صرف مسلمان لڑکیوں کو ڈالتے ہیں۔"

"اگر اس رقاصہ کو ہم اپنے مندر کی نرتکی بنالیں تو آپ اسے ہمارے حوالے کر دیں گے؟"

"اس کی بجائے مہاراج مجھ سے ایک سو لڑکیاں لے لیں۔" راجہ انندپال نے کہا۔

"یہ رقاصہ مجھے اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے۔"

"یہی سننا چاہتا تھا" پنڈت نے کہا۔ "میں اسے اپنے لیے نہیں لے جا رہا۔ میں مندر میں کسی داسی کو کبھی نہیں رکھتا۔ نرتکی (رقاصہ) کو کیوں رکھوں گا؟ .... اسے کرشن بھگوان کے چرنوں (قدموں) میں قربان کرنا ہے۔"

"قربان کرنا ہے؟" راجہ نے بھنک کر پوچھا۔

"ہاں راجہ انندپال!" پنڈت نے کہا۔ "یہ خواہش میری نہیں، یہ دیوتاؤں کا انتخاب ہے۔ یہ رقاصہ انہوں نے مانگی ہے۔"

"ہم لاہور میں دو لڑکیوں کی جان کی قربانی دے چکے ہیں۔"

"اور آپ نے دونوں بار شکست کھائی" پنڈت نے کہا۔ "کیونکہ آپ کے پنڈتوں نے ان لڑکیوں کو ناپاک کر کے ذبح کیا تھا.... مجھے شری کرشن مراری کا اشارہ ملا تھا کہ قربانی اُس لڑکی کی دو جو رقص میں بے مثال ہو، حسن میں بے مثال ہو، بوڑھی نہ ہو، نوجوان بھی نہ ہو۔ اور وہ جس کے پاس ہو اُسے اتنی عزیز ہو کہ کسی قیمت پر کسی کو دینے پر رضامند نہ ہو سکے.... میں بہت عرصے سے ایسی رقاصہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے مل گئی ہے۔ میں ہندو دھرم کی فتح چاہتا ہوں۔ میں تمہیں دیوتاؤں کے قہر سے بچانے کی فکر میں ہوں۔"

راجہ انندپال نگرکوٹ کے پنڈت کی حکم عدولی نہیں کر سکتا تھا۔ پنڈت نے اُس کے ساتھ سلطان محمود پر حملے کی اور ہندوستان سے مسلمانوں کو نکالنے کی وہی باتیں کیں جو وہ بہت دن پہلے دوسرے ہندو راجوں سے کر چکا تھا۔ اسے بھی پنڈت نے وہی مشورہ دیا کہ مسلمانوں

کو پشاور سے آگے جہاں راجہ جے پال نے شکست کھائی تھی۔ للکارو اور اُسے شکست دے کر ملتان کے سلسلۂ کوہ میں گھس جاؤ۔ آگے غزنی ہے۔ غزنی کی سلطنت کو ہماری فوجوں سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔

"بھیرہ اور ملتان کا کیا بنے گا؟" راجہ انندپال نے پوچھا۔

"دونوں شہروں کی مسلمان فوج ہماری قیدی ہوگی" پنڈت نے کہا۔ "آپ چلے جائیں۔ راگ رنگ کو بھول کر جنگی تیاری کریں۔ تمام ریاستوں کی فوج آپ کے پاس پہنچ رہی ہے۔"

اگلے روز راجہ انندپال اوپر گیا اور مندر میں پوجا پاٹ کر کے واپس آ گیا۔ سمرتی کو پنڈت رات کو ہی لے گیا تھا۔ راجہ انندپال اُسے دیکھ بھی نہ سکا۔

پنڈت رادھا کشن سمرتی کو پہاڑی پر مندر میں لے گیا۔ وہ خاموشی سے اُس کے پیچھے چلی جا رہی تھی۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اسے ذبح کر کے اس کے خون سے کشن مراری کے بت کے پاؤں دھوئے جائیں گے۔ اُسے جب پنڈت ....خانے کے ایک کمرے میں لے گیا جہاں فرش پر قالین اور قالین پر بستر بچھا ہوا تھا تو سمرتی نے پنڈت سے پوچھا کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔

"کیا تمہیں ہمارے ساتھ آنا اچھا نہیں لگا؟" پنڈت نے پوچھا اور کہا۔ "بیٹھو تو سہی" پنڈت مسکرانے لگا۔

سمرتی نے بیٹھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آہستہ سے کھینچا۔ پنڈت اس کے پاس بیٹھ گیا۔ سمرتی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اُس کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا۔ پنڈت کے جسم نے جھرجھری لی۔ سمرتی نے کہا ــــ "مہاراج نے میرے رقص کی قدر نہیں کی.... ابھی آپ نے میرا رقص دیکھا ہے، آواز نہیں سنی، مگر آپ کو میرا جسم اچھا لگا ہے۔"

"اوہ!" پنڈت نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا۔ "تم تو کچھ اور ہی سمجھ بیٹھی ہو۔ مجھے تمہارا جسم ضرور اچھا لگا ہے مگر تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہماری زندگی عورت سے ہمیشہ خالی رہی

ہے اور خالی ہی رہے گی۔"

"کیوں؟"

"ہم تو عورت کو قریب سے دیکھنا بھی گناہ سمجھتے ہیں"۔ پنڈت نے کہا۔

"پھر آج یہ گناہ کیسے کر بیٹھے؟"

"ابھی جواب نہیں دے سکتا"۔ پنڈت نے کہا۔ "دل سے وہ وہم نکال دو جو تم نے میرے ساتھ اس کمرے میں آکر پیدا کر لیا ہے۔ ہمیں تمہارے جسم کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں۔ ہم سے ابھی کچھ نہ پوچھو۔ ہم تمہیں دیوی کا درجہ دیں گے۔ تمہیں گنگا جل میں نہلائیں گے۔ تمہارے سارے پاپ جھڑ جائیں گے"۔

سمرتی کی ہنسی نکل گئی۔ وہ کچھ دیر ہنستی ہی رہی اور پنڈت اُسے دیکھتا رہا۔ وہ کنول کی طرح ہنستے ہنستے اس طرح لڑھک گئی کہ اُس کا سر پنڈت کی گود میں جا گرا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور بہت ملائم تھے۔ بالوں میں ایسا عطر لگایا گیا تھا جو مہاراجوں کے لیے تیار کیا جاتا تھا اور مہاراجے یہ اپنی خاص قسم کی عورتوں کو لگایا کرتے تھے۔ اس کی بو میں مدہوشی کا اثر تھا۔ اس اثر کے ساتھ سمرتی کے ریشمی بالوں اور عریاں کندھوں کے لمس کا اثر شامل ہوا تو پنڈت کا جسم بڑی زور سے کانپا۔ اُس نے عورت کو اتنی قریب سے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا مگر قدرت کا ایک شاہکار اس کی گود میں آن گرا تھا۔

"اُٹھو سمرتی!"۔ پنڈت نے اسے ہاتھ لگائے بغیر کہا۔ "اُٹھو اور بتاؤ کہ تم کیوں ہنس رہی ہو"۔

سمرتی کوئی شریف عورت نہیں تھی جو مردوں سے کھیلنا جانتی تھی۔ وہ اُٹھنے کی بجائے پیٹھ کے بل ہو گئی اور سر پنڈت کی گود میں رہنے دیا۔ اس نے اوپر دیکھا اور کنول کی شوخی سے بولی۔ "آپ مجھے گنگا جل میں نہلا کر میرے پاپ دھو ڈالیں گے؟ ... نہیں ... آپ نے غلط کہا ہے۔ کہنا یوں چاہیے کہ میں گنگا میں اتروں گی تو گنگا کے پاپ بہہ جائیں گے"۔

پنڈت نے اُسے اٹھانے کی کوشش نہ کی۔ سمرتی ناگن کی طرح بل کھا کر اُٹھی اور پنڈت کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ "میں سمجھ گئی ہوں آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں ... مجھے پاک کرنے"۔ وہ اچانک سنجیدہ ہو گئی اور بولی۔ "میرے

پاپ اُس روز دھلیں گے جس روز ان تمام پاپیوں کو آپ گنگا میں ڈبو دیں گے جنہوں نے میرے جسم کو کھلونا بنایا ہے۔ کیا آپ کا بھگوان ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا؟ ... اور پنڈت جی مہاراج! میرا کوئی مذہب نہیں۔ میرا کوئی مذہب رہنے نہیں دیا گیا۔ مجھے تھوڑے دن ہوئے پتہ چلا ہے کہ میرے اندر جو روح ہے وہ پاک ہے اور یہ روح اُس انسان کے انتظار میں میرے جسم کے پنجرے میں تڑپ رہی ہے جو اسے سچا پیار دے گا"۔

"تم یہ بھی جانتی ہو گی کہ وہ کون ہے؟"

"وہ آپ بھی ہو سکتے ہیں"۔ سمرتی نے کہا۔ "وہ کوئی آپ سے زیادہ بوڑھا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کوئی مجھ سے زیادہ جوان بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کوئی رشی منی اور کوئی مولوی بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کسی کٹیا میں رہتا ہو۔ وہ کسی محل کا باسی بھی ہو سکتا ہے ... کیا آپ کے پاس گنگا جل میں دُھلا ہوا پیار نہیں ہے؟"

پنڈت یوں چونکا جیسے اُسے کسی نے بڑے پیار سے خواب سے بیدار کر دیا ہو۔ وہ جو دعویٰ کرتا تھا کہ اُس کی زندگی عورت سے خالی رہی ہے اور خالی رہے گی، سمرتی کے ریشمی بالوں میں اُلجھ گیا تھا، یا اُس کے تبسم، یا اس کے سحر آگیں پیکر میں، یا اس کی باتوں میں۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس پڑا اور قدرے ہکلا کر بولا۔ "کیوں نہیں ... ایک پجاری سے تمہیں پاپ نہیں پیار ملے گا"۔

"اگر آپ مجھے وہ پیار دے دیں جس کی میری روح پیاسی ہے تو میں آپ کے بتوں کے آگے وہ رقص کروں گی کہ یہ پتھر بھی تھرکنے لگیں گے اور آپ کے حسن بت کے ہونٹوں کے ساتھ بنسری لگی ہوئی ہے، اس بنسری سے وہ نغمہ پھوٹ اُٹھے گا جو آپ کو مدہوش کر دے گا۔ دور دور سے لوگ نگرکوٹ کی نرتکی کا نرتک (رقص) دیکھنے آیا کریں گے۔ لوگ کرشن بھگوان کی بجائے نگرکوٹ کی نرتکی کی پرارتھنا کیا کریں گے"۔

پنڈت اُٹھا اور یوں کمرے میں ٹہلنے لگا کہ اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ سمرتی اسے دیکھ رہی تھی۔ پنڈت رکتا تھا۔ اسے دیکھتا تھا اور ٹہلنے لگتا تھا۔

"مہاراج کے پاس صبح جاؤں گی؟"۔ سمرتی نے پوچھا۔

"اگر میں تمہیں مہاراج اننداپال سے ہمیشہ کے لیے مانگ لوں تو کیا کہو گی؟"

"یہی کہ پہلے میں ایک راجہ کی ملکیت تھی، اب نگرکوٹ کے پجاری کے پنجرے میں آ گئی ہوں" — سمرتی نے جواب دیا — "لیکن میری روح کی قیمت آپ کو ادا کرنی ہوگی جو زر و جواہرات کی صورت میں نہیں ہوگی۔" اُس نے اپنے گلے میں پڑا ہوا بیش قیمت ہار گلے سے زور سے نوچا اور اسے ایک بیکار چیز کی طرح پنڈت کے پاؤں میں پھینک دیا۔ انگلیوں سے ہیروں والی انگوٹھیاں اتار پھینکیں اور بولی — "انہیں اپنی گنگا میں بہا دیں۔"

پنڈت نے جھک کر یہ چیزیں اٹھائیں اور آہستہ سے اس کے آگے رکھ کر کہا — "آرام سے سو جاؤ۔ ہم صبح آئیں گے اور گنگا کنارے چلیں گے۔"

راجہ آنند پال لاہور چلا گیا۔ اُس کے دل پر بوجھ سا تھا۔ سمرتی کے ساتھ اسے پیار تھا اور یہ پیار اُس کے فن کی بدولت تھا بلکہ یہ فن کا پیار تھا۔ وہ سمرتی کی بجائے ایک سو حسین کنواریاں قربان کرنے کو تیار تھا مگر پنڈت نے سمرتی کو ہی قربانی کے قابل سمجھا.... راجہ زیادہ دن پریشان نہ رہ سکا کیونکہ دوسری ریاستوں کی فوجیں لاہور میں آنے لگی تھیں۔ ان میں قنوج، گوالیار اور اجمیر کی فوجیں تھیں۔ کالنجر کی فوج کو لاہور بھیجنے کی بجائے پشاور کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے کمانڈروں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ دریائے سندھ پار کریں۔ اپنی طرف کے کنارے سے دور خیمہ زن ہو جائیں۔

یہ ۱۰۰۸ء کے ساون بھادوں کے دن تھے۔ دریا چڑھے ہوئے تھے۔ فوجوں کی نقل و حرکت میں خاصی دشواری پیش آتی تھی۔ دریا پار کرنے بہت مشکل تھے۔ کشتیوں کے پل بنتے تھے۔ سیلاب آجاتا اور پل بیکار ہو جاتے تھے لیکن اتنی بڑی فوج کو مجوزہ میدان جنگ کے قریب جمع گاہ تک پہنچانے کے لیے مہینوں جتنا وقت درکار تھا۔ رسد اور فالتو سامان پہنچانا بھی آسان نہیں تھا۔ ہند کے راجے سلطان محمود کو اتنی مہلت نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ اپنی فوج کی کمی کو پورا کر لے۔

مورخ لکھتے ہیں کہ لاہور فوجی کیمپ بن گیا تھا۔ فوج کی کیفیت یہ تھی کہ اُس کی نفری بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک تو ریاستوں کے دستے آ رہے تھے اور دوسرے یہ کہ غیر فوجی ہندو جوان جو تیغ زنی، تیر اندازی اور گھوڑ سواری کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، وہ جوق در

جوق فوج میں شامل ہو رہے تھے۔ انہیں باقاعدہ تربیت یافتہ فوج میں تقسیم کیا جا رہا تھا۔ ہندو مائیں اپنے بیٹوں کو فوج میں بھیج کر فخر محسوس کرتی تھیں۔ ہندوؤں کے پنڈتوں نے مسلمانوں کے خلاف ایسا زہریلا اور حقارت آمیز پروپیگنڈہ کیا تھا کہ کوئی ماں اپنے بیٹے کو جنگ میں جانے سے نہیں روکتی تھی۔ لوگوں نے فوج کے لیے رسد کے انبار لگا دیے تھے۔ رسد میدان جنگ تک لے جانے کے لیے لوگوں نے اپنے بیل، بھینسے اور اونٹ دے دیے تھے۔

مندروں میں بھی ایک دعا سنائی دیتی تھی کہ ہندو دھرم کی فتح اور اسلام کی شکست۔

ہندوؤں کے دلوں میں جیسے اور کوئی خواہش تھی ہی نہیں۔ وہ جب لاہور کے اردگرد فوجوں کا اجتماع دیکھتے تھے تو خوشی سے اُن کے چہرے لال ہو جاتے تھے۔ مورخوں خصوصاً فرشتہ اور البیرونی نے لکھا ہے کہ ہندوستان نے اتنی فوج پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی جو ایک متحدہ کیمپ میں جمع ہوئی ہو۔

اس کے مقابلے میں سلطان غزنوی کو اللہ کا سہارا اور اپنی جنگی فہم و فراست پر بھروسہ تھا۔ وہ پشاور میں تھا اور اسے لاہور سے اطلاعیں مل رہی تھیں کہ اُس کے خلاف انسانوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کا ایک سیلاب تیار ہو رہا ہے۔ اُسے ابھی یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اس سیلاب کا رُخ کس طرف ہوگا۔ اُس نے بھیرہ اور ملتان میں اتنی رسد رکھوا رکھی تھی کہ محاصرے کی صورت میں محصورین کے لیے ایک سال تک خوراک کافی تھی۔ اُس نے سوچا تھا کہ ان شہروں کا محاصرہ ہوا تو وہ باہر سے محاصرہ توڑنے کی کوشش کرے گا۔

ایک روز اُسے دیدبانوں نے اطلاع دی کہ حضرو کے قریب کالنجر کی فوج خیمے گاڑ رہی ہے۔ اس سے اُسے اور زیادہ فکر پیدا ہوا۔ وہ سمجھا کہ ہندو کئی محاذ کھولیں گے۔ بھیرہ اور ملتان کے محاصرے اور اُسے پشاور روکے رکھنے کے لیے ادھر بھی حملہ کریں گے۔ یہ سلطان کے بس کی بات نہیں تھی کہ مختلف محاذوں پر لڑتا اور فتح بھی حاصل کرتا۔

پھر ایک روز یوں ہوا کہ ہند کی متحدہ فوج سیلاب کی طرح چل پڑی۔ اس کا رُخ پشاور کی طرف تھا۔ لاہور اور گرد و نواح کے ہندوؤں نے فوجوں کو دریائے راوی

اس طرح پار کرایا جیسے ہر ایک سپاہی کو کندھوں پر اُٹھا کر پار کردیا ہو۔ دریا میں طغیانی تھی، کشتیوں کے دو پل بنائے گئے تھے۔ طغیانی کشتیوں کو اچھالتی تھی لیکن لوگوں نے رسّے اپنے ہاتھوں اتنے موٹے اور اتنے مضبوط بنائے تھے کہ کشتیاں ایک دوسری سے الگ نہیں ہوتی تھیں۔ مسلسل تین دن اور تین راتیں فوج دریا پار کرتی رہی۔ رسد سے لدی ہوئی بیل گاڑیوں کو لوگ دھکیلتے تھے تاکہ بیل تھک نہ جائیں اور تیز چلیں۔

جب یہ اطلاع سلطان محمود غزنوی کو ملی کہ تمام فوج لاہور سے پشاور کی سمت نکل آئی ہے تو اُسے اس اطلاع پر یقین نہ آیا۔ اُس نے بھیرہ کو اپنے جاسوس مسافروں کے بھیس میں بھیجے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ہندو بھیرہ اور ملتان کو نظر انداز کیے رکھتے۔ بہت دنوں بعد اُس کے جاسوسوں نے تصدیق کردی کہ بھیرہ اور ملتان کی طرف ہندوؤں کی کوئی توجہ نہیں اور تمام افواج پشاور کی سمت آرہی ہیں۔

"دشمن کے لیے غزنی بھیرہ اور ملتان سے زیادہ اہم ہے" سلطان محمود نے اپنے سالاروں وغیرہ سے کہا۔ "میں یہ سمجھا ہوں کہ ہند کی متحدہ فوج پشاور کے اس میدان میں آکر لڑے گی جس میں جے پال نے ہم سے شکست کھائی تھی۔ وہ اپنی تمام فوج اس لیے ادھر ہی لا رہے ہیں کہ ہمیں کچلتے ہوئے غزنی کی طرف نکل جائیں۔ اگر دشمن نے یہی سوچا ہے تو میں یہ منصوبہ بنانے والوں کی تعریف کرتا ہوں۔ اتنی بڑی فوج کے زور پر وہ اتنا اچھا منصوبہ بنا سکتے ہیں....

"اللہ کے علاوہ ہماری مدد کرنے والا دریائے سندھ ہے۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ دشمن دریا عبور نہ کرسکے۔ اس کے لیے ہمیں ایسے جانبازوں کی ضرورت ہے کہ اگر دشمن رات کو کشتیوں کا پُل بنائے تو جانباز جاکر رسّے کاٹ دیں۔ دور مار تیر اندازوں کی بھی ضرورت ہے۔ اگر پُل سے گزرتے ہوئے کسی ایک ہاتھی کو دو تین تیر کاری لگ گئے تو وہ پُل سے کسی کو گزرنے نہیں دے گا....

"لیکن اتنی بڑی فوج کو ان طریقوں سے نہیں روکا جا سکے گا۔ دشمن کی فوج اُس وقت یہاں پہنچے گی جب سردیوں کا موسم شروع ہوچکا ہوگا اور دریا میں پانی کم ہوگا۔ ہم دشمن کو دریا کے پار روکیں گے۔ ہمیں زندگی اور موت کا معرکہ لڑنا پڑے گا۔"

سلطان نے اُسی وقت بھیرہ، ملتان اور غزنی کو قاصد اس پیغام کے ساتھ دوڑا دیئے کہ تھوڑے تھوڑے دستے ہر جگہ سے پشاور آجائیں اور پیش قدمی بہت تیز ہو۔ سلطان محمود کی کیفیت یہ ہوگئی کہ نقشہ سامنے رکھ کر اس میں غرق ہوجاتا اور اُسے کھانے پینے اور سونے کی بھی ہوش نہیں رہتی تھی۔ اُس کی انگلی نقشے پر چلتی رہتی اور وہ نقشے بنانے میں مگن رہتا۔

شعیب ارمغانی ابھی سمری کے گھر میں تھا جب راجہ انندپال نگرکوٹ سے لاہور واپس آیا تھا۔ سمری کی خادمہ نے اُسے بتایا کہ راجہ تو آگیا ہے، سمری نہیں آئی۔ دو تین روز بعد خادمہ نے بتایا کہ جو لڑکیاں راجہ کے ساتھ گئی تھیں، وہ بتاتی ہیں کہ پہلی رات ہی نگرکوٹ کا پنڈت سمری کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ مندر سے واپس نہیں آئی تھی۔ دوسرے دن راجہ وہاں سے چل پڑا تھا۔

ارمغانی سوچنے لگا کہ سمری کیوں نہیں آئی۔ شاید نگرکوٹ کے پنڈت کو وہ اتنی اچھی لگی ہو کہ اُس نے اسے اپنے پاس رکھ لیا ہو۔ اس پنڈت کی فرمائش کو کوئی راجہ ٹال نہیں سکتا تھا۔

بوڑھی خادمہ کو سمری سے اتنا پیار تھا کہ دل و جان سے اُس کی وفادار تھی۔ اس نے سمری کی خواہش کے مطابق ارمغانی کو قیمتی راز کی طرح چھپا کر رکھا تھا اور ہر روز اُس کے زخموں کی مرہم پٹی کرتی تھی۔ زخم ٹھیک ہوتے جارہے تھے۔ شعیب ارمغانی گرفتاری سے بچ گیا تھا۔ اُسے پناہ بھی مل گئی تھی۔ یہی اُس کا مسئلہ تھا۔ اُسے وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا مگر اُس کے لیے زرفہ ایک جذباتی مسئلہ بن گئی تھی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ تو عورت کو وہ اپنے خفیہ فرائض کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا تھا۔ زرفہ اس کی زندگی میں آئی تو وہ اپنے جذبات کا غلام ہوگیا۔ وہ زرفہ کو حاصل کرنے کی سوچ رہا تھا۔

اُس نے اپنے آپ کو یہ فریب بھی دیا کہ زرفہ نے اُس کے ساتھ جو شادی کی تھی وہ دھوکہ تھا، مگر اُس کا دل اس جواز کو قبول نہیں کرتا تھا۔ اُسے یہ خیال آجاتا کہ زرفہ نے اُسے دل و جان سے خاوند تسلیم کرلیا تھا اور یہ اُس کی محبت کا ثبوت ہے کہ اُس نے اُسے گرفتار ہونے سے بچالیا تھا، مگر زرفہ اُسے کہاں مل سکتی تھی؟

سمری کی خادمہ اُس کے اس راز سے واقف نہیں تھی، اس لیے وہ اس بڑھیا سے

یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زرفہ نام کی ایک لڑکی کو تلاش کرے۔

ایک روز ایک بگھی سمرتی کے گھر کے سامنے رکی۔ خادمہ دوڑی گئی کہ سمرتی آئی ہے لیکن اس میں سے دو لڑکیاں اتریں۔ ارمغانی اندر چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ اُس نے لڑکیوں کو دیکھا تو اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ان دونوں میں ایک زرفہ تھی۔ وہ سمرتی سے ملنے آئی تھیں۔ خادمہ انہیں اندر لے آئی۔ ارمغانی دوسری لڑکی کی موجودگی میں نہیں مل سکتا تھا۔ وہ خادمہ کو آواز بھی نہیں دے سکتا تھا۔ سوچ سوچ کر اس نے ایک پھولدان فرش پر پھینک دیا۔ خادمہ نے آواز سنی تو دوڑی گئی کہ برتن کون توڑ رہا ہے۔

"میں نے تمہیں بلانے کے لیے پھولدان پھینکا تھا" اُس نے خادمہ سے کہا — "ان میں زرفہ نام کی ایک لڑکی ہے۔ اُسے اس طرح میرے پاس بھیجو کہ دوسری کو پتہ نہ چلے۔"

"یہ سمرتی سے ملنے آئی ہیں" — خادمہ نے کہا — "انہیں معلوم نہیں تھا کہ سمرتی یہاں نہیں ہے۔ وہ جا رہی ہیں۔"

ارمغانی کے اصرار پر خادمہ مان گئی۔ وہ تجربہ کار عورت تھی۔ وہ دوسری لڑکی کو بہلانے باہر لے گئی۔ ارمغانی زرفہ کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ زرفہ کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ وہ دوڑ کر ارمغانی سے لپٹ گئی۔ بولی — "تم ابھی یہیں ہو؟ زخمی کیسے ہوئے ہو؟"

"اگر دھوکہ دینا ہے تو بتا دو۔" ارمغانی نے کہا — "میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تمہارے لیے رکا ہوا ہوں۔ کہاں مل سکتی ہو؟"

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ دھوکہ نہیں دوں گی" — زرفہ نے کہا — "جہاں کہو ملوں گی۔ یہاں آجاؤں؟"

"اندر نہیں باہر" — ارمغانی نے کہا — "میں اس باغیچے میں چھپا ہوا ہوں گا۔ ہو سکتا ہے تمہیں اندر لے آؤں ... اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ سمرتی نگر کوٹ میں کیوں رہ گئی ہے۔ اُس نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے کہ مجھے پناہ دے رکھی ہے ... اب چلی جاؤ۔ وہ آ رہی ہے۔"

زرفہ سمرتی رقاصہ کے گھر سے نکلنا نہیں چاہتی تھی۔ شعیب ارمغانی اُسے بہت دنوں بعد نظر آیا تھا۔ یہ تو اُسے یقین تھا کہ ارمغانی پکڑا نہیں گیا اور وہ شہر سے نکل گیا ہے۔ لیکن اُسے یہ بھی یقین تھا کہ ارمغانی اب اُسے کبھی نہیں ملے گا۔

وہ سلطان محمود غزنوی کا جاسوس تھا۔ لاہور میں اُسے پہچان لیا گیا تھا۔ اب اُسے کبھی بھی اُدھر نہیں آنا تھا۔ زرفہ ارمغانی کی زندگی میں بڑا حسین دھوکہ بن کر آئی تھی اور یہ دھوکہ کامیاب تھا۔ اس دھوکے نے وہ قسم توڑ دی تھی جو ارمغانی نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر کھائی تھی کہ وہ اپنا اور اپنے کسی جاسوس ساتھی کا راز فاش نہیں کرے گا۔

اُس نے زرفہ کے حسن کے طلسم میں آکر اپنا راز فاش کر دیا لیکن یہ قرآن کا ہی کرشمہ تھا کہ زرفہ ارمغانی کو پھانسنے کے لیے پھندہ بن کر آئی تھی جس میں وہ خود بھی پھنس گئی اور پھنسی بھی ایسی کہ ارمغانی کو اُس نے اس سے نکال دیا اور خود پھندے سے آزاد نہ ہو سکی۔ یہ اُس محبت کی سحر کاری تھی جو اُسے کہیں سے نہیں ملی تھی۔ جب اُسے ملی تو پتہ چلا کہ اُس کی روح کیسی ظالم پیاس سے جلتی رہی ہے

ارمغانی اُسے سمرتی کے گھر میں چھپا ہوا مل گیا۔ سمرتی کی خادمہ زرفہ کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ ارمغانی اور زرفہ ملے تو زرفہ کو خواب کا دھوکہ ہوا لیکن وہ زیادہ دیر تک اکٹھے نہ رہ سکے کیونکہ سمرتی کی خادمہ زرفہ کی سہیلی کو زیادہ دیر تک دوسرے کمرے میں روک نہیں سکتی تھی۔

ارمغانی نے اُسے کہا کہ وہ اُسے کل رات اس گھر سے باہر ملے — وہ کمرے سے نکل گیا۔

زرفہ اور اُس کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی چلی گئیں۔ خادمہ نے ارمغانی سے پوچھا کہ وہ زرفہ سے چوری چھپے کیوں ملا ہے۔ یہ ایک قدرتی سوال تھا جو خادمہ کے ذہن میں پیدا ہوا۔ وہ ارمغانی کی ہمراز تھی لیکن ارمغانی کے اصل راز سے وہ واقف نہیں تھی۔ اُسے سمرتی نے اتنا ہی بتایا تھا کہ ارمغانی کو چھپا کر رکھنا ہے اور اس کے زخموں کا علاج کرنا

ہے۔ خادمہ خود رقاصہ رہ چکی تھی۔ اُس کے جسم کی لچک ختم ہوگئی اور جب جوانی اُس کے سر میں دو تین سفید بال اور چہرے پر ہونٹوں کے دائیں بائیں دو باریک سی لکیریں چھوڑ کر رخصت ہوگئی تو راج محل میں اُس کی ضرورت ختم ہوگئی۔ اُس کی اداؤں سے مسحور ہونے والوں اور اُس کے جسم کے ساتھ کھیلنے والوں کی نظریں پھر گئیں تو ایک احساس زہر کی طرح اُس کی رگ رگ میں بھر گیا — یہ احساس تنہائی کا تھا، کسمپرسی کا تھا۔ اُس کے دل میں سچی محبت جاگی تھی مگر جس نے محبت کو جگایا تھا، اُسے ساری عمر کے لیے مہاراجہ کے قید خانے میں بند کر دیا گیا تھا کیونکہ وہ مسلمان تھا مگر اُس نے اپنی قوم سے بھی غداری کی تھی اور مہاراجہ کو بھی دھوکہ دیا تھا۔ یہ تو کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ رقاصہ بھی اسی کو چاہتی ہے۔ پتہ چل جاتا تو وہ بھی قید خانے میں گل سڑ رہی ہوتی۔

وہ کوئی ایسی بوڑھی تو نہیں ہوئی تھی۔ وہ چونکہ رقاصہ رہی تھی اس لیے اُس کے چہرے، جسم میں پھرتی اور حرکات میں مستعدی تھی۔ شاید اسی کا اثر تھا کہ وہ ذہنی لحاظ سے بھی پھرتیلی تھی۔ اُس نے جب دیکھا کہ اُس کا رقص اب بوڑھا ہو گیا ہے اور اُس کی جگہ سمرتی نے لے لی ہے تو وہ سمرتی کے گھر آ کر بیٹھ گئی۔ سمرتی کے معاملے میں اُس کے دل میں وہ رقابت نہیں تھی جو ناچنے گانے والیوں کے درمیان ہوا کرتی ہے۔ سمرتی اُسے بہت اچھی لگی تھی۔ سمرتی رقاصہ بھی تھی مغنیہ بھی۔ اُس کے جسم میں بھی جادو تھا، آواز میں بھی۔ خادمہ جوں جوں پرانی ہوتی گئی، اُس کے دل میں سمرتی کی محبت نکھرتی آئی، پھر وہ وقت آیا کہ سمرتی اس خادمہ کو جو اُس کی خادمہ بنی، ماں سمجھنے لگی۔ وہ جب رقص کو خیرباد کہہ کر سمرتی کے گھر آئی تو سمرتی نے اُسے گلے لگا لیا اور ہمیشہ کے لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پرانی رقاصہ نے اپنے آپ کو سمرتی کی خادمہ کا درجہ دے لیا۔

جب شعیب ارسغانی مفرور جاسوس کی حیثیت سے سمرتی کے باغیچے میں آ چھپا تو سمرتی کے کتے نے ارسغانی کو بری طرح زخمی کر دیا۔ سمرتی ارسغانی کو اندر لے گئی۔ اُس کے زخم دھوئے اور جب اُس نے خادمہ سے کہا کہ اس شخص کو ایک مقدس راز کی طرح چھپا کر رکھنا ہے تو خادمہ نے اُس سے یہ بھی نہ پوچھا کہ یہ راز کیا ہے اور اس راز کا تقدس کیا ہے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ زخمی سمرتی کے دل میں اتر گیا ہے۔ اُسے اپنی محبت یاد آ گئی تھی۔ اُس نے جسے جا اتھا وہ قید خانے میں پڑا تھا اور اس رقاصہ نے محبت اور آہ دل کو اپنے سینے میں قید کر لیا تھا۔

یہ اُس کے مجروح جذبات کا درد تھا کہ اُس نے سمرتی کے کہنے پر ارسغانی کو ایک راز کی طرح اپنے سینے میں ڈال لیا۔ پھر سمرتی مہاراجہ انند پال کے ساتھ نگرکوٹ چلی گئی۔ اتنے دن گزر گئے تھے۔ اُس نے ارسغانی کو چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ وہ دراصل اُس محبت کو اپنے پیار سے سینچ رہی تھی جو سمرتی کے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔ یہ ارسغانی کی محبت تھی۔ اُس نے سمرتی کی غیر حاضری میں ارسغانی سے پوچھا تک نہیں تھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے اور اُسے کہاں جانا ہے۔

اب زرفہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ آئی اور ارسغانی نے اُس کے ساتھ علیحدگی میں بات کی تو قدرتی طور پر خادمہ کے ذہن میں یہ سوال بیدار ہوا کہ وہ زرفہ کو کس طرح جانتا ہے اور ان کے درمیان کیا راز و نیاز ہے۔ ارسغانی کا دماغ تیزی سے سوچنے لگا کہ خادمہ کو بتا دے کہ وہ سلطان محمود غزنوی کا جاسوس اور مفرور ہے!

سوچ سوچ کر اُس نے جواب دیا ”زرفہ میری بیوی ہے“

”پھر یہ پردہ داری کیسی؟“ ... خادمہ نے پوچھا۔

”تم نے زرفہ کا حسن دیکھا ہے؟“ — ارسغانی کو ایک جھوٹ سوجھ گیا ”اور تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ زرفہ کس باپ کی بیٹی ہے!“

”زرفہ سانپ کی بیٹی ہے“ — خادمہ نے کہا ”میں اس کے باپ کو جانتی ہوں۔ وہ بے اصول، بے ایمان، بے غیرت اور زہریلا مسلمان ہے۔ وہ بیٹی کی جوانی اور اس کے حسن کے بل بوتے پر راج دربار کا خاص آدمی بنا ہوا ہے“

”اور اس باپ کی بیٹی نے چوری چھپے میرے ساتھ شادی کر لی تھی“ — ارسغانی نے کہا ”وہ میرے گھر آ گئی۔ اُس کے باپ کو پتہ چل گیا۔ تمہیں معلوم ہے کہ جاسوسی کے شک میں یہاں مسلمانوں کی پکڑ دھکڑ کیسی بے دردی سے ہوئی تھی۔ لوگوں نے ذاتی دشمنیوں کی وجہ سے بھی ایک دوسرے کو پکڑوا دیا تھا۔ زرفہ کے باپ نے ایک اونچے رتبے کے

آدمی کو یہ جھانسہ دے کر ساتھ لیا کہ وہ زرذ کی شادی اُس کے ساتھ کر دے گا اور انہوں نے ایک رات فوج کے تین چار آدمیوں کو ساتھ لے کر انہیں یہ بتایا کہ میں جاسوس ہوں اور میرے گھر چھاپہ مارا۔ یہ زرذ تھی جس نے مجھے بچایا اور فرار میں مدد دی۔ اُسے بروقت پتہ چل گیا تھا۔ میں گہری نیند سویا ہوا تھا۔ اُس نے مجھے جگایا اور بتایا کہ میں کس خطرے میں آ گیا ہوں۔ اُس نے اپنے باپ اور اُس کے ساتھیوں کو دھوکہ دیا اور میرے لیے موقع پیدا کر دیا کہ میں نکل جاؤں۔ میں اوپر جا کر پچھواڑے سے کودا اور بھاگ نکلا۔ وہ میرے تعاقب میں تھے۔ یہاں باغیچے میں آ چھپا۔ وہ لوگ تو آگے نکل گئے، تمہارے کُتے نے مجھے پکڑ لیا۔ تمہاری مالکن کو میں نے یہ کہانی سنائی تو اس کے دل میں رحم پیدا ہو گیا..... کیا میں تمہیں جاسوس نظر آتا ہوں؟

"نہیں" — خادمہ نے کہا۔ "یہ زرذ کے باپ کی انتقامی کارروائی ہے..... تم اب کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"میں اب لاہور میں نہیں رہ سکتا" — ارمغانی نے جواب دیا۔ "اگر زرذ کے باپ کے سامنے آ گیا تو وہ مجھے گرفتار یا قتل کرا دے گا۔ میں زرذ کو ساتھ لے کر پشاور چلا جاؤں گا۔"

"کیا وہ تمہارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہے؟"

"بالکل تیار ہے" — شعیب ارمغانی نے جواب دیا۔ "میں تمہیں اس راز میں بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ زرذ کل شام کے بعد چوری چھپے یہاں آ رہی ہے۔ میں نے باغیچے میں ایک جگہ ملنے کو کہا تھا لیکن اب میں نے تمہیں اس راز میں شریک کر لیا ہے تو کیا تم پسند کرو گی کہ زرذ کو میں اندر لے آؤں؟ اس میں خطرہ یہ ہو گا کہ اُس کے تعاقب میں کوئی آ گیا تو میں پکڑا جاؤں گا۔"

"تم اسے اندر لے آنا" — خادمہ نے کہا۔ "میں کتا کھلا چھوڑ دوں گی۔ کوئی آ گیا تو کتا اُسے آگے نہیں آنے دے گا۔ اتنے میں تم ادھر اُدھر ہو سکتے ہو۔ زرذ کو چھپانے کی ضرورت نہیں۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ سمرتی سے ملنے آئی تھی۔"

"کیا تم معلوم کر سکتی ہو کہ مہاراجہ واپس آ گیا ہے تو سمرتی کیوں نہیں آئی؟" — ارمغانی نے پوچھا۔

"کوشش کروں گی" — خادمہ نے کہا۔ "یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مہاراجہ کسی کو سمرتی تحفے کے طور پر دے آیا ہو۔ اِس رقاصہ سے وہ کسی قیمت پر دستبردار نہیں ہونا چاہتا۔"

"میں نے زرذ سے کہا تھا کہ معلوم کرے۔"

زرذ نے معلوم کر لیا تھا۔ وہ رات کو آ گئی۔ ارمغانی باغیچے کی فصیل کے باہر اُس جگہ انتظار کر رہا تھا جہاں وہ فرار کی رات آ کر چھپا تھا۔ بہت انتظار کے بعد زرذ آ گئی۔ وہ اکیلی تھی۔ ارمغانی نے اُسے بتایا کہ اُس کے متعلق وہ خادمہ کو کیا بتا چکا ہے۔ وہ زرذ کو اندر لے گیا۔ خادمہ نے کتا کھول کر باغیچے میں چھوڑ دیا۔

زرذ نے ارمغانی کو پہلی یہ خبر سنائی کہ نگرکوٹ کے بڑے پنڈت نے سمرتی کو انسانی قربانی کے لیے وہیں رکھ لیا ہے۔ دوسری خبر یہ کہ مہاراجہ انند پال کی فوج اور تین چار اور ریاستوں کی فوجیں جو لاہور میں جمع ہوئی تھیں، پشاور کی طرف کوچ کر گئی ہیں۔ ان کی فتح کے لیے پنڈت نے سمرتی کو دیوتاؤں کے قدموں میں قربان کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔

"اس وقت تک اس کا خون بہایا جا چکا ہو گا" — زرذ نے کہا۔

"شاید ابھی زندہ ہو" — خادمہ نے کہا۔ "جس لڑکی کو قربانی کے لیے منتخب کرتے ہیں اُسے فوراً ذبح نہیں کر دیتے۔ ایک مہینہ پنڈت اسے غسل اور عبادت سے پاک کرتے رہتے ہیں۔ اُسے نشہ آور دوائیاں کھلاتے ہیں حتیٰ کہ وہ خود کہنے لگتی ہے کہ مجھے دیوتاؤں کے قدموں میں قربان کر دو۔"

تینوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔

"سمرتی نے مجھ پر جو احسان کیا ہے، یہ ایسا معمولی نہیں کہ میں اسے فراموش کر دوں" — ارمغانی نے کہا۔ "میں نگرکوٹ جاؤں گا اور معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ زندہ ہے یا ذبح کر دی گئی ہے۔ اگر زندہ ہوئی تو میں اسے نکالنے کی کوشش کروں گا۔"

"نگرکوٹ کا مندر اس مکان کی طرح نہیں کہ ایک کمرے سے آخری کمرے تک گھوم جاؤ گے" — خادمہ نے کہا۔ "میں اس مندر میں گئی ہوں [illegible]

راہداریوں کی بھول بھلیاں ہیں۔ اس کا تہ خانہ بھی ہے۔ وہاں تو ہاتھی غائب ہو جاتے ہیں۔ مندر کے ارد گرد قلعہ ہے۔ لوگ وہاں عبادت کے لیے جاتے ہیں لیکن یہ معلوم کرنا کہ سمرتی کہاں ہے، آسان نہیں ہوگا۔"

شعیب ارمغانی کی رگوں میں جوانی کا خون دوڑ رہا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ سمرتی مسلمان ہے۔ اس کے لیے یہ قابلِ برداشت نہیں تھا کہ ایک مسلمان عورت کو ہندوؤں کی فتح کے لیے قربان کر دیا جائے۔ اُسے وہ وقت یاد آیا جب سمرتی نے اُسے اپنے خونخوار کتے سے چھڑایا اور اُسے اندر لے گئی تھی۔ اُس کے زخموں سے خون فرش پر گر رہا تھا۔ کتے نے سمرتی کا بھی ایک ہاتھ زخمی کر دیا تھا۔ اُس کے خون کے قطرے بھی فرش پر گر کر ارمغانی کے خون میں مل گئے تھے۔ ارمغانی نے اُسے کہا تھا کہ اپنا خون سنبھالو میرا اور تمہارا خون ایک ہے۔ سمرتی نے فرش پر دیکھ کر کہا تھا "ہاں، ہمارا خون ایک ہے۔ تم نے میری آنکھوں میں وہ روشنی پیدا کر دی ہے جو اپنے خون کو پہچان لیا کرتی ہے۔"

ارمغانی کو اُس رات کا ایک ایک لمحہ یاد آ گیا۔ وہ کچھ دیر خلاؤں میں دیکھتا رہا۔ اچانک پھٹ کر بولا "میں ایک مسلمان عورت کا خون پتھر کے بتوں کی بھینٹ نہیں چڑھنے دوں گا" — اُس نے خادمہ کی طرف دیکھا اور پوچھا "تم کہا کرتی ہو کہ تمہارے دل میں سمرتی کی وہی محبت ہے جو ماں کے دل میں اپنے بچے کی ہوتی ہے..... اس محبت کا کوئی ثبوت دے سکو گی؟ میرا ساتھ دو گی؟ میں نگر کوٹ کا راستہ نہیں جانتا۔ مجھے وہاں تک لے چلو۔ مجھے مندر کے اندر کی دنیا کے راستے اور تہ خانے سمجھا دینا۔ شاید وہ ابھی زندہ ہو۔"

"کیا ہم راستے میں پکڑے نہیں جائیں گے؟" — خادمہ نے پوچھا۔

"نہیں" — ارمغانی نے کہا۔ "ہم بہروپ میں جائیں گے۔" اُس نے زرفہ سے کہا — "تم یہیں رہو۔ شاید ہم جیتے جی مل سکیں گے۔"

"میں تمہارے ساتھ جاؤں گی" — زرفہ نے کہا۔ "میں اب یہاں نہیں رہ سکتی۔ جہاں تم ہو گے وہاں میں ہوں گی۔"

خادمہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ میاں بیوی ہیں۔ وہ انہیں تنہا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ارمغانی پر سمرتی کی قربانی کی خبر نے ایسی کیفیت طاری کر دی تھی جیسے اُسے

یاد ہی نہ رہا ہو کہ اُس کے پاس زرفہ بیٹھی ہے اور زرفہ خطرہ مول لے کر اُس کے پاس آئی ہے۔ اُسے اس کیفیت سے نکالنے کے لیے زرفہ نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ارمغانی نے بے خیالی میں اُس کی طرف دیکھا۔

"تم شاید ابھی تک مجھے ایک فریب سمجھ رہے ہو گے" زرفہ نے کہا۔ "ایک رقاصہ کو تم مجھ سے زیادہ قیمتی اور بہتر سمجھتے ہو۔"

"اوہ زرفہ!" — اُس نے زرفہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "یوں نہ کہو۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔ سمرتی نہ ہوتی تو میں آج قید خانے میں زندہ لاش بن چکا ہوتا۔ وہ مسلمان ہے۔ تم بھی مسلمان ہو۔ میں تمہیں دھوکہ نہیں سمجھ رہا۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہیں ساتھ لے جاؤں تو بھی ٹھیک نہیں۔ یہاں چھوڑ جاؤں تو تم سے ملنا ناممکن ہو جائے گا کیونکہ میں بار آیا تو پکڑے جانے کا خطرہ ہوگا۔"

"تم جس بہروپ میں خادمہ کو ساتھ لے جاؤ گے اسی بہروپ میں مجھے بھی ساتھ لے چلو" — زرفہ نے کہا۔ "مجھے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا ہے۔"

"یہ خیال رکھنا زرفہ!" — ارمغانی نے کہا۔ "میں نے سمرتی کی خادمہ کو تمہارے متعلق یہ تو بتا دیا ہے کہ تم میری بیوی ہو لیکن اپنے متعلق یہ نہیں بتایا کہ میں جاسوس ہوں۔" اُس نے خادمہ کو اپنے متعلق جو کچھ بتایا تھا، وہ زرفہ کو بتا دیا۔ پھر اُس نے کہا۔ "مجھے اپنے دو دوستوں کو بھی ساتھ لینا ہے۔ میں آج رات انہیں ملوں گا اور انہیں نگر کوٹ چلنے پر آمادہ کروں گا۔ تم چلی جاؤ۔ کل صبح اگر ادھر آ سکو تو آ جانا۔ تمہیں بتا دوں گا کہ ہم نے کیا طے کیا ہے۔"

زرفہ نے اُسے یہ بھی بتایا تھا کہ اُس کی تلاش ترک کر دی گئی ہے۔ اب لاہور میں سکون تھا۔ فوجیں چلی گئی تھیں۔ پکڑ دھکڑ کا سلسلہ رک گیا تھا۔ ارمغانی کی داڑھی خاصی بڑھ آئی تھی۔ وہ اپنا روپ بدلنا جانتا تھا۔ وہ کسی سے ڈر نہیں سکتا تھا۔ اُس نے زرفہ کو یوں رخصت کیا کہ کچھ دور تک اُس کے ساتھ گیا اور اُسے رخصت کر کے اپنے ایک ساتھی کے گھر کی طرف چلا گیا۔ اُس کے ذہن پر سمرتی چھائی ہوئی تھی۔

نگر کوٹ میں پنڈت رادھا کشن کے ذہن پر بھی سمرتی چھانے لگی تھی۔ عورت کے

معاملے میں وہ پنڈت نہیں پتھر تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ عورت فساد کی جڑ ہے اور عورت ایسا جادو ہے جو مرد پر سوار ہوتا ہے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا اور وہ بدی کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ اسی نظریے کے تحت پنڈت رادھا کشن نوجوانی میں تارک الدنیا ہو گیا اور ہمالیہ کی اُن برف پوش وادیوں میں چلا گیا تھا جہاں سے گنگا نکلتا ہے۔ اُس نے وہاں پندرہ برس گزارے تھے اور اُس کا من مر گیا اور اُس کے جذبات ہمالیہ کی برف کی طرح سرد ہو گئے تو وہ نگرکوٹ کے مندر میں آ گیا تھا۔ اب اُس کی عمر پچاس ساٹھ کے درمیان تھی۔

پہلی رات وہ سمرتی کو قربانی کے لیے منتخب کر کے اپنے ساتھ نگرکوٹ کے مندر میں لے گیا تو سمرتی نے اُس کے ساتھ ایسی باتیں کیں جنہوں نے پنڈت کے وجود کا کوئی ایسا تار چھیڑ دیا جو پنڈت سمجھتا تھا کہ کبھی کا ٹوٹ چکا ہے۔ وہ سمرتی کو کمرے میں چھوڑ کر اور یہ کہہ کر نکل گیا تھا کہ آرام سے سو جاؤ، ہم صبح آئیں گے اور گنگا کے کنارے چلیں گے۔

پنڈت اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُسے اپنے آپ پر اتنا زیادہ اختیار تھا کہ سونے کے لیے لیٹتا تھا تو لیٹتے ہی اُس کی آنکھ لگ جایا کرتی تھی۔ اُس کا ذہن کبھی بھٹکا نہیں تھا مگر اُس رات اُسے کوشش کے باوجود نیند نہیں آ رہی تھی۔ سمرتی کی ہنسی کا جل ترنگ اُس کے ذہن کے ہر گوشے میں بج رہا تھا۔ سمرتی نے بچوں کی طرح ہنستے ہنستے سر اُس کی گود میں پھینک دیا تھا۔ سمرتی کے ریشمی بالوں کے لمس کو وہ ابھی تک محسوس کر رہا تھا۔ اُس کا وجود عورت کے لمس سے ہمیشہ ناآشنا رہا تھا۔ وہ اس لمس سے اور عورت کے وجود کی بُو باس سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر اُسے آزادی ممکن نظر نہیں آ رہی تھی۔

اُسے سمرتی کے الفاظ یاد آ رہے تھے جو اس رقاصہ نے بڑے جذباتی لہجے میں کہے تھے۔۔۔ "اگر آپ مجھے وہ پیار دیں جس کی میری روح پیاسی ہے تو میں آپ کے بتوں کے آگے وہ رقص کروں گی کہ یہ پتھر تھرکنے لگیں گے۔ لوگ دُور دُور سے نگرکوٹ کی نرتکی کا نرتک دیکھنے آیا کریں گے۔ لوگ کشن بھگوان کی بجائے نگرکوٹ کی نرتکی کی پرارتھنا کیا کریں گے۔"

پنڈت یوں بیدار ہو گیا جیسے وہ بڑا ہی سندر سپنا دیکھ رہا تھا کہ کسی نے سوئی چبھو کر اسے جگا دیا ہو۔ اس کا خون کھولنے لگا۔ غصے سے اس کی سانسیں دھونکنی کی مانند ہو گئیں۔ وہ لیٹے لیٹے اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ "ایک نرتکی۔۔۔ مسلمان!

رقاصہ، ملیچھ، پاپن! جس کی آتما نے نہ جانے کتنے پاپی مردوں کا بوجھ اٹھا رکھا ہے۔ کشن بھگوان کا اپمان کر رہی ہے، وہ کشن بھگوان کے کرودھ سے واقف نہیں ان بتوں کو پتھر کہتی ہے!"

اُس نے ایک ہاتھ کا گھونسہ اپنے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی میں مارا اور دانت پیس لیے۔ "اس ملیچھ نے ہمارا شریر ناپاک کر دیا ہے۔۔۔ چھی چھی چھی۔۔۔ ہم جھوٹ نہیں کہتے کہ عورت کا جادو انسان کو حیوان بنا دیتا ہے۔" پنڈت بڑبڑانے لگا۔ وہ جو سوچ رہا تھا، وہ اس کی زبان پر آ گیا۔ وہ ذرا اونچی آواز سے بولنے لگا۔ "اُسے پاک کرنا ہے۔ بہت دن لگیں گے۔ پاک کر کے اس کے خون سے کشن مراری کے پاؤں دھوئے جائیں گے۔"

پنڈت کے ذہن اور دل پر سمرتی کا جو طلسم طاری ہو گیا تھا وہ اتر گیا۔ وہ لیٹا اور اُس کی آنکھ لگ گئی۔

پنڈت رادھا کشن معمول کے مطابق اُس وقت جاگ اُٹھا جب سحر ابھی تاریک تھی۔ وہ مندر کی بلندی سے اترا اور بھجن گنگناتا ہوا پہاڑی کے قریب نیم دائرے میں بہتی ہوئی بن گنگا تک جا پہنچا۔ بن گنگا کو گنگا ندی بھی کہا کرتے تھے۔ وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں جا کھڑا ہوا۔ ہاتھوں سے پانی کے چھینٹے اڑائے اور بھجن گنگناتے ہوئے پانی میں بیٹھ گیا۔ ہندوؤں کا آج بھی یہی عقیدہ ہے کہ گنگا کا پانی سارے پاپ دھو ڈالتا ہے۔ پنڈت پانی میں بیٹھ گیا۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ اُس کا جسم سرد ہوا تو اُس نے محسوس کیا کہ رات اُس کا جسم جلتا رہا ہے۔ یہ آگ سمرتی نے لگائی تھی۔ اُس نے تسلیم کر لیا کہ گذشتہ رات اُس کے وہ جذبات بیدار ہو گئے تھے جو وہ سمجھتا تھا کہ مر چکے ہیں۔

بھجن اور پانی اُسے ٹھکانے پر لے آئے اور وہ وہی پنڈت رادھا کشن بن گیا جس نے کسی معتقد عورت کو کبھی اپنے پاؤں کبھی چھونے نہیں دیئے تھے۔ رات اُسے سمرتی پر جو غصہ آیا تھا وہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ سمرتی کو پاپی بنایا گیا ہے۔ وہ سچے پیار کی پیاسی ہے۔ اُس نے کہا تھا۔ "مجھے گنگا جل سے دُھلا ہوا پیار دے سکتے ہو؟"

"ہاں، دے سکتا ہوں۔" پنڈت نے اپنے آپ سے کہا۔ "میں اس نرتکی کو گنگا

جل سے دُھلا ہُوا پیار دوں گا۔ پھر میں کشن مراری کے چرنوں میں اس کا خون چڑھا کر پرسکون ہو جاؤں گا کہ میں نے ایسی عورت قربان کی ہے جسے میں نے پیار دیا تھا۔ یہ قربانی قبول ہو گی۔ جلدی قبول ہو گی۔ غزنی، بلخ، بخارا اور سمرقند بھی مہابھارت میں شامل ہو جائیں گے۔ ہر دوار کی گھنٹیاں محمود غزنوی کی مسجدوں میں بھی بجیں گی۔ ہندو دھرم کی فتح اور اسلام کی شکست ہو گی۔

وہ واپس آیا تو مندر کے عبادت گاہ والے حصے میں چلا گیا جہاں ہندو مرد اور عورتیں عبادت میں مصروف تھیں۔ اُس نے گڑوی میں سے بن گنگا کا پانی ہاتھ پر ڈال کر بُت کے قدموں پر پھیرا اور ہاتھ جوڑ کر بُت کے آگے سجدہ کیا۔

اس صبح وہ کچھ زیادہ ہی دیر عبادت میں مصروف رہا۔ کچھ زیادہ ہی مگن ہو گیا۔ وہ جب اس خود فراموشی سے بیدار ہُوا تو دیکھا کہ وہ وہاں اکیلا تھا۔ لوگ پوجا پاٹ کر کے جا چکے تھے۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ اُسے یاد آ گیا کہ اسے سمرتی کو بھی دریا پر لے جانا اور نہلانا تھا۔ وہ اٹھا اور اُس کمرے میں چلا گیا جہاں وہ سمرتی کو چھوڑ آیا تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ سمرتی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ پنڈت اندر چلا گیا اور سمرتی سے دو تین قدم دُور رک گیا جیسے اُسے کسی نے اس کی مرضی کے بغیر روک دیا ہو۔

سمرتی بے فکری کی نیند سوئی ہُوئی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر معصوم بچوں کا سا تبسم تھا جیسے وہ کوئی بڑا اچھا خواب دیکھ رہی ہو۔ اُس کے چند ایک بال بکھر کر اس کے چہرے پر آ گئے تھے۔ سورج نکل آیا تھا اور وہ ابھی تک سوئی ہُوئی تھی۔ پنڈت کو خیال آیا کہ گناہ انسان کو اطمینان نہیں دے سکتے۔ یہ عورت تو عبادت کی منکر ہے۔ کیا اس کی روح مطمئن ہے؟ کیا یہ روحانی سکون ہے کہ یہ ایسی بے فکری کی نیند سوئی ہوئی ہے؟

سمرتی کو دیکھتے دیکھتے پنڈت رادھا کرشن کو بے چینی سی محسوس ہونے لگی جو تشنگی کی صورت اختیار کر گئی۔ اُس کے سامنے سوئی ہوئی رقاصہ معصوم سی بچی بن گئی۔ آنکھیں کھلیں تو سمرتی اُسے اُس کے اپنے رُوپ میں نظر آئی جیسے اِس عورت نے اُسی کی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہو اور ان کی رگوں میں ایک ہی باپ کا خون رواں دواں ہو۔ پنڈت اُسے دیکھتا رہا اور اُس کا ذہن دُور پیچھے چلا گیا جب وہ اسی طرح بچوں کی طرح سویا کرتا تھا۔ اسے اپنی ماں کا چہرہ یاد آنے لگا مگر یہ چہرہ دھند میں چھپا ہُوا تھا۔ اس نے یادوں کی دُھند کو ہٹانے

کی بہت کوشش کی مگر دُھند نہ چھٹی، البتہ چہرہ نکھر آیا۔ اس نے غور سے دیکھا — یہ چہرہ سمرتی کا تھا۔

بیٹی، بہن، ماں — پنڈت کے وجود میں سوئیاں چبھنے لگیں۔ اسے اپنا وجود کھنڈر کی طرح کھوکھلا اور ویران محسوس ہونے لگا۔ اُس نے عمر کے لمبے لمبے بے شمار سال اس خلا کو بُتوں اور مورتیوں سے پُر کرنے میں گزار دیئے تھے مگر سمرتی نے تمام بُت اور مورتیاں اٹھا کر بن گنگا میں بہا دیں۔ پنڈت پھر کھوکھلا ہو گیا۔ اُسے رقاصہ کے روپ میں عورت کے سارے ہی روپ نظر آ گئے۔ تشنگی بڑھنے لگی۔ وہ سمرتی کو ہاتھ لگانے کو بے تاب ہونے لگا۔

وہ ذرا آگے بڑھا تو سمرتی کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے پنڈت کو کھڑے دیکھا اور انگڑائی لی۔ پنڈت نے کسی عورت کو کبھی انگڑائی لیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے جسم نے جھرجھری لی۔ اُس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہونے لگی جس سے وہ ناآشنا تھا۔ اسے سر درد سا محسوس ہونے لگا اور اس پر خود فراموشی طاری ہو گئی۔

"دن بہت چڑھ آیا ہے" — سمرتی نے کہا — "آپ رات مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟"

"تمہیں اکیلے ڈر آتا تھا؟"

"ڈر؟" — سمرتی نے ہنس کر کہا — "ڈر کس کا؟ ڈر ایک احساس ہوتا ہے۔ میرے تمام احساس مر چکے ہیں۔ عورت پرائے مرد سے ڈرا کرتی ہے مگر پرائے مردوں کے ہاتھوں میں کھیلنے والی عورت کے دل سے تمام ڈر نکل جایا کرتے ہیں۔ جو لُٹ جاتے ہیں وہ باقی سفر نڈر ہو کر طے کیا کرتے ہیں۔ مجھے اب کسی رہزن کا ڈر نہیں۔"

"لیکن اطمینان اور سکون کی ایسی نیند جیسی تم سو رہی تھیں، وہی سو سکتا ہے جس کی روح مطمئن ہو" — پنڈت نے کہا — "ایک نرتکی کی آتما اتنی شانت نہیں ہونی چاہیے۔"

"میرے پاس صرف روح رہ گئی ہے۔ جسے آپ آتما کہتے ہیں" — سمرتی نے کہا — "میرا جسم پرایا ہو گیا ہے۔ روح میری ہے۔ یہ شانت ہے، مطمئن ہے۔"

"لیکن کیسے؟"

"مذہب کے مارے ہوئے لوگ نہیں سمجھ سکتے" — سمرتی نے کہا۔ "وہ ایک ہی رٹ لگائے رکھتے ہیں۔ پرارتھنا کرو، آتما شانت ہو جائے گی۔ دنیا کا بوجھ نہ ہو تو آتما شانت ہو جاتی ہے۔ منش کے ہردے میں مراری کی اچھا ہو تو آتمہ شانت ہو جاتی ہے..... یہ سب باتیں ہیں پنڈت جی مہاراج! میں نے دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اٹھا لیا ہے تو میری آتما شانت ہو گئی ہے"۔

یہ سمرتی کے لب و لہجہ کی بے باکی تھی یا اس کے انداز میں خود اعتمادی تھی یا اس کے سراپا میں کوئی ایسا تاثر تھا کہ پنڈت کے پاؤں اکھڑ گئے۔ سمرتی اس پر غالب آنے لگی۔ اس کے ذہن میں نیکی اور بدی کا، پُن اور پاپ کا، جزا اور سزا کا فلسفہ گڈمڈ ہونے لگا۔ سمرتی اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے کندھے عریاں تھے۔ لمبوتری گردن عریاں تھی۔ اس کے بکھرے بکھرے بال اس کے کندھے اور گردن کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ پنڈت نے تیاگ کی اتنی لمبی عمر میں پہلی بار محسوس کیا کہ یہ کہنا آسان ہے کہ عورت ایک فتنہ ہے لیکن اس فتنے سے بچنا آسان کام نہیں۔ پنڈت کے اندر ایک کشمکش شروع ہو گئی جو اسے پریشان کرنے لگی۔ وہ اپنے آپ سے لڑنے جھگڑنے لگا۔

"آپ چپ کیوں بیٹھے ہیں؟" — سمرتی نے مسکرا کر پوچھا۔ "آپ نے مجھے مہاراج آنند بال سے لے لیا ہے مگر یہاں لا کر مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ رات آپ نے کہا تھا کہ آپ مجھے پاک کرنا چاہتے ہیں۔ کیا اسی لیے آپ مجھے یہاں لائے ہیں؟ مجھے پاک کر کے آپ کیا کریں گے؟"

پنڈت چونک کر بیدار ہو گیا اور اس کے منہ سے نکل گیا۔ "ہم تمہیں دیوی کے چرنوں میں قربان کریں گے۔"

پنڈت نے ایسے لہجے میں کہا جیسے یہ ایسی سعادت ہو جو کسی کسی کو نصیب ہوتی ہے۔ سمرتی کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہ آئی نہ وہ چونکی نہ بدکی۔ اس کی مسکراہٹ بھی نہ غائب ہوئی۔ پنڈت خود چونک اٹھا۔ اسے یہ راز فاش نہیں کرنا چاہیے تھا۔ جسے قربان کیا

جاتا تھا، اسے بتایا نہیں جاتا تھا۔ اسے نشہ آور دوائیاں پلا پلا کر اس کے ذہن کو ماؤف کر دیا جاتا تھا اور اس کے ذہن میں اپنی باتیں ڈال دی جاتی تھیں۔ پنڈت رادھا کشن پر سمرتی کا سحر طاری ہو گیا تھا جس کے اثر سے اسے اپنے اوپر قابو اور اختیار نہیں رہا تھا۔

"آپ میرے جسم کی قربانی دینا چاہتے ہیں؟" — سمرتی نے کہا — "لیکن یہ جسم میرا تو نہیں۔ اگر یہ میرا ہی ہے تو یہ کبھی کا قربان ہو چکا ہے۔ روح میری ہے۔ اس کی قربانی دوں مگر یہ آپ کے ہاتھ آئے گی نہیں..... کیا آپ نے کسی کی روح پر کبھی قبضہ کیا ہے؟ آپ کی روح پر کسی کا کبھی قبضہ ہوا ہے؟"

پنڈت اسے احمقوں کی طرح دیکھ رہا تھا جیسے اس کے پلے کچھ بھی نہ پڑا ہو۔

"آپ سچے پیار سے آشنا نہیں" — سمرتی نے کہا۔ "میں جانتی ہوں۔ میں مندروں کے اندر کی دنیا کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہاں اس چیز کو اچھا سمجھتے ہیں جو نظر آسکے اور جسے چھوا جا سکے اسی لیے آپ لوگ اس خدا کو نہیں مانتے جو نظر نہیں آتا۔ آپ نے نظر آنے والے خدا اپنے ہاتھوں سے بنا لیے ہیں۔ آپ جسموں کی قربانی دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ نے ان بتوں کو خوش کر لیا ہے۔ اور اب یہ بت آپ کی ہر مراد پوری کریں گے۔"

"تم مسلمان ہو اس لیے ایسی باتیں کر رہی ہو؟"

"میں کچھ بھی نہیں" — سمرتی نے کہا۔ "میرا کوئی مذہب نہیں۔ میں ایک پیاسی روح ہوں۔ روح آپ کی بھی پیاسی ہے۔ آپ کی آنکھیں بتا رہی ہیں۔ میں مردوں کی آنکھوں میں جھانک کر معلوم کر لیا کرتی ہوں کہ ان کے دلوں میں کیا ہے۔" اس نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ "میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیں، جھجکیں نہیں میرے قریب آجائیں۔"

پنڈت بت بنا رہا۔ سمرتی سرک کر اس کے قریب ہو گئی۔ سمرتی نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ پنڈت کا جسم کانپا۔ اس نے اپنا چہرہ سمرتی کے ہاتھوں سے آزاد کر لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جب بولنے لگا تو اس کی

زبان ہکلا رہی تھی۔

"میں تمہارے لیے کپڑے بھیج رہا ہوں"۔ پنڈت نے کہا۔ "تم نہا لو۔ کھانا بھی آجائے گا"۔

اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

سمرتی کی ہنسی نکل گئی۔ اُسے شعیب ارمغانی یاد آگیا۔ اُس نے شعیب ارمغانی کو بتایا تھا کہ کالنجر کے راجہ نے اُس کی موجودگی میں راجہ اننت پال سے کہا تھا کہ میں مسلمانوں کی جو خوبصورت لڑکی دیکھتا ہوں اُسے رقاصہ یا فاحشہ بنا دیتا ہوں۔ مسلمانوں کی نسل ختم کرنے کا اور ان میں بدی پیدا کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ ہند میں جو مسلمان رہ جائیں گے، ان کا پیشہ ناچ گانا اور عصمت فروشی رہ جائے گا"۔

سمرتی کو یاد آیا کہ ارمغانی نے اُسے کہا تھا کہ میں مسلمان بیٹیوں کی عصمت پر قربان ہو رہا ہوں۔ غزنی سے اتنی دور آ کر شہید ہونے والے تم جیسی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت کی خاطر شہید ہوئے ہیں۔ ارمغانی نے اسے کہا تھا۔ "زندہ رہنا چاہو تو اپنی روح کو پہچانو"۔

سمرتی نے اپنی روح کو پہچان لیا۔ اُسے ارمغانی یاد آیا تو اُس کے جذبات کی دنیا میں ہلچل سی بپا ہو گئی۔ اُسے ارمغانی کی باتیں یاد آنے لگیں۔ اُسے جب یہ خیال آیا کہ ارمغانی زندہ نہیں ہو گا تو اُس نے دل میں کسک سی محسوس کی۔ ارمغانی پہلا مرد تھا جس نے اس کی پناہ اور اس کی قید میں ہوتے ہوئے بھی اسے دھتکار دیا تھا۔

اس کے اندر ایک عزم بیدار ہو گیا۔ "میں ہندوؤں کے بتوں کے قدموں میں قربان نہیں ہوں گی" ۔۔۔ وہ فرار کے راستے سوچنے لگی۔ ایسی صورت حال سے وہ کبھی دوچار نہیں ہوئی تھی۔ وہ سپاہی نہیں تھی، مجاہدہ نہیں تھی۔ وہ شہزادی تھی۔ راجہ کے دل پر اس نے راج کیا تھا۔ بڑے بڑے جابر مرد اس کے آگے جھک جاتے تھے۔ فرار اس کے لیے آسان نہیں تھا لیکن فرار کا ارادہ پختہ تھا۔

وہ اٹھنے ہی لگی تھی کہ دو لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں۔ ایک نے کھانا اٹھا رکھا تھا اور دوسری کے ہاتھ میں کپڑے تھے۔ وہ نوجوان لڑکیاں تھیں، خوبصورت نہیں تھیں۔ کھانے کے دوران اُس نے لڑکیوں سے پوچھا کہ وہ مندر کے صدر دروازے سے کتنی دور

ہے۔ لڑکیوں نے اُسے بتایا کہ انہیں حکم ملا ہے کہ وہ اُس کے ساتھ کوئی فالتو بات نہ کریں۔ الٹا انہوں نے سمرتی سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔

"میں نگرکوٹ کی رقاصہ ہوں"۔ سمرتی نے کہا۔ "مجھے بڑے پنڈت جی مہاراج اس مندر کے لیے لائے ہیں۔ میں یہاں ناچا اور گایا کروں گی"۔

"مہاراج نے کہا تھا کہ تمہارا بہت خیال رکھیں"۔ ایک لڑکی نے کہا۔

"مہاراج نے کسی عورت کا اتنا خیال کبھی نہیں رکھا"۔ دوسری لڑکی نے کہا۔ "وہ عورتوں کے ساتھ بات نہیں کیا کرتے لیکن تمہارے متعلق وہ ایسی باتیں کرتے تھے جیسے تم ان کی اپنی بیٹی یا بہن ہو"۔

"یہ مہاراج کی نوازش ہے"۔ سمرتی نے کہا۔ "وہ مجھے خود سارے مندر کی سیر کرائیں گے۔ میں نے ایسے ہی پوچھا تھا کہ صدر دروازہ کہاں ہے؟"

وہ اسی دروازے سے مندر میں آئی تھی۔ لڑکیوں نے اسے صدر دروازے تک کا راستہ بتایا تو وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی سوائے اس کے کہ وہ کسی رہبر کے بغیر صدر دروازے تک نہیں پہنچ سکے گی۔ اگر وہ صدر دروازے سے نکل بھی جائے تو مندر کے اردگرد قلعہ تھا۔ اس نے لڑکیوں سے بہت کچھ پوچھا۔ انہوں نے کچھ اُسے بتایا، کچھ نہ بتایا۔ پنڈت کے متعلق اسے بتایا گیا کہ عورت کے نام سے بھی بدکتا ہے۔

لڑکیوں کو معلوم نہیں تھا کہ اس رقاصہ کو قربانی کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں نے اسے نہلایا اور وہ کپڑے پہنائے جو وہ لائی تھیں۔ یہ ساڑھی کی طرح کی ایک سفید چادر تھی جو سر کی اوڑھنی کے طور پر بھی استعمال ہو سکتی تھی۔ سمرتی کے ماتھے پر تلک لگایا گیا اور لڑکیاں چلی گئیں۔

پنڈت رادھا کشن کے کمرے میں دو پنڈت اُس کے پاس بیٹھے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ سمرتی کو قربانی کے لیے لایا گیا ہے۔ اسے قربانی کے لیے تیار کرنا انہی کا کام تھا۔ وہ اپنا عمل شروع کرنا چاہتے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس علاقے میں قحط آ گیا تھا۔ انوکھی بات تھی کیونکہ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں بارش بہت ہوتی تھی مگر اُس سال بارش نہ ہوئی۔ مویشی اور انسان بھوک سے مرنے لگے۔ پنڈت رادھا کشن کے کہنے

پھر ایک لڑکی کی قربانی دی گئی تھی۔ پندرہ سولہ روز مندر کے اسی کمرے میں جہاں سمرتی کو رکھا گیا تھا، اس لڑکی کو بھی رکھ کر اُسے قربانی کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

"وہ کنواری کنیا تھی" — پنڈت رادھا کشن نے سمرتی کے متعلق باتیں کرتے ہوئے پنڈتوں سے کہا۔ "یہ کنواری نہیں راج دربار کی نرتکی ہے۔ کنواری پوتر تھی۔ سمرتی کو پہلے پوتر کرنا پڑے گا۔ قربانی اسی کی دی جائے گی لیکن بہت دن انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ مسلمان ہے۔ اسے ذہنی طور پر پوجا پاٹ پر آمادہ کرنا ہے۔ اس کے بعد اسے قربانی کے لیے تیار کیا جائے گا۔"

"آپ جانتے ہیں مہاراج، فوجیں کوچ کر گئی ہیں؟" — ایک پنڈت نے کہا — "قربانی لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہو جانی چاہیے۔"

پنڈت رادھا کشن نے کہا — "فوجوں کو میدانِ جنگ تک پہنچتے بہت دن لگیں گے جتنی فوج گئی ہے۔ اس کے مقابلے میں محمود غزنوی کی فوج آدھی کے مقابلے میں بھی نہیں ہے۔ اسے کچل کر ہماری فوجیں غزنی کی طرف نکل جائیں گی۔ اس میں تین مہینوں سے زیادہ عرصہ گزر جائے گا۔ وہ وقت ہوگا جب ہم قربانی دیں گے۔ اُس وقت تک یہ نرتکی اس قابل ہو جائے گی کہ خود دیوی کے چرنوں میں بیٹھ کر کہے گی کہ میری گردن کاٹ دو۔"

دونوں پنڈت قائل نہیں ہو رہے تھے لیکن پنڈت رادھا کشن قربانی کو ملتوی کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اُس نے آخر حکم کے لہجے میں فیصلہ دیا کہ اس عورت کی قربانی کے متعلق وہ کسی کی بات نہیں سنے گا۔ چونکہ یہ انتخاب اس کا ہے، اور چونکہ اس نے یہ انتخاب دیوتاؤں کے اشارے پر کیا ہے اس لیے وہی بہتر جانتا ہے کہ قربانی کب دی جائے گی۔

پنڈت جب اُٹھ کر چلے گئے تو پنڈت رادھا کشن گہری سوچ میں کھو گیا۔

سمرتی حیران تھی کہ تین دن اور تین راتیں گزر گئی ہیں، اُس کے کمرے میں پنڈت رادھا کشن نہیں آیا۔ دو لڑکیاں اُس کے لیے کھانا لاتی رہیں اور اُس کی ہر ضرورت پوری کرتی رہیں۔ اُس نے انہیں کہا کہ وہ پنڈت جی مہاراج کو بھیجیں۔ پنڈت پھر بھی نہ آیا۔ سمرتی

کو جیسے کوئی غم ہی نہیں تھا کہ اُسے ذبح کر دیا جائے گا۔ اُسے افسوس صرف یہ ہو رہا تھا کہ اُسے ہندوؤں نے بے مذہب کیا اور رقاصہ بنایا اور وہ ہندوؤں کی ہی فتح کے لیے قربان کی جا رہی تھی۔ اُسے پورا پورا یقین تھا کہ مٹی اور پتھر کے بُت خدا نہیں ہیں اور فتح اور شکست ان کے ہاتھ میں ہو ہی نہیں سکتی — اور جو سچا اور واحد خدا ہے، اُس کے حکم کے مطابق انسانی جان کی قربانی بے گناہ کا قتل ہے۔ اور یہ جھوٹے مذہب کی رسم ہے۔

اُسے یاد تھا کہ چند سال پہلے لاہور میں راجہ جے پال کی فتح کے لیے ایک لڑکی کی قربانی دی گئی تھی۔ راجہ ایسی شرمناک شکست کھا کر واپس آیا تھا کہ اُس نے چتا پر کھڑے ہو کر اپنے ہاتھوں چتا کو آگ لگائی اور اپنے آپ کو جلا ڈالا تھا۔

سمرتی مرنے سے نہیں ڈرتی تھی لیکن وہ ہندوؤں کے بت کے قدموں میں نہیں مرنا چاہتی تھی۔ شعیب ارسغانی نے اُس کی روح کو بیدار کر دیا تھا، مگر وہاں سے فرار ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ہر لمحہ یہ خطرہ محسوس کرتی تھی کہ کوئی آئے گا اور اُسے گھسیٹ کر بت کے سامنے لے جائے گا اور اُس کی گردن پر چھُری پھیر دی جائے گی۔ اُس نے سُن رکھا تھا کہ پنڈت لوگ عورت کے معاملے میں پاکباز نہیں ہوتے، لیکن لڑکیوں نے اُسے بتایا تھا کہ پنڈت رادھا کشن پاکباز ہے اور رشی ہے۔ ہر کسی کی زبان پر تھا کہ پنڈت رادھا کشن برہم چاری ہے۔

اُسے یاد آیا کہ پہلی رات جب اُسے یہاں لایا گیا تھا تو اُسے شک ہوا تھا کہ پنڈت اُسے اپنے لیے لایا ہے۔ اُس نے اس شک کا اظہار کیا تو پنڈت نے کہا تھا — "ہمیں تمہارا جسم ضرور اچھا لگا ہے مگر تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہماری زندگی عورت سے ہمیشہ خالی رہی ہے اور خالی ہی رہے گی۔ ہم تو عورت کو قریب سے دیکھنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔"

سمرتی کو یہ بھی خیال آیا تھا کہ اُس نے پنڈت کی آنکھوں میں بے چینی سی دیکھی ہے۔ وہ مردوں کی نظروں کو خوب پہچانتی تھی۔ اُسے اپنے حسن کے طلسم کا بھی احساس تھا۔ اُس نے سوچنا شروع کر دیا اور فرار کا ایک راستہ اُسے نظر آ گیا۔ اُس نے اپنے حسن اور

نسوانیت کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کا ارادہ کرلیا۔ یہی ایک ذریعہ تھا جس سے وہ پتھر کو موم کرسکتی تھی۔

چوتھی رات کا پہلا پہر تھا جب پنڈت رادھا کشن اُس کے کمرے میں آیا۔ کمرے میں دو دیئے جل رہے تھے۔ سمرتی کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ پنڈت نے اُسے دیکھا تو ٹھٹھک کے رُک گیا۔ اُس نے سمرتی کو رقص کے لباس میں دیکھا تھا جو زرق برق تھا۔ اس میں سے اُس کے کندھے، گردن، سینے اور پیٹھ کے بالائی حصے عریاں تھے۔ اس کے چہرے پر مصنوعی رنگ اور آنکھوں میں کاجل تھی۔ اس کے بالوں کا سنگھار بھی کچھ اور تھا۔ اور اس حلیے میں بے حیائی تھی۔ مگر اب پنڈت اُسے سفید ساڑھی میں قدرتی رنگ میں دیکھ رہا تھا۔ اُس کا چہرہ اور کہنیوں تک بازو ننگے تھے۔ اُس کے چہرے سے مصنوعی رنگ اور کاجل ڈھل گئی تھی۔ اُس کے بال ڈھل کر نکھر آئے تھے اور اُس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ نیم عریانی میں اتنی حسین نہیں لگتی تھی جتنی مستور ہو کر لگی۔ اُس کے چہرے پر معصومیت تھی۔

''آپ مجھے بھول گئے تھے مہاراج!''۔۔۔ سمرتی نے پنڈت کے قریب آکر کہا۔۔۔ ''کہتے ہیں جانور کو ذبح کرنے سے پہلے پانی پلایا کرتے ہیں۔ آپ مجھے پانی نہ پلائیں، ذبح کرنے سے پہلے میری روح کی پیاس بجھا دیں، ورنہ میری روح اِس مندر میں بھٹکتی رہے گی۔ نہ چین لے گی نہ آپ کو چین لینے دے گی۔''

اُس نے پنڈت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ بات کہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں خمار تھا یا وہ تاثر تھا جو وہ کسی کو اپنے اثر میں لانے کے لیے اپنی آنکھوں میں اور اپنے چہرے پر پیدا کرلیا کرتی تھی۔ پنڈت نے محسوس کیا جیسے اُس کا جسم اندر سے لرزا ہو۔ اُسے اُس سمرتی سے نفرت ہوسکتی تھی جو رقاصہ کے لباس اور حلیے میں تھی۔ اُس حلیے میں اُس کے جسم سے گناہوں کی بو آتی تھی۔ اب اُس سادگی نے جبکہ اُس کے ماتھے پر تلک لگا ہوا تھا، وہ پاک لگ رہی تھی، اور پنڈت مسحور ہو گیا تھا۔

سمرتی نے اُسے بیٹھنے کو کہا مگر وہ سر جھکا کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ سمرتی خاموش تھی۔ پنڈت رُکا۔ اُس نے سمرتی کو دیکھا اور یوں سر جھکا لیا جیسے اُس کا سامنا کرنے

سے گھبرا گیا ہو۔ وہ چند قدم چل کر رُکا اور سمرتی کو اپنے قریب بلایا۔

''میں جانتا ہوں تم پیار کی پیاسی ہو''۔۔۔ پنڈت نے کہا۔۔۔ ''تمہیں کس کا پیار چاہیے؟...... باپ کا؟ بھائی کا؟ بیٹے کا؟...... یا تم......؟''

''کیا آپ نہیں جانتے کہ روح کس کا پیار چاہتی ہے؟''۔۔۔ سمرتی نے پوچھا۔۔۔ ''آپ کے پاس کون سا پیار ہے؟''

پنڈت کے چہرے کا تاثر بدلنے لگا۔ اُس کی آنکھیں بے چین ہو گئیں۔ سمرتی نے ہاتھ اُس کے کندھے پر رکھ دیئے اور اُس کے اتنی قریب ہو گئی کہ اُس کا سینہ پنڈت کے سینے کو چھونے لگا۔ سمرتی کے بازو اُس کی گردن کے گرد لپٹ گئے۔ اُس نے مخمور سی سرگوشی کی۔۔۔ ''وہ پیار جس کا جسم کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو، جس میں گناہ کی بو نہ ہو...... ہے آپ کے پاس ایسا پیار؟''۔۔۔ اُس کی سانسیں پنڈت کی سانسوں سے ٹکرانے لگیں۔ پنڈت اُس کے طلسم میں گرفتار ہو گیا۔

''گھبرائیں نہیں رشی!''۔۔۔ سمرتی نے کہا۔۔۔ ''آپ جس عورت سے بھاگتے ہیں وہ صرف جسم ہوتا ہے، وہ چلتا پھرتا بت ہوتا ہے۔ میں جسم نہیں ہوں۔ یہ جسم میرا نہیں۔ میں اسے تیاگ چکی ہوں۔ آپ کو اپنی روح دے رہی ہوں، اپنی آتما دے رہی ہوں۔ اس سے نہ ڈریں، اس سے نہ بھاگیں۔''

پنڈت پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ اُس کی آنکھوں کو جیسے سمرتی کی جادو بھری آنکھوں نے نظر نہ آنے والی زنجیروں میں جکڑ لیا تھا۔ سمرتی کے بازو اُس کے گرد لپٹ گئے تھے۔

"کیا آپ اپنے اندر کوئی تنگی سی محسوس نہیں کر رہے؟"

"میں جل رہا ہوں لڑکی!" ___ پنڈت نے پریشان ہو کر کہا "مجھے اور نہ جلاؤ۔"

سمرتی نے اُس کی باتوں میں یہ تبدیلی دیکھی کہ وہ پہلے اپنے آپ کو ہم کہتا تھا اب میں کہہ رہا تھا۔

"مجھے ذبح کرنے سے پہلے اس پیار کا ذائقہ چکھ لیں" ___ سمرتی نے کہا ___ "میرا جسم ذبح ہو جائے گا آپ کی رُوح قتل ہو جائے گی"

پنڈت اکھڑ گیا تھا سوچ میں کھو گیا تھا کبھی سمرتی کو دیکھتا کبھی سر جھکا کر ٹہلنے لگتا۔

"مجھے کس روز قربان کیا جائے گا؟" ___ سمرتی نے پوچھا۔

پنڈت چونک کر رُک گیا اور اس طرح بولا جیسے اُس کی زبان سے الفاظ پھسل رہے ہوں ___ "ابھی نہیں۔ ابھی نہیں"

"آج نہیں تو کل" ___ سمرتی نے کہا۔

پنڈت نے آہ لی اور سرگوشی میں بولا ___ "کل بہت دنوں بعد آئے گی۔ کون جانے کل کیا ہو گا"

وہ تیزی سے گھوما اور کمرے سے نکل گیا۔ سمرتی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ دروازے کو دیکھتی رہی جس میں سے پنڈت نکل گیا تھا لیکن اُس کی نظریں اُس کمرے تک نہ پہنچ سکیں جس میں پنڈت رہتا تھا۔ وہ اُس کمرے میں چلا گیا تھا۔ اُس نے دروازہ بند کر لیا اور بہت سے ہاتھوں والی دیوی کی مورتی کے سامنے بیٹھ گیا۔

دیوی مسکرا رہی تھی۔ وہ جب سے بنی تھی مسکرا رہی تھی۔ پنڈت نے پہلی بار اُس کی مسکراہٹ کو غور سے دیکھا۔ اُس کے سینے میں ایسی بے قراری تھی جسے وہ سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اُس کا آخری سہارا یہ مورتی اور بت تھے۔ وہ بھجنوں کی زبان میں اپنے دُکھ سکھ انہی کے آگے بیان کیا کرتا تھا مگر آج اُسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اُس کے جسم میں یہ بے قراری کیسے آ گئی ہے۔

اُس نے مورتی کی مسکراہٹ دیکھی اور وہ بھجن گنگناتے گنگناتے اس مسکراہٹ

میں کھو گیا۔ وہ تو اس دیوی کے آگے یہ پرارتھنا لے کے آن گرا تھا کہ اُس کی بے چینی کو قرار آ جائے مگر اس کی عبادت اور دُعا میں وہ یکسوئی نہیں تھی جو ہمیشہ ہوا کرتی تھی۔ اُسے مورتی کی مسکراہٹ بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ سمرتی کا چہرہ بن گیا اور مورتی کی مسکراہٹ سمرتی کا تبسم بن گیا۔ پنڈت اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کی زبان سے بھجن عادت کے مطابق پھسلتے رہے جیسے ندی آہستہ آہستہ بہتی جا رہی ہو۔

ستمبر ۱۰۰۸ء (۳۹۹ ہجری) کے دن تھے ہندوؤں کی فوج سیلاب کی طرح پشاور کی طرف بڑھی جا رہی تھی۔ رفتار تیز نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ مختلف ریاستوں کی فوجیں تھیں۔ کالنجر کی فوج حضرو کے مقام پر خیمہ زن ہو چکی تھی۔ لاہور سے جو فوجیں چلی تھیں اِن میں انند پال کی فوج کے علاوہ اوجین، گوالیار اور قنوج کی فوجیں تھیں۔ ان میں سے بعض کے دستے ابھی آ رہے تھے۔ جب کسی دستے کی آمد کی اطلاع ملتی تھی پوری فوج رُک جاتی تھی۔ اِن تمام افواج کی کمان راجہ انند پال کے بیٹے برہمن پال کو دی گئی تھی۔ وہ پوری فوج کو یکجا کر کے آگے بڑھنا بہتر سمجھتا تھا۔

رفتار سست ہونے کی دوسری وجہ دریا تھے جو چڑھے ہوئے تھے۔ فوجیں تو دریا پار کر لیتی تھیں، رسد کی بیل گاڑیاں اور اُن کے مویشیوں کو دریا پار کرانا خاصا دشوار تھا۔ اس متحدہ فوج کی تعداد کسی بھی مورخ نے نہیں لکھی۔ اتنا ہی پتہ چلتا ہے کہ تعداد لاکھوں میں تھی۔ اس کے مقابلے میں پشاور میں سلطان محمود غزنوی کے پاس جو فوج تھی، وہ ہزاروں میں تھی۔ ایک لاکھ بھی نہیں بنتی تھی۔ ہندوؤں کی اتنی زیادہ فوج کو سیلابی دریا پار کرتے کئی دن لگ رہے تھے۔ چھوٹی بڑی ندیاں بھی تھیں۔

رفتار سست ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سارے ملک میں مندروں کے ذریعے پروپیگنڈہ کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی فوج سارے ہند کو فتح کرنے کیلئے آ رہی ہے اور یہ فوج مندروں کو مسمار کر کے مسجدیں تعمیر کرے گی، جوان لڑکیوں کو اُٹھا لے جائے گی اور تمام ہندوؤں کو مسلمان کر لے گی۔ مسلمانوں کے خلاف ایسا خوفناک پروپیگنڈہ کیا گیا تھا کہ متحدہ فوج کے راستے میں لوگ آ جاتے اور فوج کو روک لیتے تھے۔ وہ نقدی اور زیورات

پیش کرتے اور اناج اور جانوروں کے لئے دانا چارہ بھی دیتے اور جو جوان آدمی تیغ زنی اور گھوڑ سواری کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، وہ فوج میں شامل ہو جاتے تھے۔ ہندوؤں پر مذہب کے حوالے سے اسلام دشمنی کا جنون طاری کر دیا گیا تھا۔

اِس طرح یہ فوج تعداد اور رسد کے لحاظ سے بڑھتی اور پھولتی جا رہی تھی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ہندوستان نے ایک ہی محاذ پر اتنی زیادہ فوج نہ کبھی دیکھی تھی نہ تاریخ نے اُس کے بعد کسی بھی دور میں دکھائی۔ تعداد، اتحاد اور ساز و سامان کے لحاظ سے یہ فوج تمام تر عالمِ اسلام کو تہ تیغ کرنے کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ ہندوستان نے تو اس کے بعد اسلام کے خلاف اتنی بڑی فوج نہ دیکھی، البتہ صلیبی سلام کے خلاف اس سے بھی زیادہ فوج سلطان صلاح الدین ایوبی کے مقابلے میں لائے تھے۔ اس کے بعد سلطان ایوبی کے پوتے الکمال کو شکست دینے کے لئے صلیبی یورپ کے نو ملکوں کی افواج لائے تھے۔

ہندوؤں کی متحدہ افواج بڑھتی چلی جا رہی تھیں۔ فوجیوں پر اور شہریوں پر بھی ایک دیوانگی طاری تھی ”مسلمانوں کو کچل دو۔ اسلام کو ختم کر دو“ ۔ اور لوگ اپنا سب کچھ اپنی فوج پر نچھاور کر رہے تھے۔ سلطان محمود غزنوی کو پشاور میں اطلاعیں مل رہی تھیں کہ یہ لشکر کہاں تک پہنچا ہے اور وہاں تک اس کی تعداد میں کتنا اضافہ ہو چکا ہے۔ اُس نے اپنے سالاروں سے کہہ دیا تھا کہ دشمن کو دریا پار نہیں کرنے دیا جائے گا۔ اور لڑائی دریا کے پار لڑی جائے گی۔ سالاروں نے اس خطرے کا اظہار کیا تھا کہ دشمن کی تعداد چونکہ نسبت زیادہ ہے، اس لیے دریا کو اپنی پیٹھ پیچھے رکھ کر نہ لڑا جائے۔ ضرورت کے مطابق پسپائی بڑی تباہ کن ثابت ہو گی۔

سلطان محمود غزنوی نے انہیں بتایا تھا کہ انہیں گھوم پھر کر لڑنا پڑے گا۔ اس کے لیے کھلے میدان کی ضرورت ہے جو دریا کے پار ہے۔ دریا کے پشاور والے کنارے سے آگے علاقہ پہاڑی ہے جہاں چھاپہ مار جنگ نہیں لڑی جا سکے گی۔ دشمن کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ وہ کوئی ایک دستہ مروا کر بھی پشاور سمیت پہنچ جائے گا۔ اگر اس نے ہمیں پیچھے دھکیل دیا تو ہم محفوظہ سے اُس کے لئے دریا پار کرنا محال کر دیں گے۔

سلطان محمود غزنوی کو اپنی فوج کے جذبے، اپنے ایمان اور اپنے خُدا پر بھروسہ تھا۔ اُس نے اپنی فوج کے کچھ آدمی ماہی گیروں اور مزدوروں کے بھیس میں دریائے سندھ کے کناروں پر بھیج دیئے اور کچھ چھاپہ مار حفظ دیئے بھیجے۔ اُن کے ذمے یہ کام تھا کہ اس فوج کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں اور اگر یہ فوج کُوچ کر کے دریا کے قریب آ جائے اور کشتیوں کا پُل بنائے تو پُل کے رسّے کاٹ دیئے جائیں اور اگر ممکن ہو سکے تو کشتیوں میں سوراخ کر دیئے جائیں۔

سلطان محمود غزنوی نے اپنی فوج کو کُوچ کا حکم دے دیا اور دریائے سندھ کے کنارے پر آ گیا۔ اُس نے فوج کو چار حصّوں میں تقسیم کیا۔ دو حصّوں کو دریا کے پار موجودہ اٹک کے شمال میں پہنچا دیا۔ دو حصّوں کو دریا کے دوسرے کنارے پر رکھا۔ کشتیوں کا مضبوط پُل بنا دیا گیا۔ دریا کے پشاور والے کنارے پر فوج کے جو دو حصے تھے، ان میں سے ایک سوار دستوں پر مشتمل تھا۔ اُسے دریا کے کنارے پر چوکس ہو کر گھومتے پھرتے رہنا تھا تاکہ دشمن کسی طرف سے دریا پار کرنے کی کوشش کرے تو اسے روک لیں۔ یہ گھوڑ سوار تیر انداز تھے۔ دوسرا حصہ محفوظہ کا تھا۔

اور پھر سلطان کو اطلاع ملی کہ دشمن دریا سے چند میل دور رُک گیا ہے۔ یہ اس فوج کا آخری پڑاؤ تھا۔ سلطان تھوڑا سا وقت اور حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُسے کسی طرف سے کمک کی توقع تھی۔ اُس نے ترکستان اور بخیرہ سے جو دستے منگوائے تھے، وہ اُس کے پاس آ گئے تھے۔ اُسے مزید وقت کی ضرورت اس لئے تھی کہ سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ سلطان محمود کی خواہش یہ تھی کہ جنگ سردی کے عروج کے وقت شروع ہو۔ اُس کی فوج کے سپاہی یخ بستہ خنکی میں لڑ سکتے تھے۔ اُسے معلوم تھا کہ قنوج اور گوالیار وغیرہ کی فوج سردی میں نہیں لڑ سکے گی۔

مہینے سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ سمرتی کا کمرہ شہزادی کا کمرہ بن چکا تھا۔ پنڈت رادھا کشن اُس کے پاس آتا اور باتیں کرتا رہتا تھا۔ اگر کوئی اُسے اِس کمرے میں دیکھتا تو یقین نہ کرتا کہ یہ اُن کا پنڈت رادھا کشن ہے۔ وہ سمرتی کی عمر کا آدمی معلوم ہوتا

تھا۔ اُس نے سمرتی کے کمرے میں گلدستے رکھوا دیئے اور وہاں پر ریشمی پلنگ پوش بچھا دیئے تھے۔ مٹی کے دیئے کی جگہ فانوس لگوا دیئے تھے اور لڑکیاں ہر صبح کمرے میں تازہ پھول رکھ جاتی تھیں۔

دوسرے پنڈتوں کا خیال تھا کہ اُن کا بڑا پنڈت سمرتی کو قربانی کے لیے تیار کر رہا ہے۔ پنڈت رادھا کشن انہیں بتایا بھی یہی کرتا تھا کہ سمرتی قربانی کے لیے تیار ہے لیکن سمرتی کے پاس جا کر وہ بھول جایا کرتا تھا کہ اُسے قربانی کے لیے پاک اور تیار کرنا ہے۔ صرف سمرتی تھی جسے یقین تھا کہ اُسے قربانی کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ پنڈت نے اُس کے جسم کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا البتہ اُس کے ہونٹ جو ہمیشہ سے مسکراہٹ سے محروم تھے، اب مسکرانے لگے تھے۔ سمرتی کی بعض باتوں سے وہ ہنس بھی پڑتا تھا۔ سمرتی نے اُسے کئی بار کہا کہ وہ اُسے ابھی ذبح کر دے کیونکہ موت کا انتظار اذیت ناک ہے۔ یہ سُن کر ہر بار پنڈت کا چہرہ اداس ہو جایا کرتا تھا۔

وہ پنڈت جو سمجھتا تھا کہ اُس نے اپنے آپ کو عورت سے محروم کر کے دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کر لی ہے، اب اُس کی حالت یہ تھی کہ وہ جیسے دیوتاؤں کو ناراض کر کے سمرتی کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی میں جو خلا پیدا کر لیا تھا، وہ سمرتی سے پُر ہونے لگا تھا۔ پیاسے کو پانی ملا تو اُسے محسوس ہُوا کہ وہ پیاس سے جل رہا تھا۔ اُس نے سمرتی کو کبھی بیٹی کے روپ میں دیکھا، کبھی بہن کے روپ میں اور کبھی اُسے اپنی ماں سمجھا۔ اس مندر میں سمرتی سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں آیا کرتی تھیں۔ پنڈت نے ان کے ساتھ کبھی بات نہیں کی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ منہ پھیر لیا کرتا تھا۔ سمرتی پہلی لڑکی تھی جس کی اُس نے باتیں سنیں اور جو اُس کی مرضی کے بغیر اُس کے سینے سے لگ گئی تھی۔ اس قرب نے اور اس لمس نے پنڈت کے اندر وہ تشنگی بیدار کر دی جسے وہ اپنی عظمت کی علامت سمجھا کرتا تھا۔

"کیا تمہاری آتما اب بھی اُس پیار کی پیاسی ہے جو تم نے مجھ سے مانگا تھا؟" ——— ایک روز اُس نے سمرتی سے پوچھا۔

"آپ پہلے مرد ہیں جس نے مجھے اتنی راتیں اپنے پاس رکھا لیکن اس طرح رکھا جیسے میں آپ کے پاس نہیں ہوں" ——— سمرتی نے کہا۔ "آپ نے میرے جسم کے ساتھ کبھی کا اظہار نہیں کیا۔ میری آتما اسی میں شانت ہو گئی ہے ... کیا میں اب دیوتاؤں کے چرنوں میں قربان ہونے کے لیے تیار ہو گئی ہوں؟"

"ابھی نہیں" ——— پنڈت رادھا کشن نے اداس سے لہجے میں کہا۔

"کیا میں ابھی تک ناپاک ہوں؟"

پنڈت اُسے دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سمرتی آگے بڑھی اور اُس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ساڑھی کے پلو سے اُس کے آنسو پونچھ ڈالے۔ وہ اُس پر جھکی ہوئی تھی۔ اُس کے کھلے ہوئے نرم و ملائم بال پنڈت کے چہرے پر جا پڑے۔ پنڈت نے ایک ہاتھ اُٹھایا۔ ہاتھ کانپ رہا تھا۔ سمرتی کا ایک گال پنڈت کے سر پر تھا۔ پنڈت کا کانپتا ہوا ہاتھ سمرتی کے بکھرے بالوں تک گیا اور اُس نے اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

اچانک وہ اُٹھ کھڑا ہُوا۔ سمرتی گھبرا گئی۔ پنڈت نے اُسے پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھا جیسے اُسے خواب سے بیدار کر دیا گیا ہو۔ وہ سمرتی کو جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا، جیسے وہ اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میرا ہاتھ کس نے اُٹھا کر تمہارے بالوں پر رکھ دیا تھا؟

قلعے کے دروازے کا گھڑیال بجنے لگا۔ پنڈت رادھا کشن پوری طرح اپنے آپ میں آ گیا۔ یہ گھڑیال اُس وقت بجا کرتا تھا جب کوئی راجہ مہاراجہ آیا کرتا تھا۔ پنڈت قلعے کے دروازے پر جا کر اُس کا استقبال کیا کرتا تھا۔ اُس نے سمرتی سے کہا کہ کوئی مہمان آیا ہے، اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

راجہ انند پال کی بیوی آئی تھی۔ یہ انند پال کے دوسرے بیٹے برہمن پال کی ماں تھی۔ متحدہ افواج کی کمان اسی برہمن پال کو دی گئی تھی، حالانکہ انند پال خود ساتھ تھا۔ اُس نے برہمن پال کی ماں کو بتایا تھا کہ راج محل کی سب سے اعلیٰ رقاصہ کو نگرکوٹ کے پنڈت نے انسانی قربانی کے لیے منتخب کر لیا ہے اور اُس نے یقین دلایا ہے کہ

فتح برہمن پال کی ہوگی۔

اس سے پہلے راجا انندپال کی دوسری بیوی نے اپنے بیٹے سکھ پال کو جو مسلمان ہوگیا تھا، سلطان کے خلاف اس امید پر باغی کیا تھا کہ وہ بھیرہ کو فتح کرکے سلطان محمود غزنوی کو قیدی بنا لائے گا اور باپ کی گدی کا جانشین بنے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ پال بھیرہ میں سلطان کا قیدی بن گیا اور سلطان نے اسے عمر بھر کے لیے قید میں ڈال دیا تھا۔ اب انندپال کی دوسری بیوی کو ایسی ہی توقع تھی کہ اس کا بیٹا پشاور کو فتح کرکے غزنی کو بھی تہ تیغ کرے گا اور اپنے باپ کی جگہ راج کرے گا۔ وہ بیٹے کی فتح کے لیے بے تاب تھی وہ نگرکوٹ یہ معلوم کرنے آئی تھی کہ سمرتی کی قربانی دی جاچکی ہے یا نہیں۔

پنڈت رادھاکشن نے اسے بتایا کہ چونکہ سمرتی رقاصہ رہی ہے اور وہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئی تھی، اس لیے اسے پاک کرتے بہت دن لگ گئے ہیں۔ برہمن پال کی ماں نے اسے کہا کہ اس سے پہلے بھی جوان لڑکیوں کی قربانی دی جاچکی ہے۔ کسی پر اتنا زیادہ عرصہ صرف نہیں کیا گیا۔ اس نے اصرار شروع کردیا کہ سمرتی کی قربانی جلدی دی جائے کیونکہ فوجیں میدان جنگ کے قریب پہنچ گئی ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اسے بتایا گیا ہے کہ لڑکی کو ابھی بن گنگا تک بھی نہیں لے جایا گیا۔

پنڈت رادھاکشن کی حیثیت راجوں مہاراجوں سے بہت اونچی تھی اور اسے بھگوان کا ایلچی سمجھا جاتا تھا لیکن انندپال کی بیوی نے ایسے شک کا اظہار کردیا جس سے پنڈت کی حیثیت ذرا اچھی نہ رہ گئی۔ اس نے کہا ”سمرتی کے حسن اور اس کے جسم میں ایسی کشش ہے کہ جو اسے دیکھتا ہے دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ اس کا یہی جادو نگرکوٹ کے مندر پر بھی چل گیا ہے میں اس کی قربانی تک یہیں رہوں گی“۔

پنڈت رادھاکشن نے کچھ بھی نہ کہا۔ شک غلط نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ وہ کل صبح رانی کو بن گنگا لے جا رہا ہے۔ یہی ایک کام رہ گیا تھا جو کل ہوجائے گا اور اس سے اگلے

روز سمرتی کو قربان کردیا جائے گا۔

راجا انندپال کی بیوی شاہی مہمان خانے میں چلی گئی۔ پنڈت رادھاکشن سمرتی کے کمرے میں چلا گیا۔ سمرتی نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ پنڈت کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ سمرتی کو دیکھتا رہا۔ جب سمرتی نے اس سے پریشانی اور خاموشی کی وجہ پوچھی تو پنڈت نے کہا۔ ”میں صبح اتنی جلدی آؤں گا جب ابھی اندھیرا ہوگا۔ ہم دونوں بن گنگا چلیں گے“۔ اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

قافلے میں دو اونٹ تھے اور تین گھوڑے۔ ایک اونٹ پر ایک جوان لڑکی اور دوسرے پر ایک ادھیڑ عمر عورت سوار تھی۔ گھوڑوں پر مرد سوار تھے۔ وہ ہندو معلوم ہوتے تھے۔ ان کا حلیہ اور ان کا لباس ہندوؤں جیسا تھا۔ ایک کتا بھی ان کے ساتھ تھا۔ اُس زمانے میں قافلوں کے ساتھ رکھوالی والے کتے لازمی سمجھے جاتے تھے۔ یہ قافلہ لاہور سے چلا تھا اور اس کی منزل نگرکوٹ تھی۔ راستے میں ان سے جس کسی نے پوچھا انہوں نے یہی بتایا کہ وہ پوجا پاٹ کے لیے نگرکوٹ کے مندر میں جا رہے ہیں۔ اب یہ قافلہ نگرکوٹ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس علاقے میں آکر وہ لوگوں کو بتاتے تھے کہ وہ نگرکوٹ کے بلند رشی رادھاکشن کے درشن کرنے اور پاؤں چھونے جا رہے ہیں۔ نگرکوٹ کے ارد گرد کے تمام لوگ پنڈت رادھاکشن کو اوتار مانتے تھے۔

اس قافلے نے نگرکوٹ سے تھوڑی ہی دور آخری پڑاؤ کیا۔ رات وہ آگ جلا کر اس کے ارد گرد بیٹھے تو ان میں سے ایک آدمی نے کہا کہ مندر میں داخل ہوگئے اور اگر کسی کو ہم پر شک نہ ہوا تو یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ سمرتی کہاں ہے۔ اگر وہ قربان ہوچکی ہے تو میں اس مندر کے تمام پنڈتوں کو قتل کرکے یہاں سے نکلوں گا۔

یہ شعیب ارسلانی تھا جو ہندوؤں کے مذہب سے، ان کے رسم و رواج اور ہندوؤں کی زبان اور اصطلاحوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے لاہور سے اپنے دو ساتھی ساتھ لے لیے تھے۔ زرد سمرتی کے گھر میں آگئی تھی۔ سمرتی کی خادمہ ساتھ

چلنے کو پہلے ہی تیار تھی۔ شعیب ارمغانی اور اُس کے ساتھیوں نے سر منڈوا کر ہندوؤں کی طرح سر کی چوٹیوں پر بودیاں رکھ لی تھیں۔ داڑھیاں صاف کرا کے مونچھیں اس طرح بڑھالی تھیں کہ ہونٹوں پر چھجوں کی طرح پڑی رہتی تھیں۔ خادمہ اور زرد کو بھی انہوں نے ہندوؤں کے حلیے میں چھپا لیا تھا۔ اُن دونوں کے چہرے چھپانے کا نہایت آسان اور کامیاب طریقہ یہ تھا کہ دونوں نے گھونگھٹ نکال لیے تھے۔ یہ ہندوؤں کا رواج تھا۔

اونٹوں اور گھوڑوں کا انتظام شعیب کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ خواہش خادمہ کی تھی کہ وہ کتے کو ساتھ لے چلیں کیونکہ پیچھے اُس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ یہ سمرتی کا کتا تھا جو اُس سے بہت پیار کرتا تھا۔ رات کو گھر کی رکھوالی کرتا اور سمرتی گھر میں ہوتی تو اُس کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا۔ راستے میں بھی کتے کی ضرورت تھی۔

انہوں نے آخری پڑاؤ میں سمرتی کو مندر سے نکالنے کے اُن طریقوں پر غور کیا جو وہ سوچ کر آئے تھے۔ انہوں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اُن کا زندہ واپس آنا مخدوش ہے۔ خادمہ اور زرد نے اپنے ذمے یہ کام لیا تھا کہ سمرتی اگر زندہ ہوئی تو اُس کا سراغ لگالیں گی۔ مندر کے بیسیوں کمرے تھے، تہہ خانے میں بھی کمرے تھے اور راہداریاں اور سیڑھیاں تاریک تھیں اس لیے سمرتی کو ان بھول بھلیوں سے نکالنے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھنے کی ضرورت تھی۔ خادمہ نے مردوں کو بتایا تھا کہ یہ بھول بھلیاں کیسی ہیں۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ مندر کے قلعے میں فوج بھی رہتی تھی۔

ارمغانی اور اُس کے ساتھیوں نے خنجر اور خنجر نما تلواریں پہنے ہوئے کپڑوں کے اندر چھپالیں اور یہ قافلہ رات کے آخری پہر نگر کوٹ کی طرف روانہ ہوا۔ خادمہ رہبری کر رہی تھی۔ انہیں سحر کی تاریکی میں مندر کے دروازے میں پہنچ جانا تھا۔

یہ وہ سحر تھی جب پنڈت رادھا کشن نے سمرتی سے کہا تھا کہ اُسے بن گنگا میں اشنان کے لیے لے جانا ہے۔ پنڈت سمرتی کے کمرے میں گیا۔ سمرتی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ پنڈت نے اُسے جگایا اور کہا کہ وہ اُس کے ساتھ چلے۔ سمرتی خاموشی سے اُس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ مندر سے نکلے۔ اُن کے لیے قلعے کا دروازہ کھل گیا۔ باہر آ کر وہ پہاڑی سے اترنے لگے۔ پنڈت تو کئی برسوں سے اس پہاڑی سے اُترا اور چڑھا رہا تھا

اس لیے اُسے کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ دشواری سمرتی کے لیے تھی جو دو گھوڑوں والی بگھی کی سواری کی عادی تھی۔ اُسے جو چپل پہنائے گئے تھے، اُن سے وہ چل بھی نہیں سکتی تھی۔ پہاڑی سے اُترتے اُس کے پاؤں بار بار پھسلتے تھے۔ پنڈت اُسے سہارا دیتا تھا اور وہ سنبھل جاتی تھی۔ پھر سمرتی نے ایک بازو پنڈت کی کمر کے گرد لپیٹ دیا اور اترنے لگی۔ پھر بھی اس سے اچھی طرح اترا نہیں جاتا تھا۔ پنڈت نے بھی بے قابو ہو کر اپنا بازو اُس کے گرد لپیٹ لیا اور اُسے تقریباً اپنے اوپر گرا کر پہاڑی اُترنے لگا۔ موسم سرد تھا۔ سمرتی اُس کے ساتھ چپک گئی۔

وہ پہاڑی سے اُتر آئے اور دریا کی طرف چل پڑے۔ مندر دُور اُوپر رہ گیا تھا۔

نیچے جنگل اور ویرانہ تھا۔ پنڈت نے سمرتی کو اپنے بازو سے آزاد نہ کیا۔ وہ اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہوئے چلتے گئے۔ صبح کا اجالا نکھرنے میں ابھی بہت دیر باقی تھی۔ پنڈت سمرتی کو اس لیے اتنی جلدی لے آیا تھا کہ صبح کے وقت دریا پر لوگ آ جاتے تھے۔ سمرتی کو چھپا کر رکھتا تھا۔

"کیا آپ مجھے آخری غسل کے لیے جا رہے ہیں؟" — سمرتی نے پوچھا۔

پنڈت نے اس کے سوا کوئی جواب نہ دیا کہ اپنے بازو کا گھیرا اُس کے گرد اور زیادہ تنگ کر کے اُسے اس طرح اپنے ساتھ لگا لیا جیسے اُسے اپنے جسم میں جذب کر لینا چاہتا ہو۔

"آپ بولتے کیوں نہیں؟" — سمرتی نے کہا — "مجھ سے آپ کیوں ڈرتے ہیں؟ مجھے آج مرنا ہی ہے تو مجھے بتا دیں"۔

"بتا دوں گا سمرتی!" — پنڈت نے اُسے اپنے آگے اس طرح کر لیا کہ دونوں کے سینے مل گئے — "میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم دونوں قربان ہو رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میں آج کا سورج نہیں دیکھ سکوں گا" — اُس کی آواز بھرا گئی۔ وہ ندھیائی ہوئی آواز میں بولا — "زندگی کی آخری رات ہے۔ مجھے پیاسا مرنے دو۔ میں سمجھتا تھا کہ میں اپنا من مار چکا ہوں۔ من نہیں مرا۔ میں نے تم پر ہر روپ چڑھایا ہے۔ بیٹی کا بھی، بہن کا بھی، ماں کا بھی۔ صرف ایک روپ کو چھپانے کے لیے میں نے اپنے آپ کو بہت دھوکے دیئے ہیں۔ میں نے دیویوں کی مورتیوں میں تمہاری مسکراہٹیں دیکھی ہیں۔ پاپی من ہارا نہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا

کیسلی! میں عورت کے وجود سے بہت بھاگا ہوں مگر...."

"آپ پتھر کے بھگوان کو مانتے ہیں" — سمرتی نے کہا — "میرے خدا کی عبادت کریں۔ من کے سب پاپ جھڑ جائیں گے۔"

"مجھے باتوں میں نہ لگاؤ سمرتی!" — پنڈت نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "میں نے تمہاری روح کو پیار دیا ہے۔ اس کے عوض مجھے جسم کا خمار دے دو۔ شاید یہ دن میری زندگی کا آخری دن ہو۔ پھر اس جسم کو جلا دیا جائے گا۔ میں جیتے جی جل رہا ہوں۔"

سمرتی نے قہقہہ لگایا اور اُچک کر اس سے الگ ہو گئی۔ بولی — "تیرا کشن مراری سچا ہوتا تو تیری پیاس برسوں کی پرارتھنا کو یوں پاپ میں ڈوبنے نہ دیتا۔ میں آزاد ہوں۔ میں جانتی تھی تو مجھے ایک دن انہی نگاہوں سے دیکھے گا جن سے مجھے پاپیوں نے دیکھا تھا۔ میں نے تیرے اندر اس آگ کو اسی لیے بھڑکایا تھا کہ تو جلتا ہوا میرے قدموں میں آگرے اور میں تجھے بھوکے کتے کی طرح اپنے پیچھے پیچھے جنگل میں لے جاؤں اور آزاد ہو جاؤں.... میں آزاد ہوں.... میں آزاد ہوں۔"

وہ ایک طرف دوڑ پڑی لیکن اونچی نیچی زمین پر وہ تیز دوڑ نہ سکی۔ پنڈت نے اُسے چند قدموں پر پکڑ لیا اور کہا — "پاگل نہ بنو سمرتی! مجھ سے بھاگ کر کہاں جاؤ گی! کہاں پناہ ڈھونڈو گی! میں تمہیں پکڑ لوں گا اور ذبح کر دوں گا۔ میں تم سے کوئی قیمتی چیز نہیں مانگ رہا۔"

سمرتی نے اُس کے منہ پر بڑی زور سے تھپڑ مارا اور بولی "میں دریا میں ڈوب جاؤں گی۔ تیرے بتوں کی بھینٹ نہیں چڑھوں گی۔"

"تجھے کوئی نہیں بچا سکتا سمرتی!" — پنڈت نے کہا — "بتوں کی توہین نہ کر۔"

"مجھے میرا خدا بچائے گا" — سمرتی نے کہا — "میرا خدا سچا ہوا تو تیرا ایک بھی بت سلامت نہیں رہے گا۔"

پنڈت بھوکا بھیڑیا بن گیا تھا۔ اُس کے وجود میں وہ مرد بیدار ہو گیا تھا جسے وہ سمجھتا تھا کہ ہمالیہ کے دامن میں مار آیا ہے۔

تب اُسے ایک کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز قریب آ رہی تھی۔

جس وقت مندر کی پہاڑی سے دُور جا کر پنڈت کشن نے رُک کر سمرتی کو اپنے سینے سے لگایا تھا، اُس وقت شیب ارسغالی کا چھوٹا سا قافلہ پہاڑی کے دامن میں اُس جگہ پہنچا تھا جہاں سے مندر کا راستہ اوپر جاتا تھا۔ سمرتی کی خادمہ اس جگہ سے واقف تھی۔ انہیں گھوڑے اور اونٹ وہیں چھوڑ دینے تھے۔ سمرتی کا کتا کھلا ہوا تھا۔ وہ زمین کو سونگھ کر بے تابی سے غرّایا، پھر دبی سی آواز میں بھونکا اور اُس طرف زمین کو سونگھتا چل پڑا جدھر پنڈت اور سمرتی گئے تھے۔ قافلے والوں نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ کتے تو ایسی حرکتیں کیا ہی کرتے ہیں۔

کتا دوڑنے لگا اور اُس کی بھونکنے کی آواز بلند اور دُور ہونے لگی۔ خادمہ نے کہا کہ کتے کو کسی گیدڑ یا بھیڑیے کی بو آ گئی ہے۔ ان میں سے کوئی تصور میں نہیں لا سکتا تھا کہ کتا مالکن کی بو پر جا رہا ہے۔ اُسے سمرتی سے جدا ہوئے اڑھائی تین مہینے ہی گذرے تھے۔ وہ سمرتی کے ساتھ بچوں کی طرح کھیلا کرتا تھا۔ اُس کے بستر میں گھس جایا کرتا تھا۔ سمرتی اُس کے ساتھ بچوں کی طرح پیار کیا کرتی تھی۔

پنڈت نے جب کتے کے بھونکنے کی آواز سنی تو اُس نے پروا نہ کی۔ وہ بھوکے بھیڑیے کی طرح سمرتی پر ٹوٹ پڑا تھا اور سمرتی اُس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پنڈت نے اُسے گرا لیا اور اُس کی ساڑھی نوچنے لگا۔ اب سمرتی بے بس ہو گئی تھی۔ ایک کتا اُس کے گرد گھوم کر اپنا منہ اس کے منہ کے قریب لے گیا تو وہ سمجھی کہ یہ بھیڑیا ہے یا مندر کا کتا ہے۔ وہ کیسے یقین کر سکتی تھی کہ یہ اُس کا اپنا کتا ہے۔ کتا اُس کا منہ چاٹنے لگا تو اُسے کچھ شک ہوا۔ اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا — "شیری! پکڑ لو۔"

کتے نے اگلی ٹانگیں اٹھا کر پنجے پنڈت کے جسم میں اتار دیے اور اُس کا ایک کندھا منہ میں لے لیا۔ اُس نے پنڈت کو جھنجھوڑا تو پنڈت چیخ کر اُٹھا۔ سمرتی اُس کے نیچے سے نکل آئی۔ کتے نے کندھے سے منہ اکھاڑ کر پنڈت کی ران دانتوں کے شکنجے میں لے لی۔ پنڈت نے ایسا واویلا بپا کیا کہ دُور دُور تک سنائی دیا۔ پنڈت بھاگا تو کتے نے اُس کی

ٹانگ پھر پکڑ لی۔ سمرتی نے چلا کر پنڈت سے کہا۔ "میں نے تجھے کہا تھا کہ مجھے میرا خدا بچائے گا۔ یہ میرا کتا ہے جو لاہور سے میری بو پر آیا ہے۔"

سمرتی نے کتے کو پکڑ لیا۔ پنڈت بھاگ گیا۔ سمرتی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُس کا کتا کہاں سے آ گیا ہے! کتا اُس کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ سمرتی کو قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ خوف سے کانپنے لگی کہ مندر کے فوجی پنڈت کی مدد کو آ رہے ہیں۔ اُس نے چھپنے کی کوشش کی لیکن اُسے ایک عورت کی آوازیں سنائی دیں "شیری... شیری" وہ کتے کو بلا رہی تھی۔ آواز سمرتی کی خادمہ کی تھی۔ پنڈت کا واویلا اتنا بلند تھا کہ انہیں بھی سنائی دیا تھا۔ ارمغانی اور اُس کے ساتھیوں نے اُس کے ساتھ کتے کے بھونکنے اور جھنجھوڑنے کی آوازیں بھی سنی تھیں۔ ارمغانی کو یاد آ گیا تھا کہ اس کتے نے اُسے بھی جھنجھوڑا اور بری طرح زخمی کر دیا تھا۔

وہ سب دوڑتے وہاں پہنچے تو سمرتی نیم تاریکی میں ادھر اُدھر چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُسے پہچاننے میں ذرا دقت محسوس ہوئی۔ سمرتی نے جب ارمغانی اور اپنی خادمہ کو پہچان لیا تو اُسے خواب کا دھوکہ ہوا۔ اُس نے بڑی تیزی سے انہیں بتایا کہ وہ اس جگہ تک کس طرح پہنچی ہے۔ ارمغانی نے اُسے بتایا کہ وہ کس طرح نگر کوٹ آئے ہیں۔ زیادہ رکنا خطرناک تھا۔ سب وہیں واپس چلے گئے جہاں اونٹ اور گھوڑے کھڑے تھے۔ زرفشاں اور سمرتی کو ایک اونٹ پر بٹھایا گیا۔ خادمہ دوسرے اونٹ پر بیٹھی۔ مرد گھوڑوں پر سوار ہو گئے اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا لیکن اُن کی منزل لاہور نہیں ہو سکتی تھی۔ اب ان میں کوئی بھی لاہور نہیں جا سکتا تھا سوائے ارمغانی کے دو ساتھیوں کے۔ لاہور میں ان پر کسی کو شک نہیں تھا کہ وہ ارمغانی کے ساتھی ہیں۔

یہ قافلہ اب عام راستے سے ہٹ کر جنگلوں اور ویرانوں میں جا رہا تھا۔ سب سے بڑا خطرہ تعاقب کا تھا۔ انہوں نے حساب لگایا کہ پنڈت اوپر جائے گا۔ اطلاع دے گا کہ سمرتی بھاگ گئی ہے۔ تعاقب میں آنے والے پہاڑی سے اتریں گے اور جتنا وقت گزر جائے گا، اتنے وقت میں اونٹ اور گھوڑے انہیں بہت دور لے جائیں گے۔ اب اُن کی رفتار بہت تیز تھی۔

اُن کا حملہ بے بنیاد تھا۔ اُن کے تعاقب میں کوئی نہیں آ رہا تھا۔ کتے نے پنڈت کے کندھے اور ٹانگوں سے گوشت اکھاڑ دیا تھا۔ خون چشمے کی طرح نکل رہا تھا۔ وہ مدد کے لیے چیختا چلاتا تو کوئی نہ کوئی اُس کی مدد کو پہنچ سکتا تھا۔ ان زخموں سے وہ مر نہیں سکتا تھا مگر اُس نے کسی کو مدد کے لیے نہ بلایا۔ اُس نے یہ بھی نہ کیا کہ اُس نے جو چادر اپنے اوپر لے رکھی تھی، اُسے پھاڑ کر زخموں پر باندھ لیتا تاکہ خون رک جاتا اور وہ پہاڑی پر اپنے مندر میں جانے کی بجائے نگر کوٹ گاؤں میں چلا جاتا جو قریب ہی تھا۔

وہ کہیں بھی نہ گیا۔ اُس نے کچھ بھی نہ کیا۔ اُس نے زیرِ لب کہا — "اچھا ہوا.... ایسے ہی ہونا تھا، ہو گیا.... اچھا ہوا" — وہ اٹھا اور بن گنگا کی طرف چل پڑا — "گنگا ماتا میرا یہ پاپ نہیں دھو سکے گی.... اس ناپاک جسم کو آگ بھی پاک نہیں کر سکے گی.... من پاپی ہو جائے تو تن کو پاپ کرتے دیر نہیں لگتی.... میں پیاسا ہوں" — وہ چلتا گیا اور اُسے چکر آ گیا۔ لڑکھڑا کر سنبھل گیا۔ خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔ وہ چند قدم اور چلا اور گر پڑا۔ اُٹھا، چلا اور پھر گر پڑا — "تھوڑا دور اور.... مجھے گنگا جل تک پہنچنے دے۔"

وہ اٹھتا تھا اور گرتا تھا۔ وہ پیٹ کے بل رینگنے لگا۔ صبح طلوع ہو رہی تھی مگر پنڈت کی آنکھوں کے آگے اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اُسے بن گنگا کی لہروں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ وہ اور تیزی سے رینگنے لگا۔ اُسے سمرتی کی آواز سنائی دی۔ "مجھے میرا خدا بچائے گا۔ تیرے بت تباہ ہوں گے" — اُسے اپنی آواز سنائی دی "عورت ماں، بہن، بیٹی اور بیوی ہو سکتی ہے۔ اُسے کوئی اور روپ دے کر اس کے قریب جاؤ گے تو جل جاؤ گے۔ انجام بہت برا ہو گا" — وہ مندر میں یہی رٹ لگائے رکھتا تھا مگر اس نے خود ہی پاپ کیا کہ سمرتی کو وہ روپ دیا جو نہ ماں کا تھا، نہ بہن کا، بیٹی کا نہ بیوی کا۔

اُس کا خون بہہ رہا تھا۔ جسم خالی ہو رہا تھا اور گناہ اُسے ڈس رہا تھا۔ وہ بن گنگا کے کنارے اُس مقام تک رینگتا ہوا پہنچ گیا جہاں پاٹ تنگ تھا اور پانی باہر بھی آ جایا کرتا تھا۔ اُس پر غشی طاری ہو گئی۔ اُس نے بے ہوش ہوتے ہوئے کہا — "میں پیاسا ہوں... میں پاپ کا پیاسا تھا" — بن گنگا کی ایک لہر کنارہ پھلانگ کر آئی اور بے ہوش پنڈت کو اپنے ساتھ لے گئی۔

نگرکوٹ کے بُت اُس ترنگی کی راہ دیکھتے رہے جس کے خون سے اُن کے پاؤں دُھلنے تھے۔ مندر اپنے مہارشی پنڈت رادھا کشن کی راہ دیکھتا رہا ـــ برہمن پال کی ماں اُن کے انتظار میں باؤلی ہوتی رہی۔ دن کے پچھلے پہر پنڈت اور سمرتی کی تلاش کو گئے ہوئے لوگ واپس آ گئے۔ انہوں نے اُس راستے پر خون ہی خون دیکھا جو راستہ بن گنگا کو جاتا تھا۔ اُس خون سے کئی کہانیاں بنیں۔ قیاس کے بہت گھوڑے دوڑائے گئے مگر کوئی گھوڑا پنڈت اور نگرکوٹ کی سمرتی تک نہ پہنچ سکا ـــــ ہندوؤں کی متحدہ افواج کے سیناپتی برہمن پال کی ماں دیوی دیوتاؤں کے قہر سے ڈرنے لگی۔

قہر تو سلطان محمود غزنوی پر نازل ہو رہا تھا۔ ہندوستان کی اتنی زیادہ فوج کو وہ تصور میں بھی نہیں لا سکتا تھا۔ یہ افواج جس انداز سے آئی تھیں اس سے اُن کے کئی راز معلوم ہو گئے تھے۔ یہ راز سلطان محمود تک پہنچا دیئے گئے تھے۔ سلطان انہی سے فائدہ اٹھانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ مؤرخوں نے جن میں سے ایک انگریز مؤرخ وی۔ اے۔ سمتھ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے، ہندوستان کے اس لشکر کی ان خامیوں کا جائزہ تفصیل سے لیا ہے۔
ایک یہ کہ اس کی متحدہ ہائی کمانڈ ایک آدمی کے تحت تھی اور یہ آدمی ہر ایک فوج کی فنی اور نفسیاتی کیفیت سے ناواقف تھا۔ دوسرے یہ کہ ہائی کمانڈ پر افواج کے کمانڈروں کو اعتراض تھا اس لیے باہمی تعاون ناقص تھا۔ تیسرے یہ کہ فوج میں ہزارہا شہری صرف اس لیے شامل کر لیے گئے تھے کہ اُن میں لڑنے کا جذبہ تھا بلکہ وہ اسلام کے خلاف جذباتی تھے مگر انہوں نے میدانِ جنگ کبھی دیکھا نہیں تھا اور چوتھے یہ کہ ہندوؤں کو اپنی تعداد اور ساز و سامان پر بھروسہ تھا۔

ہندو لشکر کے مورال کو تقویت وہ بُت اور مورتیاں دیتی تھیں جنہیں پنڈت فوج کے ساتھ رکھتے اور عبادت اور دُعا میں مصروف رہتے تھے۔ مسلمانوں نے یہ مشاہدہ کیا تھا کہ شکست کی صورت میں سب سے پہلے یہ پنڈت بُتوں اور مورتیوں کو پھینک کر بھاگا کرتے تھے۔ اس کے مقابلے میں سلطان کو دو رکعت نفل پر بھروسہ تھا جو وہ ہر لڑائی سے

پہلے میدانِ جنگ میں پڑھا کرتا تھا۔ اُسے اپنی عسکری فہم و فراست پر بھروسہ تھا، اور اُسے اپنے اس عقیدے پر بھی بھروسہ تھا کہ وہ اللہ کی خوشنودی کے لیے اللہ کی راہ میں لڑتا ہے اور یہ جنگ اُس کے ذاتی مفاد کے لیے نہیں۔ اب بھی اُس نے اپنے سامنے ہندو لشکر کے پہاڑ دیکھے تو اُس نے اپنے سالاروں اور نائب سالاروں کو آخری ہدایات دے کر کہا ـــ "بدر میں رسولِ اکرم صلعم نے تین گنا قوی دشمن کو شکست دی تھی۔ ہمیں اس روایت کو زندہ کرنا ہے۔ میں اپنی فوج سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھوڑے پر سوار اپنی فوج سے خطاب کر رہا تھا ـــ "میں تمہیں اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں کروں گا کہ فتح تمہاری ہے۔ صرف یہ کہوں گا کہ خدا تمہارا ہے بشرطیکہ تم خدا کے ساتھ رہو اور دل میں یہ ایمان تازہ رکھو کہ اسلام کی پاسبانی کریں گے اور اپنے سچے مذہب کے کسی دشمن کو زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ تمہارے سامنے کفر کے پہاڑ کھڑے ہیں۔ اگر تم نے اپنے عقیدے کی بجائے اپنی جان کو عزیز سمجھا تو تمہارے لیے تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہمیں ان پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرنا ہے۔ اپنی اور اپنے دشمن کی تعداد کو بھول جاؤ۔ جنگ جذبے سے لڑی جاتی ہے۔ خدا تمہارے ساتھ ہے۔ خدا اُسے فتح دیتا ہے جو اُس کا نام روشن کرنے کے لیے فتح کا عزم لے کر لڑتا ہے۔"

سلطان محمود غزنوی فوج کے دو حصوں کو اپنی کمان میں دریائے سندھ کے پنجاب والے کنارے پر لے گیا اور حضرو کے قریب خیمہ زن ہوا۔ اُس نے دیدبانوں کی آنکھوں سے بھی ہندو لشکر کو دیکھا اور اپنی آنکھوں سے بھی۔ اُس نے اپنے سالاروں سے کہا کہ اب ہندو لڑنے کا جذبہ اور فتح کا عزم لے کر آئے ہیں۔ ہمیں بہت محتاط ہو کر لڑنا پڑے گا۔ اُس نے اپنے پلان میں رد و بدل کیا اور چند ایک چھاپہ مار جیش دریا کے کنارے پر دور دور پھیلا دیئے۔ وہ پشاور اور غزنی کے دفاع کے لیے دریا کا پورا پورا استعمال کرنے کی سوچ چکا تھا۔

اُس نے دوسرا اقدام یہ کیا کہ اپنی خیمہ گاہ کے ارد گرد خندق کھدوا دی۔ اُس نے مورچہ بند ہو کر لڑنا زیادہ موزوں سمجھا۔ وہ کچھ اور انتظام بھی سوچ رہا تھا لیکن مزید

تاہم اُس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی تھی کیونکہ دشمن کے لشکر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ابھی کمک ہندوستان سے دستے آ رہے تھے۔

سلطان سمجھ گیا کہ دشمن کی افواج ابھی منظم نہیں ہوئیں۔ انہیں ابھی حملے کی ترتیب میں آنا تھا۔ سلطان نے اللہ کے بھروسے اپنی عقل سے کام لیتے ہوئے ایک روز علی الصبح، نماز کے فوراً بعد ایک ہزار گھوڑ سوار تیر انداز جو گھوم پھر کر تیر اندازی کرنے کا تجربہ رکھتے تھے، دشمن پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دیئے۔ اس صورت حال میں اُس نے پہل کاری بہتر سمجھی اور جنگ کی ابتدا کر دی۔

تاریخ ۲۹ ربیع الثانی ۳۹۹ ہجری بمطابق ۳۱ دسمبر ۱۰۰۸ء عیسوی تھی۔ مشہور مؤرخ گردیزی نے اس معرکے کا آنکھوں دیکھا حال یوں لکھا ہے کہ ایک ہزار تیر اندازوں سے حملہ کرا کے محمود غزنوی نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ اُس کے چلّان کو دشمن نے یوں پرے پھینک دیا جیسے کوئی بے کار چیز کوڑے کرکٹ میں پھینک دی جاتی ہے۔ دشمن کی طرف سے تیس ہزار گکھڑوں نے ایک ہزار تیر اندازوں پر ہلّہ بول دیا۔ گکھڑ ایک لادین قبیلہ تمام ہندوؤں کا حامی تھا بلکہ یہ قبیلہ اپنے آپ کو ہندوؤں کی نسل سے سمجھتا تھا۔ یہ لوگ جنگجو تھے۔ موسم کیسا ہی ہو، میدانِ جنگ پتھریلا ہو، چٹیل ہو، ریگزار ہو، ہموار ہو یا اونچا نیچا، گکھڑ ننگے پاؤں اور ننگے سر لڑا کرتے تھے۔

انہوں نے تیر انداز سواروں پر ایسا شدید ہلّہ بولا کہ ایک ہزار گھوڑوں اور ایک ہزار سواروں کا کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ کہاں غائب ہو گئے ہیں۔ گکھڑ ان کا قتل عام کر رہے تھے۔ گکھڑوں نے اپنا بڑھاؤ رکا نہیں، وہ نعرے لگاتے اور چیختے چنگھاڑتے سلطان محمود کے کیمپ میں داخل ہو گئے۔ کیمپ کے اردگرد خندق تھی۔ دو طرف آنے جانے کا راستہ تھا۔ گکھڑ ان راستوں سے سیلاب کی طرح اندر چلے گئے۔ سلطان محمود اس صورتحال کے لیے تیار نہیں تھا۔ گکھڑوں کی یہ دلیرانہ یلغار غیر متوقع تھی لیکن احمقانہ بھی۔ بے شک اُن کی تعداد تیس ہزار تھی لیکن وہ ایسے کیمپ کے اندر آ گئے تھے جو خندق سے گھرا ہوا تھا۔

محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ چند منٹوں میں گکھڑوں کے ہاتھوں پانچ ہزار مسلمان شہید ہو گئے۔

زخمی لاتعداد تھے۔ کیمپ میں خونریز معرکہ لڑا جا رہا تھا۔ خندق نے گکھڑوں کے لیے پسپائی ناممکن بنا دی تھی۔ خطرہ یہ تھا کہ دشمن مزید تعداد سے حملہ کرے گا اور ایک گھنٹے کے اندر جنگ کا فیصلہ دشمن کے حق میں ہو جائے گا۔ سلطان کیمپ میں پھنس گیا تھا۔ اور وہ سپاہیوں کی طرح لڑ رہا تھا۔ اُس نے اپنے ٹروپس کو جس طرح ڈسپلن کر رکھا تھا، اُسے اس کا ثمر ملنے لگا۔ وہ اس طرح کہ مشہور سالار عبداللہ الطائی چھ ہزار عربی نسل کے گھوڑوں کو تیار رکھے ہوئے تھا جو اُس نے گکھڑوں کے خلاف استعمال نہ کیے۔

کچھ دیر بعد گکھڑوں کا صفایا شروع ہو گیا۔ وہ کم بھی رہ گئے اور تھک بھی گئے تھے۔ وہ خندق میں گرتے تو مسلمان تیر اندازوں اور برچھی بازوں کا شکار ہو جاتے۔ راجہ انندپال نے یہ صورت حال دیکھی تو اُس نے نہایت اعلیٰ فیصلہ کیا۔ مسلمانوں کو سنبھلنے کا موقع نہ دینے کے لیے اُس نے حملے کا حکم دے دیا۔ مسلمانوں کے کیمپ کی کیفیت کو وہ اچھی طرح نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہاں اب گکھڑ کٹ رہے تھے اور مسلمان کاٹ رہے تھے۔ راجہ انندپال نے فتح یقینی سمجھ کر اپنے ہاتھی کو آگے رکھا، اپنا جھنڈا اور اونچا کیا اور ہلّہ بولنے کے انداز سے حملہ کر دیا۔

سلطان کے سالار عبداللہ الطائی نے چھ ہزار گھوڑ سواروں سے اُس پر پہلو سے حملہ کر دیا۔ اتنے بڑے لشکر کے سامنے چھ ہزار گھوڑ سوار کچھ بھی نہیں تھے لیکن مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر ایک معجزہ رونما ہوا۔ وہ یوں کہ راجہ انندپال کے ہاتھی کی پیشانی میں دو تین تیر اُتر گئے اور ایک تیر آنکھ میں لگا۔ یہ شاہی ہاتھی بڑا ہی طاقتور اور بدمست تھا۔ اس نے اُدھم بپا کر دیا اور اِدھر اُدھر بھاگنے دوڑنے لگا۔ اس کی چنگھاڑ سے دوسرے ہاتھی بھی بدک گئے۔ راجہ انندپال کا پرچم گر پڑا اور اُس کے ہاتھی نے پیچھے مڑ کر حملے کی صفوں میں قیامت بپا کر دی۔ دوسرے ہاتھی بھی اس کی چنگھاڑ سے ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ انندپال کی فوج یہ سمجھ کر کہ آگے سے مسلمانوں نے حملہ کر دیا ہے، پیچھے کو دوڑی اور اُسے پیچھے کو بھاگتے دیکھ کر دوسری ریاستوں کی فوجیں حکم اور ڈسپلن کی زنجیر توڑ کر پسپا ہونے لگیں۔

متحدہ اعلیٰ کمان بیکار ہو گئی۔ ہندو لشکر کی بے دلی کی ایک وجہ موسم بھی تھا۔ یہ ۳۱ دسمبر

کا امکان تھا جب قریبی پہاڑیوں پر برفباری شروع ہو چکی تھی۔ سلطان محمود اسی موسم میں لڑنے کے لیے وقت حاصل کرتا رہا تھا۔ سلطان نے دشمن میں یہ بھگدڑ دیکھی تو اُس نے کھلے حملے اور تعاقب کا حکم دے دیا۔ عبداللہ الطائی نے اپنے چھ ہزار گھوڑسواروں سے اور سپہ سالار ارسلان جاذب نے دس ہزار سواروں اور پیادوں سے جن میں ترک، افغان اور خلجی تھے مل کر حملہ کر دیا۔ دشمن اب لڑ نہیں رہا تھا، بھاگ رہا تھا۔

فرشتہ کے مطابق پسپائی میں دشمن کے بیس ہزار فوجی ہلاک ہو گئے جنہوں نے ہتھیار ڈال کر قید قبول کر لی، ان کی تعداد بے حساب تھی۔ اس سے پہلے سلطان محمود نے کبھی تعاقب نہیں کیا تھا۔ اُس نے دریائے سندھ کے دوسرے کنارے سے بھی فوج بُلالی اور دشمن کا تعاقب نہ چھوڑا۔

راستے میں اسے بتایا گیا کہ نگرکوٹ کا مندر ہندو راجوں مہاراجوں کا جنگی مرکز بنا ہوا ہے جو ایک قلعے میں ہے۔ سلطان نے اُدھر کا رُخ کر لیا۔ نگرکوٹ کو راجہ انند پال کی یا کالنجر کی فوج بچا سکتی تھی مگر دونوں فوجیں بُری طرح تتر بتر ہو گئی تھیں۔ سلطان نے نگرکوٹ کا محاصرہ کیا تو قلعے کی دیواروں سے تیر برسنے لگے۔ قلعہ پہاڑی پر تھا اس لیے حملہ آوروں کی کامیابی محال تھی۔ تاہم تین دنوں کے محاصرے اور دروازے پر تابڑ توڑ حملوں سے محصورین نے ہتھیار ڈال دیئے۔

سلطان محمود مندر میں گیا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ بُتوں اور مورتیوں کو پہاڑی کے اوپر سے نیچے گرایا۔ مندر سے بے بہا زر و جواہرات برآمد ہوئے۔ سات کروڑ سونے کے سکے تھے۔ سونا منوں کے حساب سے تھا۔ چاندی کئی سو من تھی۔ ہیرے جواہرات بھی منوں کے حساب سے تھے۔ یہ وہ خزانہ تھا جو ہندوؤں نے سلطان محمود غزنوی کو شکست دے کر غزنی کو مہا بھارت میں شامل کرنے کے لیے جمع کر رکھا تھا۔

سلطان نے حضرو سے نگرکوٹ تک کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ راجہ انند پال اس کے چند دن بعد مر گیا۔

سلطان محمود غزنوی ہندوستان میں رہ کر اسلامی سلطنت کو منظم اور مستحکم کرنا چاہتا

تھا مگر اُسے غزنی سے اطلاع ملی کہ غور کے علاقے میں محمد نام کے ایک افغان نے دس ہزار فوج کے ساتھ اپنا کیمپ بنا لیا ہے اور غوری اُس کے ساتھ شامل ہو رہے ہیں۔ یہ ایک اور خانہ جنگی کی ابتدا تھی۔ سلطان محمود کو ۱۰۰۹ء (۴۰۰ھ) میں غزنی جانا پڑا اور اُسے ایک اور خانہ جنگی لڑنی پڑی۔

معرکہ انسان اور ابلیس کا

نگرکوٹ

کے بُت توڑنے کے بعد سلطان محمود غزنوی غزنی کو جا رہا تھا کیونکہ اُس کی غیر حاضری میں غوریوں نے غزنی کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ یہ سلطان محمود کی بہت بڑی بدنصیبی تھی کہ وہ ہندوستان میں آتا تھا تو پیچھے کوئی نہ کوئی مسلمان حکمران غزنی پر چڑھ دوڑتا تھا۔ اُسے غزنی کو بچانے کے لیے واپس جانا پڑتا تھا، اس لیے وہ ہندوستان میں کسی بھی وقت آرام سے بیٹھ کر یہاں کے امور کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ متعصب تاریخ دانوں نے اُس کی اس مجبوری پر پردہ ڈال کر اُس پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ وہ لُوٹ مار کے لیے آتا تھا اور وہ بُت اس لیے توڑتا تھا کہ بتوں کے اندر زر و جواہرات بھرے ہوتے تھے اور وہ لُوٹ مار کر کے غزنی چلا جاتا تھا۔

اب کے وہ اس عزم کے ساتھ آیا تھا کہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے فوجی اتحاد کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے گا اور کسی بڑے مندر میں کوئی بُت سلامت نہیں رہنے دے گا۔ چنانچہ اُس نے تھنیسر کے مقام پر ہندوستان کی متحدہ فوجی طاقت کو بکھیرا اور نگرکوٹ تک جا پہنچا جہاں کا مندر سارے ملک میں مشہور تھا۔

اُس نے نگرکوٹ کو فتح کیا ہی تھا کہ اُسے غزنی سے بلاوا آ گیا کہ دس ہزار غوریوں نے غزنی کے قریب خیمے گاڑ کر ارد گرد خندق کھود لی ہے۔

سلطان محمود غزنوی اپنے ساتھ دو ہزار ہندو قیدی لے جا رہا تھا لیکن یہ جنگی قیدی نہیں تھے۔ یہ اُس وقت کے رواج کے مطابق غلام تھے جو مہاراجہ انند پال نے سلطان محمود کو تحفے کے طور پر دیئے تھے۔ کچھ ہاتھی تو سلطان نے ہندو فوج سے

چھینے تھے۔ پچاس ہاتھی ہندو مہاراجوں نے پیش کیے تھے۔

وہ جتنی فوج اپنے ساتھ لایا تھا اتنی واپس نہیں لے جا رہا تھا۔ کچھ نفری یہاں ضرورت کے تحت چھوڑ چلا تھا اور بہت سی نفری ماری گئی تھی۔ اُس کی فوج کا کوئی ایک بھی سپاہی جنگی قیدی نہیں تھا کیونکہ وہ فاتح تھا، مگر اُس کے دو کمانڈر اُس کے ساتھ نہیں تھے۔ یہ دونوں زندہ تھے اور اُس فوج کے ساتھ بھی نہیں تھے جسے سلطان محمود نگرکوٹ کے دفاع اور انتظام کے لیے پیچھے چھوڑ گیا تھا۔

ان میں ایک بُغرا خان تھا اور دوسرا التگین۔ دونوں خوبرو اور تنومند جوان تھے۔ بُغرا خان پشاور اور لغمان کے درمیان کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ پشاور آتا جاتا رہتا تھا اس لیے ہندوستان کی زبان کچھ سمجھ سکتا تھا اور کچھ کچھ بول بھی سکتا تھا۔ جب سلطان محمود کی فوج نے نگرکوٹ کا قلعہ سر کر لیا اور لڑائی تقریباً ختم ہو گئی تھی، اُس وقت بُغرا خان قلعے سے باہر ایسی جگہ تھا جو پہاڑی کی چوٹی پر تھی۔ قلعہ ٹوٹتے ہی اُس کے جیش کے سپاہی قلعے کے اندر جانے کو دوڑ پڑے۔ بُغرا خان نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا غلط سمت دوڑ پڑا۔ بُغرا خان سنبھل نہ سکا۔ وہ پیچھے کو گرنے لگا اور گھوڑا اُس کے نیچے سے یوں نکل گیا جیسے بدک گیا ہو۔

بُغرا خان ایسا گرا کہ لڑھکتا ہُوا پہاڑی سے نیچے چلا گیا۔ وہ سنبھل تو گیا لیکن چوٹیں ایسی آئی تھیں کہ کوشش کے باوجود اوپر نہ جا سکا۔ وہ پیچھے چلا گیا۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا اور دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ ہندو فوج کے سپاہی اِدھر اُدھر بھاگے جا رہے تھے۔ بُغرا خان اُن سے چھپتا پھر رہا تھا۔ ہندو اُسے دیکھ لیتے تو جان سے مار جاتے۔

وہ نیم غشی کی حالت میں کسی اور ہی سمت نکل گیا۔ اُسے سمت اور وقت کا کوئی احساس نہ رہا۔ وہ کبھی بیہوش ہُوا، کبھی ہوش میں آیا اور جب بھی ہوش میں آیا، وہ اُٹھ کر چل پڑا۔ علاقہ جنگلاتی اور چٹانی تھا۔ اُسے بالکل احساس نہیں تھا کہ کتنے دن گزر گئے ہیں یا کوئی دن گزرا بھی ہے یا نہیں۔ اُسے کسی نے جھنجھوڑا تو ہڑبڑا کر بیدار ہو گیا۔ اُس کا ہاتھ عادت کے مطابق اپنی تلوار کے دستے پر پڑا اور اُس نے

تلوار نیام سے نکال لی۔ وہ اُٹھ کھڑا ہُوا تھا مگر گر پڑا۔ چوٹوں کے علاوہ وہ بھوکا اور پیاسا بھی تھا اور ایک زخم ایسا تھا جس سے خون نکل رہا تھا۔

"ہوش میں آؤ خان"۔۔۔ اُسے اپنی زبان کی آواز سنائی دی۔" میں التگین ہوں۔ یہاں کیسے آ گئے ہو؟"

بُغرا خان نے بولنے کی کوشش کی تو اُسے پتہ چلا کہ وہ بول نہیں سکتا۔ اُس کا حلق خشک تھا اور زبان پیاس سے اکڑ گئی تھی۔ اُس نے منہ کھولا تو التگین سمجھ گیا کہ وہ پیاسا ہے۔ التگین نے اپنی پیٹھ کے ساتھ بندھی ہوئی پانی کی چھاگل کھولی اور اُس کے منہ سے لگا دی ۔۔۔ بُغرا خان اُس کا گہرا دوست تھا۔

التگین بھی بُغرا خان کی طرح ایک جیش کا کمانڈر تھا۔ وہ قلعے کے محاصرے میں شامل نہیں تھا۔ اُس کے جیش کو قلعے کی پہاڑی سے دُور اُس راستے پر بھیج دیا گیا تھا جس سے ہندو فوج کی کمک یا رسد کے آنے کی توقع تھی۔ التگین کے ذمے یہ کام تھا کہ کمک کو راستے میں ہی الجھائے۔ اُس کا جیش تیر اندازوں کا تھا اور گھوم پھر کر تیر اندازی کا تربیت یافتہ تھا۔

اِس جیش کو ایک ہدف مل گیا۔ یہ ہندوستانی فوج کا ایک سوار دستہ تھا جو نگرکوٹ کی طرف نہیں جا رہا تھا بلکہ اُدھر سے آ رہا تھا۔ التگین کے تیر اندازوں نے اس سوار دستے پر تیر برسانے شروع کر دیئے مگر کچھ اور ہندوستانی پیادہ سپاہی کسی اور طرف سے گزر رہے تھے۔ انہیں مسلمان تیر انداز نظر آ گئے۔ یہ ہندوستانی سوار اور پیادے دراصل نگرکوٹ سے بھاگے جا رہے تھے۔ راستے میں التگین کے جال میں آ گئے۔ سوار اور پیادے اپنی جانیں بچانے کے لیے لڑنے لگے۔ وہ اس علاقے سے واقف تھے۔ انہوں نے مسلمان تیر اندازوں کو گھیر لیا اور تیر اندازوں کے لیے مشکل پیدا ہو گئی۔

التگین کے پاس نفری بہت کم تھی۔ یہ نفری لڑی تو بے جگری سے لیکن کچھ ماری گئی کچھ بکھر گئی۔ ہندوستانی سوار اور پیادے جو بچ گئے تھے، وہ نکل گئے

اور التگین اکیلا رہ گیا۔ وہ اپنے جیش کو ڈھونڈنے لگا۔ اس تلاش میں جنگل اور چٹانوں میں بھٹک گیا۔

وہ بھٹکتا رہا۔ دن گزرا۔ رات گزری۔ اگلا دن اور رات بھی گزر گئی اور وہ اُس جگہ جا پہنچا جہاں بُغرا خان پڑا تھا۔ بُغرا خان کو اُس نے پانی پلایا تو وہ پوری طرح ہوش میں آ گیا۔ التگین نے اُس کے منہ میں کھانے کے لیے کچھ ڈالا۔

سورج غروب ہو گیا۔ بُغرا خان کے جسم میں کھانے اور پانی سے جان آ گئی تھی مگر وہ چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

صبح طلوع ہوئی تو التگین کہیں سے مدد لانے کے لیے یا نگرکوٹ کا راستہ اور سمت معلوم کرنے کے لیے کسی مقامی آدمی یا کسی گاؤں کی تلاش میں نکل کھڑا ہُوا۔ اُسے بُغرا خان نے بتا دیا تھا کہ قلعہ سر ہو چکا ہے۔ التگین کو اس خبر نے حوصلہ دیا۔ اُس کے دل سے یہ ڈر نکل گیا کہ وہ ہندوستانی فوج کے ہاتھ چڑھ جائے گا۔ چنانچہ وہ نڈر ہو کر چلا جا رہا تھا۔ بہت دیر کی تلاش کے بعد اُسے چھوٹا سا ایک گاؤں نظر آ گیا۔ وہ اُدھر کو چل پڑا۔

جب گاؤں کے قریب پہنچا تو عورتیں اور بچے اُسے دیکھ کر گھروں کو بھاگ گئے۔ اب یہ علاقہ مسلمانوں کا محکوم تھا۔ گاؤں والوں کو پتہ چل چکا تھا کہ نگرکوٹ کے قلعے پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا ہے اور مسلمان بُت توڑ چکے ہیں۔ التگین کو دیکھ کر کچھ آدمی باہر آ گئے۔ وہ غریب سے دیہاتی تھے۔ یہ دیکھ کر کہ یہ مسلمان فوجی ہے، وہ غلاموں کی طرح دوڑے آئے اور ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ التگین نے چار آدمی ساتھ لیے اور بُغرا خان تک پہنچا۔ اُس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اُس نے ٹوٹی پھوٹی زبان میں ان آدمیوں سے پوچھا کہ نگرکوٹ کا قلعہ کتنی دُور ہے۔ انہوں نے بتایا کہ بہت دُور ہے اور پہاڑی پر ہونے کی وجہ سے فاصلہ زیادہ لمبا اور تکلیف دہ ہے۔

گاؤں کے ان آدمیوں میں سے ایک نے انہیں خوش کرنے کے لیے کہا کہ بغراخان کو گاؤں میں لے چلیں اور ذرا بہتر ہو جائے تو اسے قلعے میں پہنچا دیں گے۔ بغراخان نے التگین کو اپنی زبان میں بتایا کہ ان لوگوں نے کیا مشورہ دیا ہے۔

ان لوگوں نے یہ بھی کہا تھا کہ گاؤں میں زخموں اور چوٹوں کا علاج اور دودھ اور شہد بھی ہے۔ التگین ایسا خطرہ مول لینے کے حق میں نہیں تھا لیکن بغراخان ناقابلِ برداشت تکلیف میں تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ گاؤں کے لوگ اُن کے محکوم تو ہو گئے ہیں لیکن وہ آخر دشمن ہیں اور ہلاک کر سکتے ہیں، اس نے التگین سے کہا کہ وہ پہلے گاؤں میں چلے۔ قلعے تک پہنچتے شاید وہ زندہ نہ رہے۔

التگین اپنے دشمن کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ذہین آدمی تھا لیکن بغراخان کے ساتھ اُس کی دوستی ایسی گہری اور جذباتی تھی کہ وہ خطروں کو بھول کر جذبات میں آ گیا۔ اُس نے گاؤں والوں سے کہا کہ بغراخان کو اٹھا کر گاؤں میں لے چلیں۔

التگین جب ان آدمیوں کو گاؤں سے لے گیا تھا تو تین آدمیوں نے ایک درخت تلے کھڑے ہو کر کھسر پھسر شروع کر دی تھی۔ ان میں سے ایک پنڈت تھا اور دوسرے دو فوجی تھے لیکن سپاہی نہیں تھے۔ بڑے عہدے کے افسر معلوم ہوتے تھے۔ یہ تینوں نگرکوٹ سے بھاگے تھے۔ پنڈت اسی مندر میں ہوا کرتا تھا۔ فوجی عہدیداروں کو وہاں سے چلے جانا چاہیے تھا کیونکہ ان کی فوج کچھ ماری گئی اور کچھ کٹ گئی تھی اور ان کے راجہ نے بہت سے سپاہی سلطان محمود کو غلاموں کے طور دے دیے تھے۔ یہ دونوں عہدیدار اکٹھے اس گاؤں میں آئے تھے۔ پنڈت پہلے ہی آ چکا تھا۔ ان تینوں کو گاؤں والوں نے چھپا لیا تھا۔ تینوں بھڑکے ہوئے تھے اور شکست نے انہیں جذباتی بنا دیا تھا۔ انہیں اس گاؤں سے بھی بھاگ جانا چاہیے تھا۔

"اگر میں تمہاری طرح سپاہی ہوتا تو یوں میدان سے بھاگ کر یہاں نہ آ چھپتا"۔۔۔ پنڈت نے اپنے فوجی عہدیداروں سے کہا۔۔۔ "تمہاری رگوں میں راجپوت باپ کا خون معلوم نہیں ہوتا۔۔۔۔ اگر تم دیکھ لیتے کہ ان ملیچھوں کے گھوڑے مندر میں کس طرح داخل ہوئے تھے، اگر تم دیکھ لیتے کہ کرشن مراری کو انہوں نے کس طرح گھسیٹا اور پہاڑی کے اوپر

سے نیچے پھینکا تھا، انہوں نے مورتیاں اور بھگوت گیتا باہر پھینکی اور میں نے مسلمانوں کو ان کے اوپر چلتے پھرتے دیکھا۔ تم نے اذان نہیں سنی جو ایک مسلمان سپاہی نے مندر کے اوپر کھڑے ہو کر دی تھی۔۔۔۔ تم نے سنی ہو گی۔ تم نے اپنے مذہب کو، اپنی مذہبی کتابوں کو مسلمانوں کے پاؤں تلے دیکھا ہو گا۔ تم راجپوت ہوتے تو وہیں مر جاتے، یہاں نہ آتے۔ تمہیں اپنی جانیں زیادہ پیاری ہیں"۔

"نہیں مہاراج!"۔۔۔ ایک عہدیدار نے ہاتھ پنڈت کے گھٹنے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔۔۔ "ہم بزدل نہیں"۔

"ہاتھ پیچھے رکھو"۔ پنڈت نے نفرت سے کہا۔۔۔ "تم بھی ملیچھ ہو۔ جو سپاہی اپنے دھرم پر مرنا نہیں جانتا اُسے بستی میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ تمہارا حق صرف یہ ہے کہ جنگلوں میں دھکیل دیے جاؤ اور جانوروں کی طرح زندگی بسر کرو۔ تم نہیں جانتے کہ میں ان تین کنواری کنیاؤں کو وہاں سے کس طرح نکال کر لایا ہوں۔ اُن کے چہروں اور ہاتھوں پر سیاہی ملی۔ انہیں مردوں کے کپڑے پہنائے اور نکال لایا۔۔۔ اور وہ جو مندر میں رہ گئی ہیں، اُن کے انجام سے تم واقف ہو گے"۔

"ہم انتقام لیں گے مہاراج!"۔۔۔ دوسرے عہدیدار نے کہا۔

"اگر تم میں اتنی غیرت ہوتی تو تمہاری لاشیں مندر سے اٹھائی جاتیں"۔۔۔ پنڈت نے کہا۔۔۔ "اور تمہاری آتمائیں آکاش پر ہوتیں مگر تم اپنے ملیچھ شریر چھپاتے پھر رہے ہو۔۔۔۔ اب غزنی کا یہ سلطان دیش کے دوسرے مندروں کا بھی یہی حال کرے گا۔ آج نگرکوٹ کی اینٹ سے اینٹ بجی، کل تھانیسر کی باری ہے۔ تم جانتے ہو تھانیسر ہمارے لیے اتنا ہی مقدس ہے جتنا مسلمانوں کے لیے مکہ اور مدینہ۔ کاش، آج میرے اس بوڑھے جسم میں جوانی آ جائے اور میں غزنی کے سلطان کو قتل کر دوں"۔

"اسی کام کے لیے ہم یہاں رکے ہوئے ہیں مہاراج!"۔۔۔ ایک عہدیدار نے کہا۔۔۔ "ہم چھپے ہوئے نہیں، رکے ہوئے ہیں۔ ہم سپاہی نہیں عہدیدار ہیں۔ جو تم سمجھتے ہیں وہ سپاہی نہیں سمجھ سکتے اور جو غیرت ہم میں ہے وہ کسی بھی راجے، کسی بھی مہاراجے اور کسی بھی راجے میں نہیں"۔

"جانتے ہو کیوں؟" — پنڈت نے کہا — "انہیں راج پیارا ہے۔ انہیں مندر سے نہیں محل سے پیار ہے۔ جس کے دل میں راج محل کا پیار ہو جاتا ہے، اُس کے دل سے مندر کی محبت نکل جاتی ہے ... سلطان محمود ایک آدمی ہے۔ ایک انسان ہے۔ اوتار نہیں، لیکن اس ایک انسان نے ہندو راشٹر کو اپنے پاؤں تلے دبا لیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس ایک انسان کو ختم کر دیا جائے تو اس کی ساری فوج ہمارے قدموں میں بیٹھ جائے گی۔"

"مگر اس ایک آدمی کو ختم کرنا آسان نہیں" — ایک عہدیدار نے کہا —

"آپ کو معلوم نہیں، میں درویشوں کے بھیس میں اُدھر گیا تھا۔ قلعے کے اندر بھی گیا تھا۔ مجھے کئی جگہ روکا گیا۔ مجھے اچھی طرح دیکھا گیا۔ میں نے ہر جگہ کہا کہ میں تارک الدنیا درویش ہوں، صوفی ہوں اور سلطان کو مبارک دینے آیا ہوں مگر مجھے بہت ہی منت سماجت کے بعد سلطان کے محافظوں کے کمانڈر تک جانے دیا گیا۔ کمانڈر نے میری تلاشی لی اور میرے چغے کے اندر کمر کے ساتھ بندھا ہوا خنجر نکال کر کہا کہ درویش کو ہتھیار سے کیا کام! میں نے کہا کہ جس مذہب کا سلطان اتنی دور سے بت توڑنے کے لیے آیا ہے، اُس مذہب کے کسی پیروکار کو خالی ہاتھ نہیں رہنا چاہیے۔ میں مسلمان ہوں اور ہتھیار مسلمان کا زیور ہے .... اُس نے مجھ سے خنجر لے لیا اور مجھے دربان کے حوالے کر دیا۔ میں نے بڑی غور سے دیکھا کہ غزنی کے سلطان تک پہنچنا ہی آسان نہیں، اُسے قتل کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ یہاں وہ ہر کسی کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ میں مایوس ہو کر واپس آ گیا۔"

"ہم ابھی یہیں رہیں گے" — دوسرے عہدیدار نے کہا — "ہم انتظار کر رہے ہیں کہ سلطان باہر نکلنا شروع کرے گا تو کیا اُسے تیر سے یا قریب جا کر خنجر سے قتل کیا جا سکتا ہے، ہم اپنی جانیں نہیں بچائیں گے مہاراج! اگر ہم دو آدمی اپنی جانیں قربان کر دیں تو ...."

"تو تم اگلے جنم میں اس دیش کے مہاراجے ہو گے" — پنڈت نے کہا — "برہمن اور راجپوت بھی تمہارے قدموں میں ماتھے رگڑیں گے" — پنڈت نے

رازداری سے کہا — "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اس ایک آدمی کو کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے۔ میرے ساتھ یہ جو تین لڑکیاں ہیں، ان کا حسن دیکھو۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ تحفے کے طور پر سلطان کو کس طرح پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ اُسے زہر دے سکتی ہیں۔"

"ناممکن ہے" — ایک عہدیدار نے کہا — "ہمیں بتایا گیا ہے کہ یہ سلطان پتھر دل ہے۔ عورت اور شراب کی بُو سے بھی نفرت کرتا ہے۔ اسی لیے اس کی فوج جس علاقے کو فتح کرتی ہے، وہاں کسی عورت کی بے عزتی نہیں ہوتی۔ عورت کے جال میں سلطان محمود کو لانا ممکن نہیں۔ کوئی اور طریقہ سوچیں۔"

"ہمارے سارے راجوں کو عورت اور شراب نے مارا ہے" — پنڈت نے کہا — "مسلمانوں کی فتح کا سبب یہی ہے کہ ان دونوں سے دل نہیں لگاتے ... پھر بھی کچھ سوچنا پڑے گا، کچھ کرنا پڑے گا۔ میں راتوں کو سو نہیں سکتا۔ میں نے جس کرشن بھگوان کی دن رات پوجا پاٹ کی ہے، اس کی توہین میری آنکھوں کے سامنے ہوئی ہے۔ اس دیش پر قہر نہ پڑا تو مجھ پر پڑے گا، تم پر پڑے گا۔"

نگرکوٹ کو فتح ہوئے سات آٹھ دن گزر گئے تھے۔ یہ تینوں مندر کی پہاڑی سے دور پیچھے ایک گاؤں میں چھپے ہوئے تھے۔ دونوں عہدیدار بھیس بدل کر دو دو بار اوپر گئے تھے مگر سلطان محمود کے قتل کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تھی۔ پھر بھی وہ مایوس نہیں تھے۔ پنڈت کی باتیں انہیں مایوس نہیں ہونے دیتی تھیں۔ وہ اب اس امید پر بیٹھے تھے کہ سلطان محمود اس علاقے کی سیر کے لیے باہر نکلے گا۔ انہوں نے دو کمانیں اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ یہ گھنا جنگل تھا اور درختوں میں ڈھکی ہوئی اونچی نیچی چٹانیں بھی تھیں، کہیں سے بھی چھپ کر تیر چلایا اور غائب ہوا جا سکتا تھا۔

اتنے میں انگیس گاؤں میں چلا گیا اور وہاں سے چار آدمی لے آیا۔ دونوں عہدیداروں نے اسے دیکھا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ غزنی کا یہ فوجی ان آدمیوں کو کسی بیگار کے لیے لے گیا ہے۔

کچھ دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ گاؤں کے آدمی واپس آرہے تھے۔ ان کے ساتھ التگین تھا اور گاؤں کے ایک آدمی نے کسی کو پیٹھ پر اٹھا رکھا تھا۔ عہدیداروں نے التگین کو پہچان لیا اور وہ چھپ گئے۔ التگین جب ان آدمیوں کے ساتھ گاؤں میں پہنچا تو گاؤں کے دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ بغرا خان کو چارپائی پر ڈال دیا گیا اور دو بوڑھے اس کے زخم اور چوٹیں دیکھنے لگے۔ انہوں نے فوراً اس کا علاج شروع کر دیا۔

التگین کے کہنے پر بغرا خان نے ان بوڑھوں سے کہا۔ "اگر گاؤں میں ہمارے ساتھ کسی نے کوئی گڑبڑ کی تو سارے گاؤں کو آگ لگا دی جائے گی اور بوڑھے سے بچے تک کو زندہ جلا دیا جائے گا۔"

"آپ ہمارے بادشاہ ہیں" ——— ایک بوڑھے نے کہا۔ "سارا گاؤں آپ کی حاضری میں کھڑا رہے گا۔ گڑبڑ کی جرأت کون کر سکتا ہے ..... ہم نے اس سے زیادہ گہرے زخموں اور زیادہ خطرناک چوٹوں کا علاج چند دنوں میں کیا ہے۔ آپ پانچ چھ دنوں تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

التگین اور بغرا خان کے لیے ایک جھونپڑا خالی کر کے اسے صاف کیا گیا۔ ان لوگوں کے پاس جو صاف ستھرے بستر تھے، وہ انہوں نے بچھا دیئے۔ رات غزنی کے دونوں کماندار اس جھونپڑے میں سوئے ہوئے تھے۔ التگین نے بغرا خان سے کہا تھا کہ وہ ان لوگوں کی راہنمائی میں قلعے میں جا کر اپنی اور اس کی اطلاع کرا آتا ہے لیکن بغرا خان نے اس خطرے کا اظہار کیا کہ وہ اکیلا رہ گیا تو یہ لوگ اسے غائب کر سکتے ہیں یا زخموں میں زہریلی دوائی ڈال کر خراب بھی کر سکتے ہیں۔

وہ دونوں تو سو گئے تھے۔ تھکن سے ان کے جسم ٹوٹے ہوئے تھے۔ ان سے تھوڑی ہی دور ایک اور جھونپڑے میں پنڈت، دونوں ہندو عہدیدار اور دونوں بوڑھے جنہوں نے بغرا خان کی مرہم پٹی کی تھی، اکٹھے بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ پنڈت کہہ رہا تھا ——— "انہیں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے پاس طریقے موجود ہیں جن سے ایک بزدل انسان کو درندہ اور درندے کو بزدل بنایا جا سکتا ہے۔ سلطان کو اس کے اپنے آدمیوں کے ہاتھوں سے قتل کرایا جائے تو زیادہ

بہتر ہے" ——— ایک عہدیدار نے کہا۔ "ہم دیکھ چکے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا۔"

"تم دونوں سن لو" — پنڈت نے دونوں بوڑھوں سے کہا۔ "اس مسلمان کے زخم اور چوٹیں اتنی جلدی ٹھیک نہ ہونے دینا۔ مجھے ابھی گھوڑا دو۔ میں تھانیسر جا رہا ہوں۔ گھوڑا ایسا دو جو مجھے بہت تیز لے جائے اور بہت تیز لائے" ——— دونوں بوڑھے چلے گئے تو اس نے عہدیداروں سے کہا۔ "میں تینوں لڑکیوں کو تمہارے سپرد کر چلا ہوں۔ میں انہیں اچھی طرح سمجھا دوں گا۔"

انہوں نے تینوں لڑکیوں کو وہیں بلا لیا اور پنڈت انہیں بتانے لگا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ اتنے میں گھوڑا تیار ہو گیا۔ پنڈت گھوڑے پر سوار ہوا اور روانہ ہو گیا۔

صبح سویرے التگین کی آنکھ کھلی تو دیکھا کہ بغرا خان درد سے آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ التگین بوڑھے کو بلانے کے لیے باہر نکلا تو دو جوان لڑکیاں دروازے پر کھڑی تھیں۔ التگین کو دیکھ کر مسکرائیں۔ التگین ان کے حسن اور ان کی مسکراہٹوں سے جیسے مسحور ہو گیا ہو۔ ایک لڑکی نے اسے کچھ کہا تو وہ خاموش کھڑا رہا۔ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔ لڑکیاں اندر چلی گئیں جہاں بغرا خان پڑا کراہ رہا تھا۔

"بہت تکلیف ہے؟" ——— ایک لڑکی نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

دوسری نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بغرا خان کی تو جیسے زبان بند ہو گئی ہو۔ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔

"یہ دونوں ہماری زبان نہیں سمجھتے" — ایک لڑکی نے دوسری سے کہا۔

"میں سمجھتا ہوں" — بغرا خان نے کہا۔ "میں تمہیں دیکھ کر اس لیے چپ ہو گیا تھا کہ اس جنگل میں تم جیسی لڑکیاں کہاں سے آگئی ہیں! ..... تم اس گاؤں کی رہنے والی معلوم نہیں ہوتیں۔"

"ہم اسی جنگل میں پیدا ہوئی ہیں" ——— ایک لڑکی نے کہا۔ "یہاں کوئی روگی، کوئی دکھی انسان آجائے تو ہم اس کا درد چوس لیا کرتی ہیں ..... میں نے پوچھا تھا کہ بہت تکلیف میں ہو؟"

"درد زیادہ ہے" ـــــ طغرل خان نے جواب دیا اور اُس نے اس لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا جس نے اُس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

"ٹھیک ہو جائے گا" ـــــ لڑکی نے کہا۔ "میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لائی ہوں۔"

دونوں لڑکیاں باہر نکل گئیں۔

وہ واپس آئیں تو تین تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں منہ ہاتھ دھلانے کے لیے پانی تھا اور باقی دو نے کھانے پینے کا سامان اُٹھا رکھا تھا۔ اس میں دودھ تھا جس میں شہد ملا ہوا تھا۔ لڑکی نے دونوں کے منہ ہاتھ دُھلائے۔ انہوں نے دودھ پی لیا اور میوے وغیرہ کھا لیے۔ لڑکیاں خالی برتن لے گئیں تو ذرا دیر بعد طغرل خان نے قہقہہ لگایا۔ التگین نے پہلے تو اسے چونک کر دیکھا پھر وہ بھی ہنس پڑا۔ دونوں کو اِس جیسا کھل کے ہنسے بہت مدت گزر گئی تھی۔ وہ پہلے حضرو کے قریب بڑا ہی خونریز معرکہ لڑے تھے جس میں انہیں کامیابی کی توقع نہیں تھی لیکن راجہ انند پال کے ہاتھی کی آنکھ میں تیر لگا تو اس نے قیامت بپا کر دی۔ مہاراجہ کا جھنڈا اسی ہاتھی پر تھا۔ ہاتھی پیچھے کو بھاگا تو بھگدڑ مچ گئی۔ جھنڈا پیچھے کو جاتا دیکھ کر ہندوستانی دستے گھبرا گئے اور اصل صورت حال معلوم کیے بغیر پسپا ہونے لگے۔

التگین اور طغرل خان کے دستوں کو حکم ملا تھا کہ دشمن کا تعاقب کرو۔ چنانچہ وہ تعاقب میں گئے۔ ان کے کئی عزیز دوست حضرو کی جنگ میں مارے گئے تھے۔ وہ ہنسی اور مسکراہٹوں سے محروم رہے پھر انہیں نگرکوٹ تک پیش قدمی کرنی پڑی اور یہاں بھی لڑنا پڑا۔ جب موت ہنسا کرتی ہے تو انسان رویا کرتے ہیں۔ یہ دونوں کمانڈر رونے والے نہیں تھے۔ وہ غزنی سے ندیوں، دریاؤں اور چٹانوں اور دشمن کی صفوں کو چیرتے آئے تھے۔ اب جب اس جھونپڑے میں طغرل خان نے قہقہہ لگایا اور التگین کی ہنسی نکل گئی تو دونوں نے محسوس کیا کہ جنگ کے جہنم نے ان کے جذبات اور ہنسی کو چوس لیا ہے اور وہ ہنسنا کھیلنا چاہتے ہیں۔

طغرل خان نے کہا کہ اسے درد میں خاصا افاقہ ہوا ہے۔ التگین جھونپڑے کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ طغرل خان کو معلوم تھا کہ وہ کس کی راہ دیکھ رہا ہے مگر لڑکیوں کی بجائے دونوں بوڑھے اندر آئے۔ وہ تھے تو دیہاتی اور وہ جاہل سے لگتے تھے لیکن اُن کے انداز میں ایسی خود اعتمادی تھی جیسے وہ اپنے فن کے ماہر ہوں۔ دونوں نے طغرل خان کی پٹیاں کھولیں۔ زخم دیکھے۔ چوٹیں دیکھیں اور دونوں نے متفقہ رائے دی کہ آٹھ دن اور لگیں گے۔

ایک اور جھونپڑے میں دو ہندو عہدیدار بیٹھے تھے۔ انہوں نے تینوں لڑکیوں کو اپنے پاس بٹھا رکھا تھا۔

"احتیاط سے" ـــــ ایک عہدیدار نے لڑکیوں سے کہا۔ "دو دن تک اس سے زیادہ مقدار نہ ملانا، ورنہ انہیں شک ہو جائے گا۔ دودھ خود چکھ لیا کرو۔ ذائقے میں ذرا سی بھی تبدیلی دیکھو تو اور دودھ ڈال دو اور اس میں شہد زیادہ ڈالو۔"

"نشہ تو تمہارا اپنا ہے" ـــــ دوسرے عہدیدار نے ہنس کر لڑکیوں سے کہا ـــــ "تم انہیں دودھ میں یہ چیز ملائے بغیر بھی ان پر نشہ طاری کر سکتی ہو۔"

"یہ خیال بھی رکھنا کہ تم پر ہی نشہ طاری نہ ہو جائے" ـــــ عہدیدار نے لڑکیوں سے کہا۔ "دونوں خوبصورت جوان ہیں۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوگا" ـــــ ایک لڑکی نے کہا۔ "یہ تو آپ نے ہمیں فرض ہی ایسا سونپ دیا ہے کہ ہم ان کے پاس چلی گئی تھیں ورنہ ہم تینوں میں سے کوئی بھی ان مسلمانوں کے قریب نہ جاتی۔"

"شاید تمہیں اس سے بھی زیادہ آزمائش میں ڈالا جائے" ـــــ دوسرے عہدیدار نے کہا ـــــ "اپنے دیس اور اپنے دھرم کی خاطر تمہیں قربانی دینی ہوگی۔ تمہارا فرض یہ ہے کہ انہیں پنڈت ہمارا [illegible] سکے آپنے تک ہمیں جال میں الجھائے رکھو۔ پنڈت جی ایک آدمی کو ساتھ [illegible] مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں پر قبضہ کر لے گا، پھر ہم ان ..." کو آواز دی ... ان سے لے کہا ... پھر ہم ... گئے۔" اُس نے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔

سلطان محمود غزنوی کے دو کمانڈر ہندوؤں کے بڑے ہی حسین جال میں آ گئے۔ دوسرے تیسرے دن وہ اپنی فاتحانہ حیثیت، اپنے عہدوں اور اپنے فرائض کو بھول چکے تھے۔ انہیں پتہ نہ چل سکا کہ انہیں دودھ میں شہد اور شراب پلائی جا رہی ہے۔ انہوں نے چونکہ کبھی شراب نہیں پی تھی اس لیے دودھ میں ملی ہوئی تھوڑی سی شراب بھی انہیں اتنا سا مخمور کر دیتی تھی کہ وہ ہنسنے کھیلنے لگتے تھے۔ اتنی حسین لڑکیوں نے ان پر اپنا نشہ بھی طاری کر رکھا تھا۔

دو تین دن اور گزرے تو ایک لڑکی نے لبغراخان کو اور دوسری نے التگین کو کہنا شروع کر دیا کہ وہ انہیں اپنے ساتھ غزنی لے جائیں۔ دونوں کمانڈروں نے یہ بھی پوچھنے یا دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ اتنی خوبصورت لڑکیاں کون سے باپوں کی بیٹیاں ہیں۔ اس علاقے کے لوگوں کے رنگ تو بڑے صاف اور بعض کے گورے تھے لیکن یہ لڑکیاں اس علاقے کی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔

دونوں بوڑھے لبغراخان کا علاج کر رہے تھے اور لبغراخان چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا لیکن وہ اس گاؤں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ التگین کا دل بھی اس جھونپڑے کی جنت کا قیدی ہو گیا تھا۔ دونوں دوست لڑکیوں سے کہنے لگے کہ وہ کبھی رات ان کے جھونپڑے میں گزاریں۔ لڑکیوں نے انہیں بتایا کہ ان کے ماں باپ انہیں جان سے مار دیں گے۔ وہ کہتی تھیں کہ والدین نے انہیں ان کی صرف تیمارداری کی اجازت دے رکھی ہے۔ یوں لڑکیاں ان کے جذبات کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ وہ میدانِ جنگ کے تھکے ماندے سپاہیوں کے لیے سراب بنی ہوئی تھیں۔ وہ جس والہانہ انداز سے اظہارِ محبت کرتی تھیں، وہ ان کمانڈروں کو دیوانہ بنا دیتا تھا۔ عریاں کندھوں پر بکھرے لہراتے ریشمی بالوں کو جب وہ چھوتے تھے تو ان کے جسموں پر کیکپی سی طاری ہو جاتی تھی۔

تھوڑی ہی دور ... لبغراخان نے ... دیوتاؤں کا ایک بہت بڑا بت خانہ اجاڑ ڈالا تھا اور دیوتاؤں ... پہنے ان کے جذبات ... کے دو کمانڈر ہندوؤں کے ... جیتے جاگتے بت ...

"تم نے مجھے بدبودار لاشوں اور خون کی بدبو سے اٹھا کر ایسی دنیا میں پہنچایا ہے جہاں مجھے یہ جھونپڑا بھی محل لگتا ہے" — ایک روز لبغراخان نے اپنی لڑکی سے کہا۔

"کہو تو میں تمہیں اس سے بھی زیادہ حسین دنیا میں پہنچا سکتی ہوں" — لڑکی نے کہا — "لیکن میں جو کچھ بھی کروں، تم کوئی اعتراض نہ کرنا" — اور وہ چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک پیالہ تھا۔ اس نے پیالہ لبغرا کو دے کر کہا — "پیو۔ یہ اس جنگل کے ایک درخت کے پھل کا رس ہے۔ یہ صرف اس خطے میں ہوتا ہے"۔

لبغراخان نے پیالہ منہ سے لگایا۔ تین چار گھونٹ پیے ہوں گے کہ لڑکی نے پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ بولی — "ایک ہی بار نہ پیو"۔

لبغراخان نے اس ذائقے کی کوئی چیز پہلے کبھی نہیں پی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اسے سرور آنے لگا۔ اس نے لپک کر لڑکی کو اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا اور مستانہ سی آواز میں بولا — "میں اب چل پھر سکتا ہوں لیکن تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔ اگر سلطان مجھے تم سے جدا کرے گا تو اس کا بھی حکم نہیں مانوں گا"۔

"تم نے کبھی شراب پی ہے؟" — لڑکی نے کہا — "سنا ہے مسلمان شراب نہیں پیا کرتے"۔

"میں شراب پر لعنت بھیجتا ہوں" — لبغراخان نے کہا — "تم ہو تو مجھے شراب کی کیا ضرورت ہے"۔

"میں تمہیں شراب پلا چکی ہوں" — لڑکی نے کہا — "سچ بتاؤ، کیا تم اس چیز کو حرام سمجھتے ہو؟"

وہ سنجیدہ ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ لڑکی کا چہرہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے لڑکی کا چہرہ پھیلتا چلا گیا اور پھر لبغراخان بھول گیا کہ حرام کیا اور حلال کیا ہے۔

"التگین!" — اس نے اپنے دوست کو آواز دی۔ التگین اسی جھونپڑے کے دوسرے کمرے میں تھا۔ دوڑا آیا۔ لبغراخان نے اسے کہا — "دیکھو یہ لڑکی کتنی اچھی چیز کو شراب کہتی ہے۔ لو، تم بھی پیو" — اس نے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔ التگین نے

پیالہ اٹھایا اور منہ سے لگا لیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی انہی آسمانوں میں اڑنے لگا جن میں بغراخان اڑ رہا تھا۔

انہوں نے اپنے آپ پر شراب حلال کر لی لیکن اسے وہ شراب نہیں کہتے تھے۔

ایک روز دونوں لڑکیاں جھونپڑے میں آئیں تو انہوں نے دونوں کمانداروں کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ ایک لڑکی نے بغراخان سے بات شروع کی۔

"تم نے ہم سے کبھی بھی نہیں پوچھا تھا کہ ہم کس کی بیٹیاں ہیں اور ہم کون ہیں"۔۔۔ لڑکی نے کہا۔ "ہم اس گاؤں کی رہنے والی نہیں۔ ہم دونوں کے باپ تاجر ہیں تمہاری فوج جب نگرکوٹ کی طرف آ رہی تھی تو ہم اپنے باپوں کے ساتھ نگرکوٹ کے مندر میں پوجاپاٹ کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ تمہاری فوج کی خبر سن کر ہمارے باپ ہمیں واپس اپنے گھروں کو لے جانے کی بجائے اس گاؤں میں لے آئے تیسری لڑکی میری قریبی رشتہ دار ہے۔ ہمارے باپوں نے اس گاؤں کے لوگوں سے کہا کہ مسلمانوں کی فوج آ رہی ہے اور اتنی جوان اور خوبصورت لڑکیوں کو ساتھ لیے پھرنا ان کے لیے بہت خطرناک ہے۔ انہوں نے گاؤں والوں سے کہا کہ وہ ہم تینوں لڑکیوں کو یہاں چھپا لیں۔ جب خطرہ ٹل جائے گا تو وہ ہمیں لے جائیں گے۔ وہ اب آ گئے ہیں اور ہمیں ساتھ لے جائیں گے۔ اپنے دوست کو اپنی زبان میں سمجھاؤ کہ تم دونوں ہمارے ساتھ چلو ہمارے باپ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے پر راضی ہو جائیں گے"۔

بغراخان نے التگین سے بات کی تو اُس نے کہا کہ ہم فوج کے آدمی ہیں۔ اگر ہم پکڑے گئے تو ہمیں غدار اور بھگوڑا کہا جائے گا اور ہمارے سر قلم کر دیئے جائیں گے۔ اگر یہ لڑکیاں ہمارے ساتھ رہنا چاہتی ہیں تو ہم انہیں ساتھ رکھنے کا کوئی اور طریقہ اختیار کریں گے۔ انہیں ہمارے ساتھ چلنا چاہیئے۔

لڑکیاں مایوس ہو کر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد دو آدمی آئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لڑکیوں کے باپ ہیں۔ انہوں نے لڑکیوں کو اس گاؤں میں لانے کی وہی وجہ بتائی جو لڑکیاں بتا چکی تھیں۔ انہوں نے اپنا مسئلہ یوں پیش کیا کہ وہ لڑکیوں کو لے جانے آئے ہیں لیکن راستے میں مسلمان فوجیوں کا خطرہ ہے۔ لڑکیاں اتنی خوبصورت

ہیں کہ جس کی نظر پڑ گئی وہ اٹھا لے جائے گا۔ اس خطرے سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ بغراخان اور التگین ان کے ساتھ چلیں اور منزل پر پہنچا کر واپس آ جائیں۔ ان کا انہیں اتنا انعام ملے گا جو وہ اپنے تصور میں بھی نہیں لا سکتے۔

"ہم تمہیں منزل پر پہنچا دیں گے"۔۔۔ بغراخان نے کہا۔ "لیکن ہمارا انعام یہ لڑکیاں ہوں گی۔ اگر تمہیں منظور نہیں تو تم چلے جاؤ"۔

"انہی کی خاطر تو میں نے اتنا خطرہ مول لیا تھا"۔۔۔ ایک لڑکی کے باپ نے کہا۔۔۔ "میں اپنی لڑکی کو تمہارے حوالے نہیں کر سکتا"۔

"اور تم لڑکیوں کو یہاں سے نہیں لے جا سکتے"۔۔۔ بغراخان نے کہا۔

اُسی رات کا ذکر ہے۔ دونوں لڑکیاں بغراخان اور التگین کے پاس آئیں اور انہیں شراب پلا رہی تھیں۔ دونوں کے ذہن اپنے قابو سے نکل [illegible] جھونپڑے کا دروازہ کھلا اور ایک درویش صورت آدمی اندر آیا۔ اُس [illegible] داڑھی تھی اور سر کے بال لمبے تھے۔ اُس نے چغہ پہن رکھا تھا۔ [illegible] میں لمبا عصا تھا جس کے سر پر لکڑی کا سانپ بنا ہوا تھا۔ لڑکیوں نے [illegible] تیزی سے اٹھیں اور درویش کے پاؤں چھوئے۔ انہوں نے بغراخان اور [illegible] بتایا کہ یہ ایک جوگی ہے جو کبھی کبھی ادھر سے گزرتا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ یہ کہاں رہتا ہے اور اس کا مذہب کیا ہے۔ آنے والے وقت کی باتیں بتاتا ہے۔ جنگل کے سانپ اس کے مرید ہیں۔ راجے اور مہاراجے بھی اس کے آگے سجدے کرتے ہیں، لیکن یہ خود جنگلوں ہی کہیں رہتا ہے۔

"تم زندہ نہیں رہ سکتے تھے"۔۔۔ جوگی نے بغراخان سے کہا۔ "اتنی دور اوپر سے تم گرے اور بچ گئے۔ موت ابھی ٹلی نہیں۔ میرے قریب آؤ"۔

جوگی نے بغراخان کو اپنے سامنے بٹھا لیا اور چراغ دان قریب کر لیا۔ اُس نے ایک ہیرا سا نکالا اور اس طرح اپنے اور بغراخان کے درمیان کیا کہ دیئے کی روشنی

اس پر پڑتی اور اس سے رنگ برنگی کرنیں بغراخان کی آنکھوں میں پڑتی تھیں ۔ یہ رنگ دلکش اور پُرفریب تھے ۔ جوگی نے بغراخان سے کہا کہ آنکھیں کھلی رکھو اور اس ہیرے کو دیکھتے رہو ۔

"اس میں تمہیں ایک رنگ موت کا اور ایک زندگی کا نظر آئے گا۔" جوگی نے کہا ۔۔۔ "ہم دیکھیں گے کہ تمہارا رنگ کون سا ہے۔"

رنگ ایسے دلفریب تھے اور جوگی کی باتوں کا بھی اثر تھا، بغراخان مدہوش سا ہونے لگا۔ اُس نے شراب بھی پی رکھی تھی ۔ اُس کا شعور پہلے ہی مدہوش تھا ۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جوگی نے اپنی نظریں اُس کی آنکھوں میں جما رکھی ہیں ۔ جوگی مخمور سی آواز میں کہہ رہا تھا ۔۔ "مجھے ایک بڑی حسین زندگی نظر آ رہی ہے ۔ میں ہوں اور وہ لڑکی ہے جسے میں چاہتا ہوں ۔ میں اس زندگی کا بادشاہ ہوں۔"

جوگی نے ہیرے نما شیشہ اوپر کیا ۔ بغراخان کی نظریں اُس پر جمی رہیں ۔ جوگی ہیرے کو اپنی آنکھوں کے سامنے لے گیا ۔ پھر بغراخان کو محسوس ہی نہ ہوا کہ ہیرا درمیان سے ہٹ گیا ہے اور اُس کی نظریں جوگی کی آنکھوں میں جکڑی گئی ہیں اور جوگی کے الفاظ جن میں موسیقی سی تھی، آنکھوں کی راہ اُس کے ذہن میں اُترتے جا رہے ہیں ۔ وہ ہپناٹائز ہو چکا تھا ۔ وہ ایسے لہجے میں بولنے لگا جیسے خواب میں بول رہا ہو ۔

"ہاں ..... یہی جنت ہے ۔ مجھ سے یہ جنت کوئی نہیں چھین سکتا ..... میں غزنی کا بادشاہ ہوں ..... میں قتل کر دوں گا ..... میری تلوار پیاسی ہے ۔"

التگین دیکھ رہا تھا مگر اسے ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑ رہا تھا ۔ جوگی نے اُسے اپنے سامنے بٹھا لیا اور اُس پر بھی وہی عمل کیا اور وہ بھی ذرا سے وقت بعد بغراخان کی طرح بولنے لگا ۔

انسان جب اپنے کردار کو گناہوں کے دلفریب رنگوں میں رنگ لیتا ہے تو اسے ہپناٹائز ہوتے دیر نہیں لگتی ۔ گناہوں کی محبت اور شراب کی یہی کرشمہ سازی ہے کہ انسان کی روحانی قوت ختم ہو جاتی ہے ۔ اس کی شخصیت مر جاتی ہے اور وہ حسین پھندا کے فریب میں جلدی آ جاتا ہے ۔ یہ عمل آج بھی ایسے ہی ہوتا ہے، صدیوں پہلے بھی ایسے ہی

ہوتا تھا ۔ انسان اور شیطان کی چپقلش، نیکی اور بدی کی یہ کشمکش انسانی زندگی میں روزِ اوّل سے ہی شروع ہو گئی تھی ۔ شیطان نے انسان کے آگے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا ۔ خدا نے انسان سے کہا تھا کہ شیطان کی بات نہ سننا مگر شیطان نے ایسے طلسماتی حربے استعمال کیے کہ انسان نے شیطان کے آگے سجدے شروع کر دیئے ۔

اسلام ایک سچا مذہب ہے جس کی بنیاد اخلاقیات پر رکھی گئی ہے ۔ مخالف قوتوں نے اسلام کو شکست دینے کے لیے بدی کی قوت استعمال کی ۔ بدی میں وہ حسن اور کشش پیدا کی جو انسان کی کمزوریوں کو ابھارتی اور روحانی قوت کو کمزور کرتی ہے ۔ اسلام کو آتش پرست اور بُت پرست نہ سمجھے، یہود و ہنود سمجھے اور انہوں نے اسلام کی اخلاقی قدروں کا توڑ نکال لیا ۔ یہودیوں نے اپنی بیٹیاں استعمال کیں، صلیبیوں نے اپنی بیٹیاں استعمال کیں ۔ شراب اور زر و جواہرات کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا، نشہ آور اشیا کا سہارا لیا اور اخلاقیات کے علمبردار اس جال میں آ کر ہتھیار ڈالتے چلے گئے ۔

بغراخان اور التگین کے ذہنوں پر دو بڑی ہی حسین لڑکیوں اور شراب کا پہلے ہی قبضہ ہو چکا تھا ۔ روح پر نشہ طاری ہو چکا تھا، جسم پر قبضہ مشکل نہ تھا ۔ یہ جوگی اُن شعبدہ بازوں میں سے تھا جو تاریخ کے ہر دور میں ساری دنیا میں مشہور رہے ہیں ۔ رسّے کو بین بجا کر لاٹھی کی طرح کھڑا کر دینا ان کا کمال تھا ۔ انسانوں کے ہجوم کو ہپناٹائز کرنے میں یہ لوگ ماہر تھے ۔ ماں کے ہاتھوں اُس کے دودھ پیتے بچے کو مروا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا ۔

پنڈت اسی کو بلا لانے کے لیے کہیں چلا گیا تھا ۔ وہ دو تھے ۔ پہلے انہوں نے یہ حربہ استعمال کیا تھا کہ یہ لڑکیوں کے باپ ہیں ۔ لڑکیوں نے دونوں کمانداروں کو اپنے ساتھ چلنے کو کہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا ۔ اس کے بعد انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ انہیں شعبدہ بازی سے اپنا غلام بنا لیا جائے ۔

شراب اور لذت پرستی نے پہلے ہی زمین ہموار کر رکھی تھی ۔ جوگی نے ان کے ذہنوں کو اپنے قبضے میں لے لیا ۔

صبح طلوع ہوئی تو یہ قافلہ نگرکوٹ سے بہت دور نکل گیا تھا۔ بغراخان اور التگین گھوڑوں پر سوار تھے۔ ساتھ دس بارہ شتر سوار تھے۔ ان کی پالکیوں میں لڑکیاں تھیں اور ایک میں پنڈت۔ وہ دونوں آدمی بھی ساتھ تھے جنہیں پنڈت ساتھ لے گیا تھا اور دونوں ہندو عہدیدار بھی ساتھ تھے۔ بغراخان اور التگین شہزادوں کی طرح گردنیں تانے ہوئے تھے۔ وہ ہنس رہے تھے اور جن کے وہ قیدی تھے انہیں وہ اپنا غلام سمجھے ہوئے تھے۔

قافلہ چلتا رہا، رکتا رہا، بغراخان اور التگین کو کھانے اور دودھ میں کوئی نشہ آور دوائی دی جاتی رہی اور وہ اپنے آپ سے، اپنے مذہب اور اپنے وطن سے بے خبر نکلتے چلے گئے۔

اور یہ قافلہ تھانیسر پہنچ گیا۔ تھانیسر اُس دور میں بہت بڑا مندر تھا۔ نگرکوٹ سے بھی بڑا۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کے لیے اُس کی حیثیت وہی تھی جو مسلمانوں کے لیے مکہ معظمہ کی تھی۔ اس مندر کے تہہ خانے بھی تھے۔ اس میں غلام گردشیں اور اندرونی راستے بھول بھلیوں جیسے تھے۔ وہاں کے بڑے پنڈت کو معلوم تھا کہ غزنی کی فوج کے دو کمانداروں کو نشے کے زیر اثر لایا جا رہا ہے اور اُن کے ہاتھوں محمود غزنوی کو قتل کرایا جائے گا کیونکہ محمود تک اُس کی اپنی فوج کا ہی کوئی آدمی پہنچ سکتا ہے۔

ان دونوں کے لیے مندر کے تہہ خانے میں دو کمرے تیار کیے گئے تھے۔ انہیں کسی محل کے کمرے بنا دیا گیا تھا۔ اندر ایسی خوشبو پھیلا دی گئی تھی جو مدہوشی اور سرور طاری کر دیتی تھی۔ بستر نرم و گداز تھے اور چھتوں کے ساتھ رنگین فانوس لٹک رہے تھے۔ یہ دو کماندار جب وہاں پہنچے تو اُن کا استقبال کرنے والے اُن کے آگے جھک گئے اور انہیں اپنے اپنے کمرے میں لے گئے۔ اُن کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے عورتیں آ گئیں۔ وہ جوان نہیں تھیں۔

بڑے پنڈت نے انہیں لانے والوں کو الگ کر کے یہ خبر سنائی کہ سلطان محمود غزنی چلا گیا ہے اور اپنی تھوڑی سی فوج نگرکوٹ میں چھوڑ گیا ہے۔ یہ پتہ نہیں چل سکا

کہ وہ جلدی واپس آنے کے لیے گیا ہے یا کتنے عرصے بعد واپس آئے گا۔ اس صورت میں ان دونوں آدمیوں کو یہاں رکھنا بڑے پنڈت کی نگاہ میں بیکار تھا۔

"وہ آئے گا"۔۔۔ ہندو عہدیداروں نے کہا۔۔۔ "وہ ضرور آئے گا۔ یہ آدمی ہمارے ہاتھ آ چکے ہیں۔ انہیں ہم تیار کر لیتے ہیں۔ یہ ہمارے کام آئیں گے۔ ہم انہیں مسلمانوں کی فوج کے سپہ سالاروں کے قتل کے لیے استعمال کر سکتے ہیں"۔

اُن کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ انہیں یہیں رکھا جائے، اور سلطان محمود کے قتل کے لیے تیار کیا جائے۔

سلطان محمود غزنوی غزنی چلا گیا تھا۔ غزنی کے مغرب میں غور کا پہاڑی علاقہ تھا جس کا حکمران محمد بن سُوری تھا۔ اُس نے دیکھا کہ سلطان محمود ہندوستان میں برسرِپیکار ہے تو اُس نے دس ہزار نفری کی فوج ساتھ لی، اور غزنی کے قریب خیمہ زن ہو گیا۔ اُس نے خیمہ گاہ کے اردگرد خندق کھود لی۔ اس دفاع کے علاوہ اس فوج کو قدرت نے بھی دفاع مہیا کر رکھا تھا۔ وہ اس طرح کہ محمد بن سوری نے ایسی جگہ کیمپ کیا تھا جس کے تین طرف پہاڑیاں تھیں صرف ایک طرف تھوڑی سی جگہ خندق نہیں تھی اور اس طرف پہاڑی بھی نہیں تھی۔

اس طرح یہ کیمپ قلعے کی طرح ناقابلِ تسخیر ہو گیا تھا۔ اس سے سُوریوں کی فوج یہ فائدہ اُٹھاتی تھی کہ اس کے جیش باہر آ کر غزنی کی فوجی چوکیوں پر شبخون مارتے اور اپنے کیمپ میں چلے جاتے تھے۔ دو مرتبہ غزنی کی فوج کے ایک دستے نے ایک جیش کا تعاقب کیا اور دشمن کے کیمپ تک جا پہنچا۔ آگے خندق تھی۔ اندر جانے کا جو کھلا راستہ تھا، وہاں سے تیر اندازوں نے تیروں کا مینہ برسا دیا۔ کچھ دیر غزنویوں نے تیروں کا جواب تیروں سے دیا لیکن خندق آگے نہیں جانے دیتی تھی۔

دو بار ایسے ہی ہوا۔ غزنوی فوج پریشان ہو گئی۔ سُوریوں کے شبخون بڑھنے لگے۔ وہ غزنوی فوج کی جنگی طاقت آہستہ آہستہ کمزور کر رہے تھے۔ موزوں وقت پر انہیں غزنی پر حملہ کرنا تھا۔ غزنی والوں نے سلطان محمود کو خبردار کر دینا مناسب سمجھا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ

سلطان محمود کے دوسرے سلطان دشمن سُوریوں کی مدد کے لیے آسکتے تھے۔ سلطان محمود کو یہ اطلاع اُس وقت ملی جب وہ نگرکوٹ کا محاصرہ کیے ہوئے تھا۔ اس اطلاع پر وہ بھڑک گیا تھا۔ اسی غصے میں اُس نے نگرکوٹ پر یلغار کا حکم دے دیا۔ یہ یلغار اتنی دلیرانہ اور اتنی ہیبت ناک تھی کہ قلعے والوں نے مقابلہ ترک کر دیا اور ہتھیار ڈال دیئے۔ مندر کا صفایا کر کے بُتوں کو اوپر سے نیچے پھینک کر اُس نے فوج کو یوں تقسیم کیا کہ ایک حصہ اپنے ساتھ غزنی لے جانے کے لیے الگ کیا اور دوسرا نگرکوٹ میں رہنے دیا۔

اُس کا کوچ بہت تیز ہُوا کرتا تھا۔ اُس وقت کے وقائع نگار لکھتے ہیں کہ غزنی کو کوچ کے دوران سلطان محمود جتنا غصے میں تھا، اتنا غصے میں اسے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ اُس نے دشمن کے عوام کو کبھی پریشان نہیں کیا تھا۔ اُس کی لڑائی فوجوں کے ساتھ ہوتی تھی۔ اپنے دلیلوں کے لیے وہ سراپا قہر تھا مگر اب کے غزنی کو جاتے ہوئے اُس نے اپنی فوج کو یہ حکم دیا کہ پڑاؤ بہت کم ہوں گے اس لیے سوار اپنے گھوڑوں کو کھیتوں میں سے گزاریں تاکہ گھوڑے چلتے چلتے فصل کھاتے چلیں۔ ہاتھیوں، اونٹوں اور بیل گاڑیوں کے بیلوں کے لیے بھی یہی حکم دیا گیا۔ پیادہ فوج کو حکم دیا گیا کہ راستے میں کوئی بھی بڑا گاؤں آئے، اُس کے لوگوں سے کہیں کہ تنور جلائیں، آٹا گوندھیں اور روٹیاں پکا دیں۔

مورخ لکھتے ہیں کہ محمود غزنوی کی فوج جس راستے سے گزری، فصلوں کا صفایا کرتی گئی۔ راستے میں آنے والے دیہات میں اناج نہ رہا۔ دودھ اور مکھن نہ رہا۔ بعض جگہوں پر فوج نے مویشی ذبح کیے اور کھا گئے۔ صرف عُتبی ایک مورخ ہے جس نے سلطان محمود کے ان احکام کی وضاحت کی ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ سلطان کو سُوریوں پر بھی غصہ تھا لیکن زیادہ تر غصہ پنجاب کے راجہ انندپال پر تھا کیونکہ وہ باجگزار ہوتے ہوئے ہندوستان کی ریاستوں کی فوجیں اکٹھی کر کے انہیں متحدہ کمان میں لے لیتا اور غزنی پر حملے کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ چنانچہ سلطان محمود نے انندپال کو ڈرانے کے لیے یہ حکم دیا تھا کہ پنجاب میں سے گزرتے ہوئے اس میں کچھ بھی نہ چھوڑا جائے۔

سُوریوں کی توقع کے خلاف سلطان محمود بہت جلدی غزنی پہنچ گیا۔ اُس نے اپنا ایلچی

محمد بن سُوری کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم سے بے وفائی کرنے والوں کا انجام اچھا نہیں ہُوا کرتا۔ سلطنتِ اسلامیہ کو ریاستوں میں تقسیم کر کے حکمران بننے والوں کے نیچے سے تخت ہی نہیں زمین بھی نکل جایا کرتی ہے۔ قوم کو دھوکے میں رکھ کر لوگوں کو قوم سے الگ کرنا اور لڑانا ایسا گناہ ہے جس کی سزا خدا دُنیا میں دیتا ہے۔ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے ہاتھ میں قرآن لے کر تخت پر بیٹھنے والوں کے لیے اُن کے اپنے عمل جہنم بن جایا کرتے ہیں .... اگر اپنی دنیا اور اپنی عاقبت سنوارنا چاہتے ہو تو میرا ساتھ دو۔ میرے ساتھ ہندوستان چلو۔ وہاں محمد بن قاسم کی سرزمین بُت خانہ بن گئی ہے۔ آؤ، وہاں چل کر مسجدوں کو آباد کرتے اور انسانوں کو صراطِ مستقیم دکھاتے ہیں۔

سلطان محمود نے پیغام میں لکھا کہ میں تمہارے آگے درخواست پیش نہیں کر رہا۔ ایمان فروشی تمہیں جس انجام تک پہنچائے گی، میں تمہیں وہ انجام دکھا رہا ہوں۔ گمراہی کا لشکر تمہیں اُس لبنی میں پھینکے گا جہاں تاریخ رہتی دنیا تک تم پر لعنت بھیجتی رہے گی۔ میں تمہیں دو دن کی مہلت دیتا ہوں۔ میرے پاس آنا چاہو تو بھائیوں کی طرح آجاؤ۔ یہ پسند نہیں تو اپنی فوج واپس لے جاؤ۔

ایلچی جب محمد بن سُوری کے پاس پہنچا تو اُس نے رعونت سے پیغام ایلچی کے ہاتھ سے چھینا اور بولا "صلح کا پیغام لائے ہو؟" — ایلچی خاموش کھڑا رہا۔

محمد بن سُوری نے پیغام پڑھا اور قہقہہ لگا کر بولا "کیا تمہارے سلطان نے مجھے بھی انندپال اور کسی راجے جیسا سمجھ لیا ہے؟ جاؤ، اُس بدصورت سے کہو کہ محمد بن سُوری تمہارے کہنے سے نہیں جائے گا۔ ہمت ہے تو خود آؤ۔ ہم جانے کے لیے نہیں آئے" —

اُس نے گرج کر کہا "جاؤ، اور اُس غلام ابن غلام سے کہو کہ آجاؤ اور غزنی کی سلطنت طشتری پر رکھ کر لا دو۔"

سلطان محمود غزنوی کو ان لوگوں سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔ غور کے یہ لوگ جنگجو کم اور لٹیرے زیادہ تھے۔ سلطان محمود غزنوی کے والد سلطان سبکتگین کے دور میں بھی وہ بہانے بہانے غزنی کے علاقے میں لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ اب سلطان محمود انہیں فیصلہ کن

شکست دینے کا تہیہ کر چکا تھا۔ یہ پہلی بار تھی کہ سُوری دس ہزار فوج لے کر آیا اور غزنی کی حدود کے اندر خیمہ زن ہو گیا تھا۔ سلطان محمود نے اپنے دو جرنیلوں التون تاش اور ارسلان جاذب سے کہا کہ وہ سُوری خاندان کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

سلطان محمود نے بھیس بدلا اور سُوریوں کا کیمپ دیکھنے چلا گیا۔ اُس نے دل ہی دل میں سُوریوں کے دفاعی انتظامات کی تعریف کی اور سوچنے لگا کہ وہ ان کے اِس کیمپ کو ان کا قبرستان کس طرح بنا سکتا ہے لیکن اُسے یہ کام آسان نظر نہیں آتا تھا۔ حصنو کے مقام پر سلطان نے اپنے دستوں کو بالکل اسی طرح کے کیمپ میں رکھا اور ارد گرد خندق کھدوائی تھی۔ دشمن کی تیس ہزار نفری نے کیمپ پر حملہ بولا تھا تو نقصان دشمن کا ہی ہوا تھا۔ سُوریوں کا اسی قسم کا دفاع دیکھ کر سلطان محمود پریشان ہو گیا۔ واپس آ کر اُس نے اپنے سالاروں کو تفصیل سے بتایا کہ دشمن خندق کے پیچھے ہے جہاں سے اُسے نکالنا آسان نہیں ہو گا۔

رات بھر سوچ بچار ہوتی رہی اور رات کو ہی سلطان محمود نے فوج کو پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ فوج کو دشمن کے کیمپ سے کچھ دور تیاری کی حالت میں رکنے کو کہا۔ علی الصبح سلطان خود بھی روانہ ہو گیا اور جاتے ہی اُس نے حملے کا حکم دے دیا۔ سُوری تیر اندازوں نے غزنی کی فوج کو قریب نہ آنے دیا۔ سلطان محمود نے اُس جگہ پر حملہ بولنے کا حکم دیا جہاں خندق نہیں تھی۔ یہ کیمپ کے اندر باہر آنے جانے کا فراخ راستہ تھا مگر سُوریوں نے باہر آ کر آمنے سامنے کا معرکہ ایسے قہر سے لڑا کہ غزنویوں کے پاؤں اکھڑنے لگے۔

سُوری آگے آتے، لڑتے اور پیچھے ہٹ کر کیمپ میں چلے جاتے۔ ان پر کسی اور طرف سے حملہ نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ ہر طرف پہاڑیاں بھی تھیں اور خندق بھی۔ سہ پہر کے وقت سلطان محمود نے اپنے دونوں سالاروں کو ایک اور چال بتائی اور اس کے مطابق خود حملہ بولا۔ محمد بن سُوری نے دیکھ لیا کہ سلطان خود آ رہا ہے۔ اُس وقت تک غزنی کی فوج کا بہت نقصان ہو چکا تھا جس سے سُوریوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ محمد بن سوری نے سلطان محمود پر دھاک بٹھانے کے لیے اُس کا حملہ روکنے کو زیادہ نفری کے دو دستے باہر بھیج دیے۔

تصادم خونریز تھا۔ سلطان محمود آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے ایسا حکم دیا جس نے اُس کے [illegible] کو حیران کر دیا۔ سلطان نے چلا کر کہا — "بھاگو ورنہ سُوری کسی کو زندہ نہیں چھوڑ [illegible] ے" — اور وہ پیچھے کو بھاگ اُٹھا۔
اُس کے مصنون [illegible] ور آوازیں سنائی دیں — "بھاگو۔ سُوری آ رہے ہیں بھاگو" —
یہ آوازیں سُوریوں نے بھی سنیں۔ محمد بن سُوری دیکھ رہا تھا۔ اُس نے حکم دیا — "تعاقب کرو۔ انہیں غزنی تک نہ پہنچنے دو" — اور اُس نے یہ حکم بھی دیا۔ "سلطان محمود کو زندہ میرے سامنے لاؤ ... غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجا دو"

سُوری لشکر تعاقب میں نکل پڑا۔ کیمپ خالی ہو گیا۔ کم و بیش تین میل دور جا کر سلطان محمود نے پسپائی روک دی اور دستوں کو جو پہلے دی ہوئی ہدایت کے مطابق ترتیب اور تنظیم سے بھاگ رہے تھے پیچھے مڑنے کا حکم دیا۔ کمانڈروں کو اس چال کا پہلے سے علم تھا۔ سلطان نے پیچھے مڑ کر اپنے تعاقب میں آتے سوریوں کا آمنے سامنے کا مقابلہ کیا۔ سالار التون تاش اور سالار ارسلان جاذب اس چال کے منتظر تھے۔ ان میں سے ایک نے سُوریوں کے کیمپ کا راستہ روک لیا، اور دوسرے نے پہلو سے حملہ کر دیا۔ مؤرخ عُتبی نے لکھا ہے "یہ سیدھے سادے سُوری سلطان محمود جیسے شاطر جرنیل کے پھندے میں آ گئے اور اب جو لڑائی ہو رہی تھی یہ غزنی کی فوج کے ہاتھوں سُوری فوج کا قتلِ عام تھا۔"
سورج غروب ہونے سے پہلے سُوریوں کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ محمد بن سُوری بھاگ نہ سکا۔ اُسے ایک کھڈ میں سے پکڑ لیا گیا جہاں وہ اپنے دو درباریوں کے ساتھ چھپا بیٹھا تھا۔ ان تینوں کو سلطان محمود کے خیمے میں پیش کیا گیا۔
"محمد" — سلطان محمود نے کہا۔ "میں نے پرسوں جو تمہیں لکھا تھا وہ آج ایک حقیقت بن کر تمہارے سامنے آ گیا ہے۔ تمہیں شکست دے کر مجھے خوشی نہیں ہوئی۔ آج جن دونوں فوجوں کا خون بہہ گیا ہے، انہیں کسی اور مقصد کے لیے لڑنا تھا۔ خدا کا یہ قانون میری سمجھ سے بالا ہے کہ گناہگار حکمرانوں کی سزا بے گناہ رعایا کو بھی ملتی ہے۔"
سلطان محمود بول رہا تھا کہ محمد بن سُوری کا پہلے سر ڈولا، پھر وہ گھٹنوں کے بل گرا

اور ڈھلک گیا۔ اسے سنبھالنے لگے تو دیکھا کہ اُس کی آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں — وہ مر گیا تھا۔ اُس کے ساتھ جو درباری تھے، انہوں نے بتایا کہ محمد بن سوری نے جو انگوٹھی پہن رکھی ہے، اس میں زہریلا ہیرا تھا۔ اُس نے جب دیکھا کہ فوج ماری گئی ہے اور اُس کے اپنے نکل بھاگنے کی کوئی صورت نہیں رہی تو ہیں ساتھ لے کر یہ ایک کمرہ میں اُتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے انگوٹھی سے ہیرا نکالا اور نگل لیا اور فوراً بعد اُسے پکڑنے والے پہنچ گئے۔

یہ معرکہ ۱۰۱۰ء (۴۰۱ ہجری) کے موسم گرما میں لڑا گیا۔

سلطان محمود غزنوی کو ہندوستان سے آئے چھ سات مہینے گذر گئے تھے۔ اُسے اطلاعیں مل چکی تھیں کہ دلی سے تیس چالیس میل مغرب کی طرف تھانیسر میں بہت بڑا مندر ہے جس میں بہت سے بُت ہیں۔ ان میں ایک بُت جگ سوما نام کا ہے جس کے متعلق ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی وجود میں آیا تھا اور اولین انسانوں نے اسی کی پرستش کی تھی۔ بعض مؤرخوں نے اسے چکر سوامی کہا ہے اور یہ بھی کہ یہ وشنو دیوتا کا بُت تھا۔ اسے اس قدر مقدس سمجھا جاتا تھا کہ دُور دُور سے ہندو اس کی پوجا کرنے کے لیے آتے اور وہی درجہ حاصل کرتے جو مسلمانوں میں حاجیوں کو حاصل ہوتا ہے۔

سلطان محمود ایک تو اپنے عقیدے کے زیرِ اثر تھانیسر کے مندر کو تباہ کرنا چاہتا تھا، دوسرے اس لیے اُس نے فوراً کوچ کا حکم دے دیا تھا کہ اُسے معلوم تھا کہ ہندوستان کے راجے مہاراجے ابھی حضرو کی جنگ اور نگرکوٹ کی لڑائی سے سنبھلے نہیں ہوں گے۔ اُسے اپنے جاسوسوں نے بتایا تھا کہ ہندوستانی ریاستوں کی فوجوں پر غزنی کی فوج کی دہشت طاری ہے اور اُن کے حوصلے پست ہیں۔ حوصلے پست ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کے خداؤں کے بُت توڑ دیئے گئے تھے اور مسلمان فوجی اُن کے سامنے گائے ذبح کر کے کھاتے رہتے تھے۔ گائے ہندوؤں کی گئو ماتا تھی۔

جاسوسوں نے یہ اطلاعیں غزنی پہنچادی تھیں کہ ہندوستانی فوج کا ہی نہیں، پوری

قوم کا حوصلہ پست ہو چکا ہے۔ ہندوؤں کی یہ حالت ہے کہ گھٹائیں گرجتی اور چمکتی ہیں تو لوگ مندروں کو دوڑ پڑتے ہیں یا اپنے گھروں میں رکھے ہوئے بتوں اور مورتیوں کے آگے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جاتے اور رو رو کر ان سے رحم مانگتے اور گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔

یہ صورتِ حال سلطان محمود کے لیے موزوں تھی۔ اُس نے پشاور پہنچ کر ہندوستان کو روانہ اور ایک ایلچی دوڑا دیا۔ ایک بھیرہ اور ملتان پیغام لے کر گیا اور دوسرا نگرکوٹ وہاں کے سالاروں کو (جن کے رتبے آج کے گورنروں جیسے تھے) یہ پیغام دیا گیا تھا کہ وہ فوج کا کچھ حصہ بالکل تیاری کی حالت میں رکھیں۔ پیغام میں انہیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ تھانیسر پر حملہ کیا جا رہا ہے۔

ایلچی کو پنجاب کے راجہ انندپال کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا گیا کہ سلطان محمود کی فوج پنجاب میں سے گزرے گی معاہدے کے مطابق راجہ انندپال کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ غزنی کی فوج بحفاظت گذر جائے اور اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ ہو نہ کوئی مزاحمت۔ اور یہ بھی کہ انندپال اب دوسری ریاستوں کی فوج کو اکٹھا کر کے متحدہ فوج نہ بنائے۔ اگر اُس نے ایسا کیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ راجہ نے معاہدہ توڑ دیا ہے اور پھر سلطان کو حق پہنچتا ہے کہ وہ پہلے لاہور پر اور پھر پنجاب کے دوسرے دارالحکومت بھٹنڈہ پر حملہ کر کے دونوں شہروں کی اینٹ سے اینٹ بجا دے۔

راجہ جے پال نے اپنے ایک بھائی (جس کا نام تاریخ میں نہیں ملتا) کی زیرِ کمان دو ہزار سوار سلطان محمود غزنوی کے استقبال کے لیے بھیجے اور ساتھ ابوالقاسم فرشتہ کی تحریر کے مطابق، یہ پیغام بھیجا۔ ”یہ میرا بھائی ہے اور میرا سفیر بھی۔ اسے میں آپ کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ بھیج رہا ہوں کہ تھانیسر ہماری سب سے بڑی اور سب سے زیادہ مقدس عبادت گاہ ہے۔ اگر یہ فرض آپ پر آپ کے مذہب کی طرف سے عائد ہوتا ہے کہ دوسروں کے مذہب کو ختم کریں تو آپ نگرکوٹ کی تباہی سے اپنا یہ فرض پورا کر چکے ہیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ تھانیسر کے متعلق اپنے ارادے بدل دیں۔ میں اس کے عوض سالانہ خراج دیا کروں گا۔ یہاں تک آنے میں آپ کی فوج پر جو خرچ ہوا ہے اور واپس جانے کا جو خرچ ہوگا، وہ میں ادا کروں گا۔ اس کے علاوہ میں آپ کو پچاس ہاتھی

اور کچھ بیش قیمت ہیرے جواہرات بھی پیش کروں گا۔"

تاہم فرشتہ نے لکھا ہے کہ سلطان محمود نے اس پیغام کا یہ جواب دیا۔ "میرے لیے خدا اور رسول صلعم کا حکم ہے کہ جہاں کہیں بت پرستی ہو وہاں جاؤں اور بتوں کو تباہ کروں۔ میرے رسول صلعم کا نظریہ ہے کہ خدا اس کا اجر اگلے جہان میں دے گا۔ میں آپ سے بت نہ توڑنے کا انعام قبول نہیں کر سکتا۔ میرے پاس کوئی جواز نہیں کہ تھانیسر کا بت خانہ نہ توڑوں۔"

کسی مورخ نے یہ نہیں بتایا کہ راجہ انندپال کو کس طرح پتہ چلا تھا کہ سلطان محمود تھانیسر جا رہا ہے۔ البتہ ان واقعات پر سب متفق ہیں کہ راجہ انندپال کے جواب میں سلطان نے اس کی پیش کش اور درخواست قبول نہ کی اور راجہ انندپال نے دلی، اجمیر، کالنجر اور قنوج کے مہاراجوں کی طرف قاصد بھیج دیے کہ غزنی کا سلطان محمود ہماری طرف سے کسی اشتعال کے بغیر ہندوستان میں داخل ہو گیا ہے اور اس کا ارادہ تھانیسر کے وشنو مندر کو تباہ کرنے کا ہے۔

تھانیسر میں سلطان محمود غزنوی کے قتل کا انتظام ہو چکا تھا۔

۱۰۱۱ء (۴۰۲ ہجری) کا سال تھا۔ سلطان کو نگرکوٹ سے گئے ابھی ایک سال نہیں گزرا تھا۔ اس کے دو کمانڈر لبغرا خان اور التگین لاپتہ ہو گئے تھے۔ ان کے گھروں کو یہ اطلاع دے دی گئی تھی کہ اُن کے مارے جانے کی کوئی شہادت نہیں ملی اس لیے یہ یقین ہے کہ وہ ہندوستانی فوج کے قیدی ہیں۔

وہ قیدی نہیں شہزادے تھے۔ اس عرصے میں اُن کی تو جیسے روحیں بھی بدلی جا چکی تھیں۔ انہیں جب کوئی نشہ آور جڑی کھلا کر اور ہپناٹائز کر کے تھانیسر لایا گیا تھا تو دونوں کو الگ الگ کمرے دیے گئے تھے اور اُن کی خدمت کے لیے عورتیں مقرر کی گئی تھیں۔ وہ آئے اُن دو جوان اور بے حد خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ تھے جو انہیں نگرکوٹ کے ایک گاؤں میں ملی تھیں۔ تھانیسر میں وہ اُن سے جدا کر دی گئی تھیں۔

لبغرا خان کے زخم اور چوٹیں ٹھیک ہو گئیں اور وہ بھاگنے دوڑنے کے قابل ہو گیا۔ التگین اور وہ مل بیٹھتے اور گپ شپ لگاتے تھے۔ اپنے میزبانوں کے ساتھ صرف لبغرا خان بات کرتا تھا کیونکہ یہاں کی زبان وہی کچھ سمجھتا تھا۔ دونوں نے تین چار دن خاموشی اختیار کیے رکھی۔ آخر التگین نے لبغرا خان سے کہا کہ وہ لڑکیاں کہاں ہیں۔ اگر وہ مل جائیں تو وہ یہاں رہیں گے ورنہ اپنی فوج میں چلے جائیں گے۔

ایک روز لبغرا خان نے اپنے ایک میزبان سے پوچھا کہ وہ لڑکیاں کہاں چلی گئی ہیں۔ یہ میزبان وہی تھا جو درویش یا جوگی کے بہروپ میں انہیں ہپناٹائز کر کے لایا تھا۔ یہاں وہ اصل روپ میں تھا۔ اُس کے چہرے پر داڑھی نہیں تھی اور اس کی آواز بھی بناوٹی نہیں تھی۔

"تم دیویوں کو اپنے پاس بلانا چاہتے ہو؟" — اس آدمی نے کہا — "وہ انسان نہیں تھیں۔ تم چونکہ نگرکوٹ کے مندر کے بت توڑنے والوں میں نہیں تھے اور تم زخمی ہو گئے تھے، اس لیے یہ دیویاں انسانوں کے روپ میں تمہارے پاس پہنچ گئیں اور انہوں نے تمہاری تیمارداری کی۔ وہ تمہارے ساتھ انسانوں کی طرح باتیں کرتی رہیں....

"تم نے اُن سے پیار مانگا تو انہوں نے تم سے پیار بھی کیا لیکن انہوں نے تمہیں بدی کی طرف نہیں جانے دیا۔ تم نے بری نیت ظاہر کی تو انہوں نے ہنس کھیل کر تمہارے دل سے بُرے خیال نکال دیئے۔ یہ اُن کا حکم تھا کہ تم دونوں کو فوج کی اتنی سخت زندگی سے، جنگ و جدل اور قتل و غارت سے نکال کر شاہانہ زندگی میں رکھا جائے۔"

"نہیں" — لبغرا خان نے کہا — "یہ غلط ہے۔ وہ ہر لحاظ سے انسان تھیں۔"

"وہ انسان نہیں تھیں" — اس آدمی نے لبغرا خان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور دھیمے سے لہجے میں کہنے لگا — "وہ انسان نہیں تھیں۔ تم اُن کے پجاری ہو۔ تمہاری روح اُن کے قبضے میں ہے۔"

"ہاں" — لبغرا خان نے خوابناک آواز میں کہا — "میں اُن کا پجاری ہوں.... میری روح اُن کے قبضے میں ہے۔"

بغراخان کے ذہن پر یہ شعبدہ باز قابض ہو چکا تھا۔ اب وہ عامل تھا اور بغراخان کا ذہن پہلے ہی اُس کے اپنے قبضے سے نکل چکا تھا۔ یہ شراب کا اثر تھا جو وہ اور التگین خود ہی پینے لگے تھے اور یہ اُس نشہ آور دوائی کا بھی اثر تھا جو ان دونوں کو شراب میں اور کھانے میں کھلائی جاتی تھی۔

التگین کو دوسرے شعبدہ باز نے اپنے زیرِ اثر لے رکھا تھا۔ اُن کی خدمت اور دیکھ بھال شہزادوں کی طرح ہوتی تھی۔ وہ جدھر سے گذرتے تھے، لوگ رُکتے اور اُن کے آگے جُھک جاتے تھے۔

دو تین مہینے ان پر یہی عمل جاری رہا۔ جب یقین ہو گیا کہ اُن کے ذہن اُن کے اپنے قبضے سے پوری طرح نکل گئے ہیں تو انہیں ایک رات کہا گیا کہ انہیں اُن کی دیویوں نے بلایا ہے۔ دونوں کو مندر کے باغ میں لے جایا گیا۔ رات کی تاریکی تھی۔ باغ خوشنما تھا۔ انہیں ایک مسند پر بٹھا دیا گیا۔ قندیلیں جل رہی تھیں۔ اُن کے سامنے پندرہ بیس قدم دور دو ٹوکرے رکھے تھے۔ ان پر چمکدار کپڑے لپٹے ہوئے تھے۔ قندیلوں کی روشنی میں یہ تاروں کی طرح چمکتے تھے۔

ستار کے تار جھنجھنانے لگے اور دھیما دھیما اور وجد آفریں راگ الاپنے لگے۔ ماحول پُراسرار سا ہو گیا۔ بنسری کی لَے سنائی دینے لگی۔ بنسری اور ستار کی سنگت نے طلسم طاری کر دیا اور اس طلسم میں دونوں لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ کوئی نہ دیکھ سکا کہ وہ پھولدار پودوں کے پیچھے سے نکلیں یا درختوں کے پیچھے سے۔ ان کے لباس اتنے باریک کپڑے کے تھے جن میں سے اُن کے جسم نظر آتے تھے۔ اُن کے سروں پر اوڑھنیاں نہیں تھیں۔ اوڑھنیاں اُن کے بال ہی تھے جو اُن کے شانوں پر اور کچھ آگے سینے پر بکھرے ہوئے تھے۔ ہوا سے اُن میں لہریں اٹھتی تھیں۔

وہ جونہی نمودار ہوئیں، سب نے ہاتھ جوڑ دیئے اور سجدے میں چلے گئے۔ بغراخان اور التگین نے نہ [illegible] سجدہ کیا۔ وہ مبہوت ہو کر دیکھتے رہے۔ لڑکیاں یوں

نہایت آہستہ آہستہ چل رہی تھیں کہ اُن کے قدم اٹھتے نظر نہیں آتے تھے۔ سب سجدے سے اُٹھے۔ لڑکیاں ٹوکروں کے پاس رُک گئیں۔ انہوں نے دونوں بازو آگے کر کے ہاتھ پھیلا دیئے اور ایک لڑکی ایک ٹوکرے میں اور دوسری دوسرے ٹوکرے میں کھڑی ہو گئی۔ وہ گھٹنوں تک ٹوکروں میں چھپ گئیں۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اس میں بیٹھنے لگیں اور ٹوکروں میں غائب ہو گئیں۔

بڑے پنڈت نے بغراخان اور التگین سے کہا کہ جاؤ اور ٹوکروں میں دیکھو۔ دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ وہ مسحور تھے۔ ٹوکروں سے تین چار قدم دور تھے کہ ٹوکروں میں سے ایک ایک کبوتر اڑا اور رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ دونوں کمانداروں نے ٹوکروں میں جا کر دیکھا۔ ٹوکرے خالی تھے۔

”وہ دیویاں ہیں“۔۔۔ ایک پنڈت نے آگے بڑھ کر انہیں کہا۔۔۔ ”صرف تمہارے لیے زندہ روپ میں آئی تھیں۔ انہوں نے تم پر خاص کرم کیا ہے کہ آج ہم سب تمہارے غلام ہیں اور تم ہمارے بادشاہ ہو۔ یاد کرو تم کیا تھے، کہاں تھے، تمہاری زندگی کیا تھی۔ دیویوں نے ہمیں اشارہ دیا ہے کہ وہ تمہارے لیے اپنے جیسی دو لڑکیاں بھیج دیں گی۔“

”کیا یہ ہمیں پھر بھی نظر آئیں گی؟“۔۔۔ بغراخان نے پوچھا۔

”دیویاں دیوتا ہماری خواہشوں کے غلام نہیں ہوتے“۔۔۔ انہیں پنڈت نے کہا۔۔۔ ”یہ دونوں اس لیے خوش ہوئی تھیں کہ تم نے نگر کوٹ کے بتوں کی توہین نہیں کی تھی اور تم بتوں کی توہین کرنے والے سلطان کی فوج سے الگ ہو گئے تھے۔۔۔ یہ دیویاں بُت ہیں۔ دیکھنے میں پتھر ہیں۔ ہم تمہیں اُن کا یہ روپ بھی دکھائیں گے۔“

وہ جب اپنے کمرے میں آئے تو التگین نے بغراخان سے کہا۔۔۔ ”ہمیں بتایا جاتا رہا ہے کہ ان لوگوں کا مذہب باطل ہے اور یہ بتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کا تعلق براہِ راست عالمِ غیب سے معلوم ہوتا ہے۔۔۔ ہم کس کی عبادت کرتے ہیں؟“

ان دونوں کے ذہنوں میں شکوک پیدا ہو گئے تھے۔ وہ اُسے معبود سمجھنے لگے تھے جسے وہ دیکھ سکیں، جو انہیں مسحور کر دے اور جو اتنا حسین ہو کہ اُن کے جذبات میں ہلچل بپا کر دے۔ انسان کے ذہن میں سے ہوتا ہے [illegible] رشتہ توڑ کر صرف جسم بن جاتا ہے اور

اُسی چیز کو برحق سمجھتا ہے جو اُس کی جسمانی ضرورت پوری کرے اور اُسے جسمانی لذت مہیا کرے۔ ایسے ہی انسان شعبدہ بازی کو معجزہ کہتے اور جذباتی اور دلفریب باتوں سے مسحور ہو جاتے ہیں۔ انسان جس قدر مادیت پرست اور جس قدر کم فہم ہوتا ہے، اتنی ہی جلدی مسحور ہوتا ہے۔ جس دور میں انسان ہپناٹزم سے واقف نہیں تھا، وہ اُس وقت بھی ہپناٹائز ہُوا کرتا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے ان کے ملک میں جادوگری نہیں ہے" — پنڈت نے اپنے شعبدہ بازوں سے کہا — "ورنہ یہ دونوں اتنے حیران نہ ہوتے۔ ہمارے ہاں کسی کو ٹوکرے میں کھڑا کر کے غائب کر دینا معمولی سی قسم کی شعبدہ بازی ہے . . . . انہیں کچھ اور کرتب دکھاؤ۔ میں اب قائل ہوتا جا رہا ہوں کہ انہیں ہم استعمال کر سکیں گے۔ اگر ان کے ہاتھوں سلطان محمود کو قتل نہ کرایا جا سکا تو نگرکوٹ کے سالار اور دوسرے اہم آدمیوں کو قتل کرایا جا سکتا ہے۔"

"شعبدہ بازی کے ساتھ بُوٹی نے بھی خوب اثر دکھایا ہے" — اس فن کے ماہر نے کہا — "انہیں اب یہ لڑکیاں بُتوں کے روپ میں دکھاؤ۔"

اور ایک رات انہیں یہ بُت بھی دکھا دیئے گئے۔ مندر کی عبادت گاہ میں دو چبوترے تھے جن پر پھولدار کپڑے بچھے ہوئے تھے۔ ان پر لوبان جل رہا تھا جس کا دھواں ٹیڑھی میڑھی لکیروں کی طرح اوپر اُٹھ رہا تھا اور بُتوں کے گرد لپٹ لپٹ جاتا تھا۔ روشنی بُتوں کے پیچھے اور نیچے رکھی گئی تھی۔ بُت پہچانے جاتے تھے ___ یہ وہی دو لڑکیاں تھیں۔ مادرزاد برہنہ چبوتروں پر کھڑی تھیں۔ بے جان بُت لگتی تھیں۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں۔ پنڈت نے سب سے کہا کہ ماتھے رگڑو۔ سب نے ماتھے فرش سے لگا دیئے۔ بُغرا خان اور التگین بھی سجدے میں چلے گئے۔

اُس رات کے بعد اُن کی اصلیت اور اُن کی قومیت ختم ہو گئی۔ اُن کی ہر ایک جسمانی ضرورت پوری کرنے کا انتظام کر دیا گیا۔ سحر کا عمل بھی جاری رہا، شعبدہ بازی بھی ہوتی رہی اور جب اُن کے متعلق یقین ہو گیا کہ اب اصلیت اور حقیقت کی طرف اُن کی واپسی کا خطرہ ختم ہو گیا ہے تو مندر کے شعبدہ بازوں نے اُن کے دماغوں میں سلطان محمود کے خلاف زہر بھرنا

"وہ یہاں سے خوبصورت لڑکیاں اور زر و جواہرات لُوٹنے آیا کرتا ہے" — اُن کے ذہن میں ڈالا جانے لگا — "کیا تم اُن بُتوں کی توہین کرو گے جو تم نے دیکھے ہیں؟ جن دیویوں نے تمہاری کایا پلٹ دی ہے، کیا تم انہیں توڑ پھوڑ سکو گے؟ اب تمہارے لیے یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ سلطان محمود اگر یہاں آ گیا اور اُس نے ان بُتوں کو توڑا تو اس کے ساتھ ہی تم دونوں کے جسم اپنے آپ ہی کٹنے لگیں گے۔ بُتوں کا ایک بازو ٹوٹے گا تو تمہارے جسموں سے ایک ایک بازو الگ ہو جائے گا۔ دیویاں مرا نہیں کرتیں۔ تم بھی نہیں مرو گے مگر تمہارے جسم کوڑھی اور اپاہج ہو جائیں گے اور تم ویرانوں میں پڑے تڑپتے رہو گے۔"

"کیا سلطان محمود یہاں بھی آئے گا؟" — بُغرا خان نے پوچھا۔

"شاید آ جائے۔"

"آنے دو" — بُغرا خان نے کہا — "وہ زندہ واپس نہیں جائے گا۔"

چار پانچ مہینوں بعد اُن میں یہ تبدیلی آئی جیسے وہ کسی گہرا شعبدے یا کسی نشے کے زیرِ اثر نہیں بلکہ اُن کی باتیں اور ان کی حرکتیں شعوری معلوم ہوتی تھیں۔ وہ اب یوں نہیں چلتے تھے جیسے خواب میں چل رہے ہوں اور وہ یوں نہیں بولتے تھے جیسے نیند میں بول رہے ہوں۔ وہ اب مندر سے باہر بھی جاتے تھے اور نارمل انسانوں کی طرح گھومتے پھرتے تھے۔

ایک روز دونوں باہر ایک باغ میں سیر کو گئے۔ انہیں آواز سنائی دی — "التگین!" انہوں نے چونک کر دیکھا۔ ایک جوگی جو ہندو لگتا تھا، اُن کی طرف آ رہا تھا۔ اُس کے ماتھے پر رنگ سے "اوم" لکھا ہوا تھا۔ اُس کے سر پر ہندوؤں کی چُٹیا تھی۔ اس نے قریب آ کر غزنی کی زبان میں کہا — "تمہارے متعلق ہمیں بتایا نہیں گیا۔ کب آئے ہو؟ کہاں ہو؟"

"اوہ!" — التگین نے حیرت سے کہا — "تم بھید ہو؟"

وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ کبھی ایک ہی دستے میں تھے۔ بھید کو جاسوسی کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔ وہ ماہر اور ذہین چھاپہ مار تھا۔ وہ بُغرا خان کو نہیں جانتا تھا۔ التگین نے اس کو بتایا کہ بُغرا خان کون ہے مگر یہ نہ بتایا کہ وہ کس طرح یہاں آئے ہیں۔ بھید یہی سمجھتا

رہا کہ یہ دونوں جاسوسی کے لیے آئے ہیں۔

"سلطان بہت قریب آگیا ہے"۔ عبید نے کہا۔ "تم نے کوئی خبر بھیجی ہے؟"

"تم نے کیا خبر بھیجی ہے؟"۔۔۔ التگین نے پوچھا۔

"زیادہ خطرہ تو یہ ہے کہ پہلے کی طرح دوسرے مہاراجوں کی فوجیں بھی تھانیسر کو بچانے کے لیے جمع ہو جائیں گی"۔ عبید نے انہیں بتایا۔۔۔ "مگر ابھی تک یہاں وہی فوج ہے جو پہلے سے یہاں موجود ہے"۔

التگین نے اُسے بتایا کہ اُس نے بغراخان کے ساتھ مندر کے اندر تک رسائی حاصل کر لی ہے اور وہ ہندو بن کر پنڈتوں وغیرہ کو زیرِ اثر کیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے عبید کو اندھیرے میں رکھا اور اُسے پھر ملنے کے لیے کہہ کر مندر میں آ گئے۔ عبید جب واپس جا رہا تھا تو اُسے ایک آدمی نے روک کر پوچھا کہ وہ کون ہے۔ عبید نے اپنا کوئی ہندوانہ نام بتایا۔ یہ آدمی التگین اور بغراخان کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا تھا۔ وہ جہاں جاتے یہ انہیں پتہ چلے بغیر اُن سے کچھ دور رہ کر اُن پر نظر رکھتا تھا۔

عبید پر اُسے شک ہوا کہ وہ ہندو نہیں۔ عبید نے اُسے کہا کہ وہ لاہور سے آیا ہے اور اس کے ساتھ کچھ اور جوگی بھی ہیں اور انہوں نے جنگل میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ اس آدمی نے کہا کہ وہ اُن کا ڈیرہ دیکھنا چاہتا ہے۔ عبید اُسے ساتھ لے گیا۔ جنگل میں واقعی چار پانچ جوگی اور سنیاسی قسم کے آدمی موجود تھے مگر یہ آدمی جو شک پر انہیں دیکھنے گیا تھا، واپس نہ آسکا۔ عبید اور اس کے ساتھیوں نے اُسے پکڑ کر اُس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ دیئے، خنجر کی نوک اُس کی شہ رگ پر رکھ دی اور پوچھا کہ اُسے عبید پر کس طرح شک ہوا ہے۔

یہ ہندو پہلے تو کچھ بتانے سے گریز کرتا رہا تھا۔ اُسے ایک درخت کے ساتھ اُلٹا لٹکا کر نیچے آگ جلا دی گئی۔ تھوڑی سی دیر میں ہندو کا دماغ ٹھکانے آگیا اور اُس نے چلانا شروع کر دیا۔ اُسے اتار کر بٹھایا گیا۔ اُس نے التگین اور بغراخان کے متعلق ساری کہانی بیان کر دی اور بتایا کہ چونکہ وہ غزنی کی فوج کے کماندار ہیں اس لیے وہ سلطان محمود تک آسانی سے رسائی حاصل کر سکیں گے۔ وہ سلطان کو بتائیں گے کہ وہ ہندوستان کی فوج کی قید سے فرار ہوئے ہیں اور اُن کے پاس بڑا قیمتی راز ہے جو صرف سلطان کو بتایا جائے گا۔ اس طرح وہ سلطان تک پہنچ کر

اُسے قتل کر دیں گے۔

اس آدمی کو انہوں نے رہا نہ کیا۔ جاسوسوں کا یہ گروہ جہاں ٹھہرا ہوا تھا، وہ گھنے جنگل میں ایک ڈھکی چھپی جگہ تھی۔

بغراخان اور التگین جب مندر میں پہنچے تو وہاں کچھ گھبراہٹ اور بھگدڑ سی دیکھی۔ انہیں بتایا گیا کہ غزنی کی فوج آ رہی ہے اور اس کا رُخ تھانیسر کی طرف ہے۔ مندر کے پنڈت اور دیگر لوگ مہاراجہ آنند پال اور دوسرے مہاراجوں کی فوجوں کا انتظار کر رہے تھے مگر کوئی فوج آتی نظر نہیں آتی تھی۔

ان لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ تمام راجوں مہاراجوں کو اطلاع مل چکی ہے کہ سلطان محمود تھانیسر پر حملہ کرنے آ گیا ہے اور وہ اپنی فوجوں کو تیاری کا حکم دے چکے ہیں لیکن سلطان محمود کی پیش قدمی سے یہ لوگ واقف نہیں تھے۔ وہ طوفان کی طرح آ رہا تھا۔ مندر صرف عبادت گاہ نہیں تھی، یہ قلعہ نما تھا اور یہ فوجی ہیڈکوارٹر بھی تھا جس پر پنڈتوں کا سایہ تھا۔ ان کے بھی جاسوس تھے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ سلطان محمود اگر اسی رفتار سے بڑھتا آیا تو وہ ایک دن اور رات میں پہنچ جائے گا۔

بغراخان اور التگین نے مندر میں یہ خبر سنائی کہ انہیں سلطان محمود کا ایک جاسوس ملا ہے اور اس کے ساتھ چند اور آدمی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ کل صبح اُن کی اُس سے پھر ملاقات ہو گی۔

مندر میں جو فوجی تھے، انہوں نے ان دونوں سے کہا کہ وہ اس جاسوس سے ملیں اور اپنے آپ کو جاسوس ظاہر کر کے اُن کا ٹھکانہ دیکھ آئیں تاکہ انہیں پکڑ کر ختم کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ ان دونوں کمانداروں سے کہا گیا کہ وہ کل جاسوسوں کا ٹھکانہ معلوم کر کے اُدھر چلے جائیں جدھر سے سلطان محمود کی فوج آ رہی ہے۔ یہ کہہ کر اُس تک پہنچیں کہ وہ قید سے فرار ہو کر آئے ہیں اور سلطان سے تنہائی میں ملنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اب تقریباً ایک سال کے عرصے میں بغراخان اور التگین بالکل ہی بدل گئے تھے اور یہ تبدیلی ہندوؤں کے عزائم کے مطابق تھی۔ دونوں سدھائے ہوئے جانور بن چکے تھے۔

ان کے ذہن اور ان کی روحیں ان کی اپنی نہیں رہی تھیں۔ عورت کے حسن، شراب اور حیوانی خیالات نے انہیں انسانیت کے درجے سے بھی گرا دیا تھا۔ انہیں کاذن والی دونوں لڑکیوں کے دونوں بت کئی بار دکھائے گئے تھے اور وہ ان کے پجاری بن گئے تھے۔ وہ کسی بھی وقت محسوس نہ کر سکے کہ یہ لڑکیاں زندہ ہیں اور انہیں دکھانے کے لیے چبوتروں پر تمثیل کی طرح کھڑی کی جاتی ہیں۔ لوبان اور اگربتیاں ان کے قدموں میں اس طرح جلائی جاتی ہیں کہ ان کے دھوئیں میں پتہ نہیں چلتا تھا کہ لڑکیاں سانس لے رہی ہیں۔

اب انہیں بتایا گیا کہ سلطان محمود ان بتوں کو توڑنے آگیا ہے تو دونوں آگ بگولہ ہو گئے۔

تھانیسر کی فوج میں ہلچل بچ گئی۔ مندر کے دفاعی مورچے مضبوط ہونے لگے۔ مندر کے اندر اور باہر فوج بھاگتی دوڑتی نظر آتی تھی۔ شہر کے لوگوں پر خوف و ہراس طاری تھا اور شہر کے لوگ تلواریں اور برچھے اٹھائے مندر کے دروازے پر جمع ہو رہے تھے اور فوجی انہیں بتا رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ انہیں لڑائی کے لیے ادھر ادھر تقسیم کیا جا رہا تھا۔

اس ہنگامے میں التگین اور بغرا خان اس باغ میں چلے گئے جہاں عبید ان کا منتظر تھا۔ ان دونوں نے عبید کو دو جھوٹ موٹ کی اہم خبریں سنائیں اور اسے کہا کہ اپنے ٹھکانے پر لے چلے۔ عبید ان کے کہنے کے بغیر بھی انہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا تھا۔ اسے ان دونوں کی اصلیت کا پتہ چل چکا تھا ـــــ وہ انہیں جنگل میں ساتھ لے گیا۔

وہ جونہی اپنے چھپنے کی جگہ پہنچے، تین چار آدمیوں نے انہیں جکڑ لیا اور رسیوں سے باندھ دیا۔ خطرہ یہ تھا کہ ان دونوں کے ساتھ کوئی آدمی ہو گا جیسے کل تھا۔ یہ آدمی ان کے ٹھکانے کی نشاندہی کر سکتا تھا چنانچہ انہوں نے وہاں سے غائب ہو جانے میں عافیت سمجھی۔ کل والے ہندو کو انہوں نے قتل کر دیا اور دونوں کمانڈروں کے ہاتھ بندھے رہنے دیئے، پاؤں کھول دیئے اور انہیں ساتھ لے کر جنگل میں چلے گئے۔

انہیں بہت دور نہ جانا پڑا۔ چند میل گئے ہوں گے کہ انہیں اپنی فوج کا ہراول دستہ مل گیا۔ عبید نے اس کے کمانڈر کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ کمانڈر نے انہیں کہا کہ وہ

آگے جانے کی بجائے یہیں ٹھہریں۔ سلطان تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا۔

سلطان محمود اپنے محافظ دستے کے ساتھ سیلاب کی طرح آ رہا تھا۔ عبید راستے میں کھڑا ہو گیا۔ محافظ دستے کا کمانڈر دوڑ آیا کہ اس فقیر کو راستے سے ہٹائے لیکن یہ فقیر ان کا اپنا آدمی تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ کیوں راستے میں کھڑا ہو گیا ہے۔ اتنے میں سلطان محمود پہنچ گیا اور رک گیا۔ عبید نے اسے ایک خبر تو یہ سنائی کہ تھانیسر کے دفاع میں باہر سے کوئی فوج نہیں آئی اور قلعے پر شہری بھی فوج کے ساتھ کھڑے ہو گئے ہیں۔

"اور یہ دو کمانڈر آپ کے قتل کے لیے تیار کیے گئے تھے۔" عبید نے سلطان محمود کو بتایا اور انہیں جس عمل سے گزارا گیا تھا وہ تفصیل سے سنا دیا۔

"انہیں ساتھ رکھو۔" سلطان محمود نے کہا۔ "انہیں نہ کچھ کھانے کے لیے دو، نہ کچھ پینے کے لیے۔ بھوک سے بے ہوش ہو جائیں تو بھی کچھ نہ دینا۔ اس طرح نشہ آور دوائی کا اثر اتر جائے گا۔ پھر میں انہیں حقیقت دکھاؤں گا۔"

وہ دونوں گم سم کھڑے رہے اور سلطان محمود غزنوی آگے بڑھ گیا۔

سلطان محمود نے دوڑ جیت لی۔ تھانیسر کے فوجی کمانڈر بھی دیکھ رہے تھے کہ غزنی کی فوج پہلے پہنچتی ہے یا راجوں مہاراجوں کی۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کی برق رفتاری نے سب کو حیران کر دیا۔ اس کی کوشش بھی یہی تھی کہ ہندوستان کی فوجوں سے پہلے ہدف پر پہنچے۔ وہ پہنچ گیا۔ اس نے دفاع کا جائزہ لیا اور محاصرے کی بجائے یلغار کا حکم دے دیا۔ دیواروں کے اوپر تیروں کی ایسی بوچھاڑیں ماریں کہ اوپر والے سر نہ اٹھا سکے۔ دروازہ توڑ لیا گیا۔ ہندوؤں کی فوج میں بھگدڑ مچانے کے لیے سلطان نے حکم دے دیا کہ شہر کو لوٹ لیا جائے ـــــ ایسی قیامت بپا ہوئی کہ دفاع ٹوٹ گیا۔

مندر میں جا کر سلطان محمود نے تمام بت باہر پھینک کر توڑ دینے کا حکم دیا لیکن سب سے زیادہ مقدس بت جس کی خاطر تھانیسر سارے ملک کی عبادت گاہ بنا ہوا تھا، جگ سوما تھا۔ اسے وشنو دیوتا کہا جاتا تھا۔ سلطان نے حکم دیا کہ اس بت کو سالم غزنی

بنے جایا جاتے۔ اس حملے کے بعد جب سلطان واپس گیا تو یہ بُت اُس کے ساتھ تھا۔ اُس وقت کے ایک واقعہ نگار راجہ محمد قندھاری کی تحریر کے مطابق اُس بت کو غزنی میں گھوڑ دوڑ کے میدان میں توڑا گیا اور بہت عرصے تک اُس کے ٹکڑے گھوڑوں کے قدموں تلے روندے یا مسلے جاتے رہے اور انہیں اسی میدان کی مٹی میں مل گئے۔

مندر اور شہر کو پوری طرح اپنے قبضے میں لے کر سلطان محمود نے کہا کہ بغرا خان اور التگین کو لایا جائے۔ انہیں اُس کے سامنے لے جایا گیا تو سلطان نے کہا کہ قیدیوں کو لاؤ۔ قیدیوں کی ایک قطار لائی گئی۔ اُس میں پنڈتوں، شعبدہ بازوں اور لڑکیوں کی کافی تعداد تھی۔ سلطان نے اپنے دونوں کمانداروں کو کہا کہ ان لڑکیوں کو دیکھو اور اپنی دیویوں کو الگ کر لو۔ دونوں نے دیکھا کہ وہ دونوں لڑکیاں وہاں موجود ہیں۔ سلطان نے شعبدہ بازوں سے کہا کہ ان لڑکیوں کو ٹوکروں میں غائب کر دو اور پھر انہیں حاضر کرو۔

ٹوکرے منگوائے گئے۔ ایک شعبدہ باز نے لڑکیوں کو ان میں بٹھایا اور اُس نے خالی ٹوکرے دکھا دیئے۔ اس کے بعد اُس نے انہی ٹوکروں میں سے لڑکیاں برآمد کر دیں۔

"یہ ہندوستان کا ایک عام شعبدہ ہے" سلطان محمود نے کہا۔ "اور ہندوؤں کا مذہب بہت بڑا شعبدہ ہے۔ یہ مذہب جسمانی ضرورت تک محدود ہے۔ رُوح تک اس کی رسائی نہیں۔ لذت پرستی اس کا اصول ہے۔ مَیں نے بُت توڑ دیئے ہیں۔ انہیں کہو کہ مجھ پر قہر نازل کریں۔"

بغرا خان اور التگین سُن رہے تھے۔ اُن کے ذہنوں سے نشے کا اثر بھوک اور پیاس نے اتار دیا تھا۔ سلطان بول رہا تھا۔ اور اُسی وقت مندر کے اوپر سے اذان کی بڑی ہی مقدس، بڑی ہی پُرسوز اور وجد آفریں صدا بلند ہوئی۔ سلطان خاموش ہو گیا۔ بغرا خان اور التگین کے جسم کانپنے اور اُن کے آنسو بہنے لگے۔

اذان ختم ہوئی تو سلطان نے ان دونوں سے کہا۔ "میں تمہیں سزا نہیں دوں گا۔ زندہ رہو۔ آزاد رہو اور سب کو بتاؤ کہ دشمن تمہیں صرف تلوار سے نہیں مار سکتا۔ اس کے پاس کچھ اور ہتھیار بھی ہیں جو تمہاری رُوح کو کاٹ دیتے ہیں۔"

سانپ سونا اور انسان

محمد قاسم

فرشتہ لکھتا ہے کہ ۴۰۲ھ (۱۰۱۱ء) کے آخر میں جب سلطان محمود غزنوی تھانیسر کی فتح کے بعد واپس غزنی آیا تو ہندوستانی شہر معلوم ہوتا تھا کیونکہ غزنی کی فوج کی نفری اتنی نہیں تھی جتنی تعداد جنگی قیدیوں کی تھی۔ اُس دور میں جنگی قیدیوں کو غلام کہا جاتا اور انہیں فوجیوں میں عہدوں کے مطابق تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ سلطان محمود جب بھی ہندوستان سے واپس آتا اُسے کے ساتھ دو تین ہزار غلام ہوا کرتے تھے مگر اب کے اس کے ساتھ دو لاکھ غلام تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب فوجی نہیں تھے۔

سلطان نے حکم دے رکھا تھا کہ ان غلاموں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کیا جائے کہ یہ اپنے آپ کو مرتے دم تک غلام اور مویشی سمجھتے رہیں۔ انہیں اسلامی طرزِ بود و باش سے روشناس کرایا جائے اور ان کی قسمت اس طرح بدل دی جائے کہ یہ اپنے گھروں اور عزیز و اقارب کو ہی نہیں، اپنے مذہب کو بھی بھول جائیں اور خود کہیں کہ ہمیں مسلمان بنا لیا جائے۔ اب غلاموں کی تعداد دو لاکھ تھی اس لیے سلطان محمود نے اپنے اس حکم پر سختی سے عمل کرنے کو کہا کہ غلاموں کو انسان سمجھا جائے۔

متعدد مورخین نے لکھا ہے کہ محمود غزنوی کی فوج میں ایک پوری رجمنٹ ہندوؤں کی تھی جس کے افسر بھی ہندو تھے۔ ہندو افسروں کو مسلمان افسروں کی نسبت زیادہ مراعات دی گئی تھیں۔ اس رجمنٹ کو ہندوستان میں لا کر کبھی نہیں لڑایا گیا تھا۔ اسے اُن لڑائیوں میں استعمال کیا جاتا رہا جو سلطان محمود کو اپنے دشمن مسلمان حکمرانوں کے خلاف لڑنی پڑی تھیں۔

غزنی میں اُس رات چراغاں ہوا۔ لوگ ناچ رہے تھے۔ فوجی ناچ رہے تھے۔ غزنی میں جیسے رات آئی ہی نہیں تھی۔ تھانیسر کے مندر سے وشنو دیو کا جو بت لایا گیا تھا اُس کی نمائش سارے شہر میں کی گئی تھی۔ اُس بت کو گھوڑ دوڑ کے میدان میں لے جایا گیا۔ سارا شہر تماشا دیکھنے کو اُمڈ آیا تھا۔ ہندوستان کے جنگی قیدیوں کو بھی میدان میں لے گئے تھے تاکہ وہ اپنے دیوتا کی اصلیت اپنی آنکھوں میں دیکھیں۔ بت کو توڑا گیا اور اس کے ٹکڑے میدان میں بکھیر دیئے گئے۔ جنگی قیدیوں سے (جو سب ہندو تھے) کہا گیا کہ یہ اُن کا خدا نہیں تھا۔ یہ اُن کے مذہبی پیشواؤں کا فریب تھا۔ اگر یہ خدا ہوتا یا اس میں ذرا سی بھی خدائی طاقت ہوتی تو یہ ہم سب کو فنا کر دیتا۔

تکبیر کے نعرے بلند ہوئے۔ ہندو قیدی خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

رات غزنی میں جو رونق اور جو دھما چوکڑی رہی، یہ اس شہر نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سلطان کے محل میں بھی چراغاں تھا مگر سلطان محمود غزنوی واحد آدمی تھا جس کے چہرے پر اداسی تھی۔ وہ اس رونق اور خوشیوں سے تعلق توڑے ہوئے اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے دو آدمی بیٹھے تھے۔ یہ دونوں اُس کے جاسوسی اور فوجی مخبری کے محکمے کے افسر تھے۔ وہ سلطان کو بتا رہے تھے کہ غزنی کے اردگرد کی مسلمان ریاستوں میں کیا ہو رہا ہے۔ سلطان کا سب سے بڑا دشمن ایلک خان تھا۔ وہ سلطان کی غیر حاضری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے غزنی پر فوج کشی کر چکا تھا اور اُسے بڑی ہی شرمناک شکست سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اُس کی نظر خراسان پر تھی۔

"ایلک خان وہ سانپ ہے جو جب تک زندہ ہے ڈسنے سے باز نہیں آئے گا" —— سلطان محمود کو انٹیلی جنس رپورٹ دی جا رہی تھی۔ یہ اطلاعیں سلطان کے وہ جاسوس لائے تھے جو ایلک خان کے فوجی سٹاف میں موجود تھے — "آپ کی غیر حاضری میں ایلک خان نے اپنے بھائی طغان خان اور قادر خان والیٔ قسمہ (؟) کو اکسایا کہ دونوں اس کے ساتھ اتحاد کر لیں اور مل کر خراسان پر حملہ کریں مگر دونوں نے آپ کے خوف سے اس کا اتحادی بننے سے انکار کر دیا۔ ایلک خان نے اپنی فوج کے ساتھ اپنے بھائی طغان خان کے علاقے پر حملے کے لئے پیش قدمی کی لیکن وہ اُزگند تک ہی پہنچا تھا کہ برفباری کا طوفان آ گیا۔ ایلک خان کی فوج کو جان کے لالے پڑ گئے۔ اُس کے سپاہی بھی مرے اور جانور بھی اور اُسے مجبوراً واپس جانا پڑا"۔

"اور طغان خان کے ارادے کیا ہیں؟" — سلطان محمود نے پوچھا۔

"وہ آپ کی طرف مائل ہے" — دوسرے آدمی نے جواب دیا — "ہمارے جو آدمی طغان خان کے دربار میں ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ اُسے جب پتہ چلا کہ ایلک خان نے اُس کے علاقے پر فوج کشی کی کوشش کی تھی اور برفباری نے اُسے آگے نہیں آنے دیا تو طغان خان نے ایلک خان کو پیغام بھیجا کہ اُس نے دوبارہ ایسی کوشش کی تو وہ سلطان محمود کے ساتھ اتحاد کر لے گا"۔

"کیا مجھے طغان پر بھروسہ کرنا چاہیئے؟"

"سلطان عالی مقام!" — اُسے جواب ملا — "کسی کے دل کی بات خدا کے سوا کون جانتا ہے۔ ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ طغان خان آپ کا اتحادی بنے گا"۔

"اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایلک خان جیسے بد طینت انسان سے محفوظ رہنے کے لیے ہماری مدد چاہتا ہے" — سلطان نے کہا — "میں اُس کی مدد کرنے سے گریز نہیں کروں گا لیکن اُس کے ساتھ میری ملاقات ہونی چاہیئے۔ یہ لوگ میرے پاؤں کی زنجیریں بن گئے ہیں ...... طغان خان کو میرا پیغام خفیہ طریقے سے دو کہ میں اُسے ملنا چاہتا ہوں۔ نہ وہ میرے پاس آئے نہ میں اُس کے ہاں جاؤں گا۔ غزنی سے باہر جتنی دُور اور جہاں بھی وہ ملنا چاہے مجھے بتا دے"۔

یہ وجہ تھی کہ سلطان محمود اداس تھا۔ خانہ جنگی کی تلوار اُس کے سر پر لٹک رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ان سانپوں کے سر کچلنا لازمی ہو گیا ہے۔

طغان خان نے سلطان محمود سے ملنے میں پس و پیش نہ کی۔ وہ چار روز بعد غزنی کے مضافات میں ایک جگہ پہنچ گیا۔ وہ جگہ خوشنما تھی۔ ایک چشمہ تھا جس کے اردگرد گھنے سرسبز و شاداب پودے اور گھاس تھی۔ سلطان محمود طغان خان سے بغلگیر ہو کر ملا۔

"کیا یہ صحیح ہے کہ آپ میرے ساتھ اتحاد کرنا چاہتے ہیں؟" — سلطان نے طوغان خان سے پوچھا۔

"میں نے آپ کے پاس اپنا سفیر بھیجنے کا ارادہ کر رکھا تھا" — طوغان خان نے جواب دیا — "اس سے پہلے آپ کا پیغام آ گیا اور میں چلا آیا۔ میں آپ کے ساتھ اتحاد کرنا چاہتا ہوں۔"

"اپنی ریاست کی حفاظت کے لیے یا اس لیے کہ یہ خدا کا حکم ہے کہ مسلمانوں کو متحد ہونا چاہیئے؟" — سلطان نے کہا — "اگر آپ کو اپنی ریاست کی حفاظت درکار ہے تو میں اتحاد سے صاف انکار کروں گا۔ میں صرف خلافت بغداد کے نام پر اتحاد کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ مسلمان حکمران اپنی اپنی ریاستوں کو قائم رکھیں لیکن خلافت کو اپنا مرکز سمجھیں۔ اگر اسلام کو کفار سے بچائے رکھنا ہے تو خلافت کے تحت اتحاد ضروری ہے۔"

طوغان خان کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ آ گئی جس میں مسرت کم، ملال زیادہ تھا۔

"سلطان محترم کو میں بہت دانشمند سمجھتا تھا" — طوغان خان نے کہا — "لیکن معلوم ہوتا ہے آپ میں صرف جنگی دانش اور حکمت ہے.... اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر مذہب کا جنون طاری ہے اور آپ جذبات کے قبضے میں ہیں۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں طوغان خان؟" سلطان محمود نے پوچھا۔

"جس خلیفہ کو آپ اسلام کی مرکزیت اور عظمت کی علامت بنائے ہوئے ہیں وہ اقتدار کا اتنا ہی بھوکا ہے جتنا میرا بھائی ایلک خان اور دوسرے والی اور حکمران جو غزنی اور خراسان پر قابض ہونے کی خاطر آپ سے برسرپیکار رہتے ہیں۔"

"کیا آپ خلیفہ بغداد القادر باللہ عباسی کی بات کر رہے ہیں؟" — محمود غزنوی نے پوچھا۔

"میں جانتا ہوں آپ کو یقین نہیں آئے گا" — طوغان خان نے کہا — "میں کچھ عرصہ پہلے بھی آپ کو اس خطرے سے خبردار کرنا چاہتا تھا لیکن ایک تو اپنے بھائی ایلک خان کے ڈر سے خاموش رہا اور دوسرا خدشہ یہی تھا کہ آپ کو یقین نہیں آئے گا اور آپ میری نیت پر شک کریں گے۔ میں بھی آپ کی طرح خلافت کا معتقد ہوں لیکن اس خلیفہ

کا نہیں جو ایک علاقے کا حکمران بھی ہے اور وہ توسیع پسند ہے۔"

"طوغان خان!" — سلطان محمود نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "خلیفۂ وقت پر الزام لگانے سے پہلے سوچ لو کہ الزام غلط ہوا تو میں اپنی فوج سے تمہاری اس چھوٹی سی ریاست کو کچل ڈالوں گا۔"

طوغان خان ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی میں طنز تھی۔ بولا — "جب انسان پر طاقت کا گھمنڈ سوار ہو جاتا ہے تو وہ اپنی لغزشوں کو بھی دانشمندانہ اقدام کہا کرتا ہے اور ان کے خلاف کچھ سننا گوارا نہیں کرتا سلطان! دماغ کو اس گھمنڈ سے آزاد کریں۔ میں خلیفہ کے خلاف بات کر کے آپ سے کیا حاصل کر سکتا ہوں؟.... میری نیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ کے خلاف یہاں کا کون سا حکمران نہیں لڑا؟ صرف میں ہوں یا والئ قصدار قادر خان۔ ہمارے نہ لڑنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ہم کمزور تھے۔ ہم مل کر آپ کے خلاف ایک طاقت بن سکتے تھے مگر میں اور قادر خان ہمیشہ خانہ جنگی کے خلاف رہے اور ہندوستان پر آپ کے حملوں اور کامیابیوں کے حامی رہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ ایلک خان مجھے آپ کے خلاف اکسا چکا ہے، اور میرے انکار پر...."

"تمہارے علاقے پر فوج کشی کر چکا ہے" — سلطان محمود نے اس کی بات پوری کر دی جو اسے اپنے جاسوس بتا چکے تھے۔ "اور طوغان بردباری نے اسے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ اپنے دربار کی اور اپنی ذاتی زندگی کی بھی کوئی بات مجھ سے پوچھ لو۔"

"اگر آپ کے جاسوس میری زندگی میں بھی موجود ہیں تو آپ کو میری نیت پر شک نہیں ہونا چاہیئے" — طوغان خان نے کہا — "اگر آپ کو شک ہے تو آپ کے جاسوس اور مخبر یہاں کوئی کام نہیں کر رہے، صرف تنخواہ لے رہے ہیں۔"

"کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"

"خلیفۂ وقت القادر باللہ عباسی اقتدار پرست اور توسیع پسند ہے" — طوغان خان نے کہا — "کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ خراسان کا آدھا حصہ اس کی ریاست ہے؟ اور باقی خراسان آپ کا ہے؟.... خلیفہ آپ کے خراسان پر بھی قابض ہونا چاہتا ہے، اور اس مقصد کے لیے وہ ایلک خان کو استعمال کر رہا ہے۔ اسے شہ دے رہا ہے۔ اس

نے ایلک خان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ آپ کے خراسانی علاقے پر فوج کشی کرے تو خلیفہ اُسے در پردہ مالی اور جنگی سامان اور گھوڑوں کی مدد دے گا مگر فوج نہیں دے گا ورنہ آپ کو پتہ چل جائے گا۔ اگر خلیفہ کو قوم یا اُمتِ رسول ؐ کے اتحاد اور وقار کا خیال ہے تو وہ خلافت کی طاقت اور اختیارات کو ایلک خان کے خلاف کیوں نہیں استعمال کرتا؟ وہ آپ کی پیٹھ ٹھونک رہا ہے کہ آپ ہندوستان پر حملے جاری رکھیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ آپ غزنی سے دور رہیں اور آپ کی جنگی طاقت ہندوستان میں گھٹتی رہے۔ خلیفہ اُس دن کے انتظار میں ہے جس دن اُسے اطلاع ملے گی کہ سلطان محمود ہندوستان میں مارا گیا ہے یا پکڑا گیا یا شکست کھا کر کہیں بھٹک رہا ہے۔ امیر عبدالملک، فائق بیگتوزن

ابوالقاسم مجوری اور دارا بن قبوس آپ کے دشمن ہیں۔ ان سب کو آپ کے خلاف متحد کرنے والا خلیفہ القادر باللہ عباسی ہے۔ خانہ جنگیوں کے پیچھے خلیفہ کا ہاتھ ہے۔"

محمود غزنوی کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ جس گدی کو وہ مقدس سمجھتا تھا وہی اُس کی دشمن نکلی۔

"اگر آپ کو ثبوت چاہیے تو میں مہیا کردوں گا۔" طوغان خان نے کہا۔ "سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میرا سفیر آپ کے ہاں پہنچ جائے گا۔ میری فوجی طاقت کچھ زیادہ نہیں، لیکن میرا ایمان مضبوط ہے۔ ایلک خان نے میرے علاقے پر فوج کشی کی تو خدا نے میری مدد کی۔ برفباری کے طوفان نے اُسے پسپا کر دیا۔ وہ ایمان فروش ہے۔"

"جس قوم کا خلیفہ ہی ایمان فروش ہو جائے، وہ قوم ڈاکوؤں اور لٹیروں کا گروہ بن جایا کرتی ہے۔" سلطان محمود نے کہا۔

مشہور مورخ محمد قاسم فرشتہ اور البیرونی لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کو اتنا دل برداشتہ کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ جب طوغان خان سے مل کر واپس غزنی آیا تو اُس کا چہرہ اُترا ہوا اور اُس پر خاموشی طاری تھی۔ اُس کے ہاتھوں سے اُس کی بے چینی ظاہر ہوتی تھی۔ وزیر کے پوچھنے پر بھی اُس نے نہ بتایا کہ طوغان خان کے ساتھ ایسی کیا بات ہوئی ہے جس کا ردِعمل اتنا شدید ہے۔

وہ اُس دور کے ایک ولی ابوالحسن خرقانی کا مرید تھا۔ خرقانی دو روز کی مسافت جتنی دور رہتے تھے۔ سلطان محمود کبھی کبھی جایا کرتا اور کہا کرتا تھا کہ وہاں اُس کی روح کو روشنی ملتی ہے۔ اب وہ اس قدر پریشان تھا کہ اُس کی سوچنے کی صلاحیت ہی جیسے مفلوج ہو گئی ہو۔ مسئلہ ہی کچھ ایسا پیدا ہو گیا تھا۔ خلیفہ کو تو وہ اسلام کی عظمت کی مقدس علامت سمجھتا تھا مگر القادر باللہ عباسی خلافت کی سراپا توہین تھا۔ کبھی اُسے طوغان پر غصہ آتا کبھی خلیفہ پر۔ اُسے یقین آ گیا تھا کہ طوغان خان نے جھوٹ نہیں بولا۔ یہ اُس کے لئے روحانی اذیت تھی۔ اُسے رہ رہ کر پیر و مرشد کا خیال آ رہا تھا۔

وہ اُسی روز ابوالحسن خرقانی سے ملنے کو روانہ ہو گیا۔ علی الصبح کا چلا ہوا دوسرے دن سورج غروب ہونے کے بعد منزل پر پہنچا۔ اُس نے خرقانی کے ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگائے اور بولا۔ "روح عذاب میں ہے۔ کوئی راستہ دکھائیے۔"

"کیا ہندوستان سے شکست کھا کر آئے ہو؟" ابوالحسن خرقانی نے پوچھا۔

"آپ کی دعا سے ہندوستان سے میں کبھی شکست کھا کر نہیں آؤں گا۔" سلطان محمود نے کہا۔ "فاتح سلطان جب بھی شکست کھاتے ہیں، اپنے بھائیوں کے ہاتھوں کھاتے ہیں۔"

"میں اُن بھائیوں سے بے خبر نہیں سلطان محمود!" ابوالحسن خرقانی نے کہا۔ "لیکن خدا تمہارے ساتھ ہے!"

"آپ بے خبر نہیں ہوں گے" — سلطان محمود نے کہا۔ "لیکن آپ یہ سچ ماننے پر آمادہ نہیں ہو سکیں گے کہ خلیفہ القادر باللہ عباسی میرے خلاف خانہ جنگی کو ہوا دے رہا ہے۔ یہ بات مجھے ایلک خان کے بھائی طوغان خان نے بتائی ہے۔"

خرقانی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کہنے لگے۔ "میں اس سے بھی بے خبر نہیں۔ مجھے جب خلیفہ کی نیت کا پتہ چلا اُس وقت تم ہندوستان میں تھے۔ تم نہ آتے تو میں خود تمہیں بلا کر اس خطرے سے آگاہ کرتا۔"

"تو کیا میں یقین کر لوں کہ طوغان خان نے خلیفہ کے متعلق جو انکشاف کیا ہے وہ غلط نہیں؟" — سلطان محمود نے کہا۔ "کیا میں دھوکے میں رہا ہوں کہ خلیفہ رسول مقبول صلعم کا خلیفہ

ہوتا ہے؟"

"وہ خلفا مدت گذری مر گئے ہیں جو صحیح معنوں میں خلفائے رسولؐ تھے"۔۔۔ ابوالحسن خرقانی نے کہا۔ "اُن کے بعد جو آئے اور جو آئیں گے، وہ اپنے نفس کے خلیفہ تھے، اپنے نفس کے خلیفہ ہوں گے۔ موجودہ خلیفہ ایک ریاست کا حکمران بھی ہے۔ سمرقند کا والی بھی وہی ہے۔ اس کا سب سے پہلا اور اس کے لیے سب سے زیادہ اہم مفاد یہ ہے کہ اُس کی بادشاہی محفوظ رہے۔ موجودہ خلیفہ تو دو قدم آگے بڑھ گیا ہے۔ وہ اپنی ریاست کی توسیع کی کوشش میں ہے۔ وہ اُس حکمران کو اپنا دوست بناتا ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے باپ کے دور میں القادر باللہ عباسی نے قرامطیوں کے ساتھ درپردہ دوستانہ گانٹھ رکھا تھا؟ صرف اس لیے کہ قرامطی ایک طاقت بن گئے تھے۔ اس کے بعد جب تم اپنے ایمان اور اپنے عزم کے بل بوتے پر ایک بڑی جنگی طاقت بن گئے اور جب تو نے غزنی پر ہندوؤں کے دو حملے روک کر انہیں اُن کے ملک میں جا کر شکست دی، اور جب تم نے قرامطیوں کی حکومت ختم کر کے اُن کے باطل نظریے کو بھی ختم کر دیا تو اسی خلیفہ نے تمہیں امین السلطنت اور یمین الدولت کے خطاب عطا کر دیئے اور تمہیں اپنا مرید اور معتقد بنا لیا۔ اُسے اِس سے کوئی غرض نہیں کہ تم نے ہندوستان میں جا کر بت توڑے اور اسلام رائج کیا۔ اِسے دراصل تمہاری طاقت سے خطرہ ہے۔ اِس خطرے کا علاج وہ یہ کر رہا ہے، ظاہری طور پر تمہارا دوست بنا ہوا ہے۔ اور درپردہ تمہاری طاقت ختم کرنے کے لئے خانہ جنگی کو ہوا دے رہا ہے"۔

"کیا ایک خلیفہ کو ایسا کرنا چاہیئے؟"

"تم اسے خلیفہ کہہ رہے ہو"۔۔۔ ابوالحسن خرقانی نے کہا۔ "میں تو اسے خلیفہ سمجھتا ہی نہیں، نہ یہ شریعت کی رُو سے خلیفہ ہے۔ خلیفہ کے لیے زہد و تقویٰ بنیادی شرط ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ قوم میں وہ اپنے دوست اور دشمن بنانے والا نہ ہو۔ تیسری شرط یہ ہے کہ اُسے کوئی دنیاوی لالچ نہ ہو۔ اس شرط کی رُو سے وہ آدمی خلیفہ ہو ہی نہیں سکتا جس کی اپنی ریاست ہو۔ حکمران خلیفہ ذاتی دلچسپیوں اور تعصبات کے بغیر رہ نہیں سکتا"۔

"کیا ہم اس خلیفہ کو گدی سے ہٹا نہیں سکتے؟"

"نہیں"۔۔۔ ابوالحسن خرقانی نے جواب دیا۔ "خلافت ایک خاندان کی میراث بن گئی ہے، اور خلافت اب اسلام کی عظمت نہیں رہ، ذاتی اقتدار کی گدی بن گئی ہے۔ اُمتِ رسول صلعم کا شیرازہ بکھرنے کا باعث یہی ہے کہ خلافت کا مطلب اقتدار بن گیا ہے۔ شخصی حکومت بن گئی ہے۔ اب ہر خلیفہ ایسا ہی ہوگا اور قوم کا اتحاد اور وقار ریزہ ریزہ ہوتا رہے گا۔ خلیفے ہاتھ میں قرآن لے کر آئیں گے۔ اپنے دوست اور اپنے دشمن بنائیں گے۔ قوم کے لئے مجسم دھوکہ بنے رہیں گے۔ قوم میں پھوٹ ڈالتے رہیں گے۔ اپنے خوشامدی اور مدح سرا پیدا کرتے رہیں گے، اور قوم عربی اور عجمی، غزنوی اور مصری بنتی جائے گی۔ مسلمان مذہب کو بھی شکی نگاہوں سے دیکھیں گے۔ خلیفہ جو بھی آئے گا وہ امر کل بھی ہوگا"۔

"پھر میرا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیئے؟"۔۔۔ سلطان محمود نے کہا۔ "میں خلیفہ کا خوشامدی نہیں بنوں گا"۔

"خلیفہ کو جتا دو کہ تم اُس کی نیت سے واقف ہو چکے ہو"۔۔۔ ابوالحسن خرقانی نے کہا۔ "محمود! انسان جب ایمان فروشی پر اُتر آتا ہے تو اُسے ایمان والے احمق اور جھوٹے لگتے ہیں۔ تم ہندوستان میں اپنے امیر، حاکم اور سالار چھوڑ آتے ہو۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ اپنے نفس کے دھوکے میں آ جائیں گے۔ انسان میں دو کمزوریاں بہت ہی خطرناک ہیں۔ یہ کمزوریاں ابلیس کی طاقت ہیں۔ ایک جنسی لذت اور دوسری زرپرستی۔ ہندوستان شعبدہ بازوں اور توہم پرستوں کی سرزمین ہے۔ وہاں کا طلسم بڑا ہی خطرناک ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تم ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں کا انتظام جن حکام کے سپرد کر آتے ہو، وہ ایمان فروش نہ ہو جائیں۔ تمہارے لیے بہت خطرے ہیں۔ تمہارے لیے بڑی کڑی آزمائش ہے۔ گھبرا نہ جانا"۔

"تو میں خلیفہ کے کان کھول دوں؟"

"حق کی بات کہنے سے نہ ڈرو"۔۔۔ خرقانی نے کہا۔ "میں بھی اس کے ساتھ بات کرنے کی کوشش کروں گا"۔

واپس آکر سلطان محمود غزنوی نے خلیفۂ بغداد القادر باللہ عباسی کے نام پیغام لکھوایا،

"خراسان کے بیشتر علاقے پر آپ نے قبضہ کر رکھا ہے۔ اس میں بہت سا علاقہ سلطنتِ غزنی کا ہے۔ میں آپ کو نقشہ بنا کر بھیج رہا ہوں۔ میں نے جن علاقوں پر نشان لگائے ہیں، وہاں سے اپنے امرا اور اپنی فوج نکال لیں۔ خلیفہ کو تو کسی خطے کا حاکم ہونا ہی نہیں چاہیئے مگر میں جانتا ہوں کہ آپ میری بات قبول نہیں کریں گے۔ میں احترامِ خلافت کی وجہ سے خاموش رہا۔ اب جبکہ میری آنکھوں سے پردے اُٹھ چکے ہیں میں بہتر سمجھتا ہوں کہ آپ صلح و صفائی سے نشان زدہ علاقے مجھے دے دیں۔ میں امید رکھوں گا کہ اپنے رتبے کا خیال رکھتے ہوئے آپ پس و پیش نہیں کریں گے۔"

مؤرخین محمد قاسم فرشتہ، البرونی اور گردیزی میں اِس واقعہ کو تفصیل سے یوں بیان کیا ہے کہ خلیفہ عبدالقادر باللہ عباسی سلطان محمود کی جنگی طاقت سے اچھی طرح واقف تھا اور وہ سلطان کی فطرت سے بھی آگاہ تھا کہ سلطان جو کرنے پہ آتا ہے وہ کر گزرتا ہے۔ خلیفہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ سلطنتِ غزنی کے لوگ سلطان محمود کے معتقد ہو گئے ہیں چنانچہ خلیفہ نے اس کے پیغام کے جواب میں خراسان کے وہ صوبے جن کا مطالبہ سلطان نے کیا تھا سلطان کو دے دیئے اور وہاں سے اپنے اُمرا اور فوج نکال لی۔

مؤرخین کے مطابق، سلطان محمود مطمئن ہونے کی بجائے طیش میں آگیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ خلیفہ نے اتنی جلدی ہتھیار ڈال دیئے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دیانتدار نہیں اور شاطر ہے۔ سلطان نے بغداد ایک اور قاصد اس پیغام کے ساتھ خلیفہ کو بھیجا۔ "سمرقند پر آپ کا قبضہ ہوا ہے۔ یہ شہر مجھے واپس کریں۔" اس پیغام کے جواب میں خلیفہ نے اپنے ایلچی کو جس کا درجہ سفیر کا تھا سلطان کے پاس بھیجا۔ ایلچی نے سلطان کو یہ پیغام دیا کہ خلیفہ کسی قیمت پر سمرقند سے دستبردار نہیں ہوگا، اور خلیفہ نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر آپ اپنے اس مطالبے پر زور دیں گے تو خلیفہ آپ کو ساری قوم کے سامنے

ذلیل و رسوا کر دے گا۔

"خلیفہ سے جا کے کہو کہ تم یہ چاہتے ہو کہ میں ایک ہزار جنگی ہاتھیوں کے ساتھ دارالخلافہ بغداد میں آؤں؟" ـــــ سلطان محمود نے قہر آلود آواز میں کہا ـــــ "اگر خلیفہ کی یہی خواہش ہے تو اُسے کہہ دینا کہ اُس کے دارالخلافہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا اور ملبہ ہاتھیوں پر لاد کر غزنی لے آؤں گا"۔

ایک انگریز مؤرخ سر ایچ ایچ۔ ہوورتھ نے چند دوسرے مؤرخین کے حوالے سے لکھا ہے کہ خلیفہ سلطان محمود کی اس دھمکی سے بہت بیٹھ گیا۔ اُس کا رتبہ اتنا بلند تھا کہ وہ سلطان محمود کو مجبور کر سکتا تھا کہ وہ قصرِ خلافت سے اس بدتمیزی کی معافی مانگے مگر خلیفہ کی کچھ کمزوریاں ایسی تھیں کہ اُس نے دھمکی کا جواب دھمکی سے نہ دیا بلکہ کچھ ایسا ڈھیلا سا جواب دیا کہ سلطان محمود نے سمرقند شہر میں اپنی فوج داخل کر کے اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔

۱۰۱۲ء آدھا گزر چکا تھا۔ ہندوستان کی طرف سے سلطان محمود مطمئن تھا۔ پنجاب کا مہاراجہ انند پال ابھی زندہ تھا مگر اُس کا ڈنک مار دیا گیا تھا۔ وہ سلطان کا باجگزار تھا۔ سلطان کو ہندوستان سے اطلاعیں مل رہی تھیں کہ وہاں کے راجوں مہاراجوں کی سرگرمیاں اور عزائم کیا ہیں۔ اُسے اطلاع ملی کہ انند پال مر گیا ہے اور اُس کی جگہ راج دربار کی گدی پر اُس کا بیٹا ترلوچن پال بیٹھا ہے۔

تھانیسر کے بت دشتو دیو کی یہ توہین کہ سلطان محمود اُسے غزنی اُٹھا لے گیا تھا، ہندوؤں کے لئے نا صرف نا قابلِ برداشت تھی بلکہ دہشت ناک زیادہ تھی۔ ہندو دیوتاؤں کے قہر سے خطر تھے۔ پنڈت تھر تھر کانپ رہے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ یہ بت انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی وجود میں آیا تھا اور اولین انسانوں نے اس کی پرستش کی تھی۔ یہ بت اب غزنی نے گھوڑ دوڑ کے میدان میں ٹوٹا پڑا تھا، اور اس کے ٹکڑوں کو گھوڑے اور دوڑ کے مقابلے کے رتھ پیس رہے تھے۔ سارے ہندوستان کے مندروں کی گھنٹیاں صبح و شام بجتی تھیں۔ بہت سے پنڈت گنگا کنارے

چلے گئے تھے اور پانی میں کھڑے ہو کر ہری کشن اور بھگوان سے بخشش مانگ رہے تھے۔ آندھی آتی یا بجلی چمکتی تو ہندو ہاتھ جوڑ کر دعائیں بڑبڑانے لگتے تھے۔ اپنے باپ جے پال کے بعد مہاراجہ انند پال اٹھا تو طمطراق سے تھا اور اُس نے سلطان محمود کو دو تین میدانوں میں للکارا بھی تھا مگر ہر بار اُس نے شکست کھائی اور پسپا ہوا۔ سلطان سے دوستی کا اعلان کیا اور اُسے دھوکہ بھی دیا۔ آخر دم چھوڑ گیا۔ بعض مورخ کہتے ہیں کہ اُس کی موت کا باعث پے در پے شکستوں کا غم تھا۔ تھانیسر کے مندر کی تباہی کے بعد وہ اس غم سے جانبر نہ ہو سکا اور اُس کے بیٹے ترلوچن پال نے گدی سنبھال لی۔

انند پال کی موت پر ہندوستان کے چھوٹے بڑے راجے، مہاراجے اور رائے لاہور میں آئے ہوئے تھے۔ اُس کی لاش چتا پر جل رہی تھی۔ قنوج کے راجہ نے بلند آواز سے کہا۔ "آج وہ شخص جل کر راکھ ہو گیا ہے جس کی ساری عمر مندروں کی حفاظت میں اسلام کے خلاف لڑتے گزری۔ یہ واحد شخص تھا جس نے اپنے علاقے سے باہر جا کر محمود غزنوی سے ٹکر لی۔ یہ ہم سب کی بزدلی اور اپنے مذہب سے غداری ہے کہ ہمارے مندروں میں مسلمان اذانیں دے رہے ہیں۔ آؤ! انند پال کے جلتے ہوئے جسم کے شعلوں کی تپش میں عہد کریں کہ ہمیں اپنے مندروں کی آبرو بحال کرنی ہے اور مسجدوں کو مندر بنانا ہے۔"

"میں عہد کرتا ہوں" — کالنجر کے راجہ نے کہا۔ "کہ وشنو دیوتا کی توہین کا انتقام غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجا کر لوں گا۔"

ہر ایک راجہ اور مہاراجہ نے، پنڈت اور رشی نے جلتی ہوئی چتا کے قریب ہو کر عہد کیا کہ وہ اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے اپنی فوج کی لاشوں کا بند باندھے گا۔ یہ الفاظ ہر ایک نے کہے کہ وہ مسجدوں کو مندر اور مسلمانوں کو ہندو اور غزنی کو مہابھارت کی راجدھانی بنائے گا۔ انند پال کا جانشین ترلوچن پال پیچھے کھڑا آنسو بہا رہا تھا۔

"راجکمار ترلوچن پال کو بھی جو اب مہاراج ہیں، کچھ کہنا چاہئے" — ایک رشی نے کہا۔ "اب مہاراج کو غم کا بوجھ اتار پھینکنا چاہئے۔ راجپوت آنسو نہیں خون بہایا

کرتے ہیں۔"

جواں سال ترلوچن پال آگے آیا۔ اپنے باپ کی چتا کے شعلوں کو دیکھا پھر سب کی طرف دیکھا۔

"آپ میں کتنے ایسے ہیں جنہوں نے اپنے عہد پورے کئے ہیں؟" — ترلوچن پال نے کہا۔ "آپ نے اسلام کے آگے لاشوں کا بند پہلے کیوں نہ باندھا؟ جب سلطان تھانیسر کی طرف بڑھ رہے تھے، اُس وقت آپ سب کہاں تھے؟ یہاں کی مسجدوں کو مندر اور یہاں کے مسلمانوں کو ہندو بنا لینا کوئی مشکل نہیں لیکن راجپوت توہین برداشت نہیں کیا کرتے۔ آپ میرے باپ کی تعریفیں کر رہے ہیں لیکن ہر لڑائی میرے باپ کو اپنے علاقے میں لڑنی پڑی۔ آپ میں سے کون ہے جس نے ہمیں اپنی فوج کی کمک دی ہو۔ اس لئے دی تھی کہ ہم پشاور اور لمغان کے درمیان روکے رکھیں؟...... آپ کے پاس صرف الفاظ ہیں۔ آپ خطرے کے وقت اپنی فوجیں ہمیں اس لئے دے دیتے ہیں کہ سلطان محمود غزنوی کو ہم اپنے علاقے میں روکے رکھیں اور آپ کی راجدھانیاں محفوظ رہیں۔"

"مہاراج!" — ایک مہاراجہ نے پوچھا۔ "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ میں اپنی ریاست کو محفوظ رکھنے کے لئے سلطانوں کو اپنا دوست سمجھوں گا" — ترلوچن پال نے کہا۔ "محمود نے حملہ کیا تو مقابلہ کروں گا مگر یہاں کے مسلمانوں پر ہاتھ نہیں اُٹھاؤں گا۔"

"تو کیا آپ محمود کے باجگزار رہیں گے؟" — مہاراجہ قنوج نے پوچھا۔

"ہاں!" — ترلوچن پال نے جواب دیا۔ "میں باج دیتا رہوں گا۔"

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہاں کے مسلمان غزنی کے سلطان کے وفادار اور جاسوس ہیں؟" — مہاراجہ کالنجر نے کہا۔

"کیا آپ کو معلوم نہیں کہ غزنی کی فوج میں ہزاروں ہندوؤں کا بھی دستہ ہے؟" — ترلوچن پال نے کہا۔ "ان میں سے کتنے ہیں جو وہاں سے فرار ہو آئے ہیں؟ ان کے پاس گھوڑے ہیں، ہتھیار اور ہاتھی ہیں۔ وہاں وہ آزاد ہیں۔ وہ وہاں سے بھاگ کیوں نہیں آتے؟..... یہاں کے بہت سے مسلمان ہمارے وفادار ہیں۔"

ایک جوان سال خوبصورت عورت عورتوں کے ہجوم میں سے نکل کر ترلوچن پال کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اُس نے ترلوچن پال کی نیام سے تلوار کھینچ لی اور تلوار بلند کر کے بولی "تم سب جانتے ہو کہ میں اس شخص کی بیوی ہوں جو مسلمانوں کو اپنا دوست کہہ رہا ہے۔ یہ مجھے اُٹھا کر اپنے باپ کی چتا میں پھینک دے۔ چاہے تم مجھے اِسی تلوار سے کاٹ دو۔ میں اعلان کرتی ہوں کہ میں راجپوت کی بیٹی ہوں میرا باپ مسلمانوں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا ہے۔ میں اپنے مذہب کی توہین کا اور اپنے باپ کے خون کا انتقام لوں گی۔ آج سے میں نے اپنے اس خاوند کے ساتھ اپنا جسمانی تعلق توڑ دیا ہے۔ یہ بُزدل ہے جو غزنی کے سلطان کا باجگزار رہنے کا اعلان کر رہا ہے"۔

ترلوچن پال اُس کی طرف لپکا مگر ایک اور جوان سال آدمی تلوار سونت کر دونوں کے درمیان آ گیا۔ وہ بھیم پال تھا۔ ترلوچن پال کا چھوٹا بھائی۔ تمام تاریخ نویسوں نے اس کا نام بھیم پال نڈر لکھا ہے اور کہا ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر نڈر یعنی بے خوف اور دلیر تھا۔

"خبردار ترلوچن پال!" — اُس نے کہا "یہاں تمہیں کوئی ایک بھی آدمی ایسا نہیں ملے گا جو تمہارا ساتھ دے گا۔ اگر اِس عورت پر تم نے ہاتھ اٹھایا تو میں بھول جاؤں گا کہ تم اس کے خاوند اور میرے بھائی ہو۔ میں ہوں اپنے باپ کی گدی کا وارث۔ اس گدی پر وہ بیٹھ سکتا ہے جو اس کی توہین کا انتقام لینے کے قابل ہو گا" — اُس نے سب کی طرف دیکھا اور تلوار بلند کر کے پوچھا "اگر میں غزنی کے سلطان کو باج نہ دینے کا اعلان کر دوں اور اگر میں وشنو دیوکی توہین کا انتقام لینے کی قسم کھا لوں تو کیا آپ مجھے اپنے باپ کی گدی کا وارث تسلیم کریں گے؟"

"تم یقیناً مہاراج جے پال اور مہاراج انند پال کے جانشین ہو" — ایک پنڈت نے کہا۔

پھر ایک شور اُٹھا "ترلوچن پال کو ہٹا دو .... ترلوچن پال سے تلوار لے لو۔ نڈر مہاراج کی جے ہو ..."

یہ شور بلند ہوتا چلا گیا۔ انند پال کی چتا کے شعلے اور زیادہ بلند ہو گئے۔ جلتی ہوئی

لکڑیوں کی تڑاخ تڑاخ ہیبت ناک ہو گئی۔ اور ترلوچن پال جو دراصل بزدل نہیں بلکہ امن پسند اور حقیقت بیں تھا، اس شور اور شعلوں میں ڈوب گیا۔ اس کی حیثیت ایک راہگیر کی سی رہ گئی۔ بھیم پال نڈر اُسی وقت سے پنجاب کا راجہ بن گیا۔

اُسی رات راج محل میں تمام راجوں، مہاراجوں اور پنڈتوں کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں ترلوچن پال نہیں تھا۔ اس کا بھائی بھیم پال گفتگو کی قیادت کر رہا تھا۔ سب سے بڑے پنڈت نے تجویز پیش کی کہ تمام مسجدیں مسمار کر دی جائیں اور مسلمانوں کو مجبور کر دیا جائے کہ غزنی چلے جائیں یا ہندو بن جائیں۔

"یہاں میں اپنے بھائی ترلوچن پال کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہم نہتوں پر ہاتھ نہیں اٹھائیں گے" — بھیم پال نے کہا — "ہم دشمن نہیں دوست پیدا کریں گے۔ مسجدوں کو ہم نے گرا بھی دیا تو کیا ہو گا۔ مسلمان جہاں کھڑا ہو کر نماز پڑھتا ہے، وہی اس کی مسجد ہوتی ہے۔ ہمیں سلطان محمود جیسے طاقتور جنگجو سے لڑنا ہے۔ میں ہندوستان کی تاریخ میں اپنے نام کے ساتھ یہ یاد نہیں چھوڑنا چاہتا کہ بھیم پال نے غزنی کے سلطان سے شکست کھائی اور نہتے مسلمانوں سے انتقام لیا"۔

"ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ جس طرح ہماری عبادت گاہیں تباہ ہوئی ہیں اس کا یہ اثر ضرور پڑے گا کہ ہندو اسلام کی طرف راغب ہونے لگیں گے" — ایک پنڈت نے کہا "لوگ دیوتاؤں کے قہر سے ڈر رہے ہیں مگر ابھی تک قہر نہیں آیا۔ ہمیں خود قہر بن کر غزنی کی فوج پر گرنا ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ جنہیں مسلمان بُت کہتے ہیں، یہ ہمارے دیوتا ہیں اور ان کی توہین کرنے والا زندہ نہیں رہ سکتا"۔

کسی نے یہ بھی مشورہ دیا کہ جن قلعوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہے انہیں محاصرے میں لے لیا جائے، مگر دو مہاراجوں نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ محمود غزنوی اپنی پوری جنگی طاقت سے آ جائے گا۔ اس کے لیے ہمیں تیاری کی ضرورت ہے۔ ہمیں تیاری کے لیے وقت چاہیئے، پھر ہم محمود کو ہندوستان میں گھسیٹ کر کسی بڑی ہی مشکل جگہ لائیں گے اور اُسے

گے ہم ایسے پھندے میں لائیں گے۔

"اس دوران کیا ہمیں یہ کوشش نہیں کرنی چاہیئے کہ ہم بھیرہ، ملتان اور تھانیسر کے مسلمان سالاروں اور حکام کو ہاتھ میں لیں تاکہ وہ سلطان محمود کے وفادار نہ رہیں" — بھیم پال کے وزیر نے کہا۔ وہ بڑا ہی دانشمند اور تجربہ کار وزیر تھا۔ اس نے کہا — "ہمارے پاس طریقے موجود ہیں جن سے ہم ان حکام کو بیکار کر سکتے ہیں"۔

"یہ مسلمان اپنے ایمان اور کردار کے بڑے پکے ہوتے ہیں" — بھیم پال نے کہا — "مجھے امید نہیں کہ آپ ان کے سالاروں اور حاکموں کو اپنے ہاتھ میں لے سکیں گے"۔

وزیر نے ہنس کر کہا — "مسلمان بھی انسان ہوتے ہیں۔ ہر انسان اوتار اور پیغمبر نہیں ہوتا۔ ہر انسان میں ایک سی کمزوریاں اور ایک سی خواہشیں ہوتی ہیں۔ جو انسان انہیں دبا لیتے ہیں، وہ رشی منی اور مولوی کہلاتے ہیں۔ ہم ان میں یہی کمزوریاں، خواہشیں اور نیچے بیدار کر کے انہیں پستیوں میں گرا سکتے ہیں ... ہم یہ کام تھانیسر سے شروع کریں گے"۔

اس کانفرنس میں ایک فیصلہ یہ ہوا کہ محمود غزنوی کے خلاف جنگی تیاریاں شروع کر دی جائیں اور دوسرا یہ کہ اس کے سالاروں وغیرہ کو ہاتھ میں لینے کی مہم کا آغاز کر دیا جائے۔ ان تیاریوں کے بعد بھیم پال کو سلطان محمود غزنوی کو یہ پیغام بھیجنا تھا کہ وہ غزنی کا باجگزار نہیں اور انند پال نے سلطان کے ساتھ دوستی کا جو معاہدہ کیا تھا، وہ منسوخ کیا جاتا ہے۔

سلطان محمود غزنوی اپنے تجربہ کار سالاروں عبداللہ الطائی، التون تاش اور ارسلان جاذب کو اپنے ساتھ لے گیا تھا کیونکہ وہاں کی جنگیں اس کے لیے زیادہ خطرناک تھیں۔ ہندوستان میں وہ جن سالاروں کو چھوڑ گیا تھا، وہ تھے تو اچھے جرنیل لیکن ان تین سالاروں کے پائے کے نہیں تھے جنہیں سلطان اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ان پر شہری انتظامیہ کے حاکم مقرر کر دیئے گئے تھے۔

تھانیسر میں بہرام غور سالار تھا اور شہری حاکم قطب گزک تھا۔ وہ پہلی بار ہندوستان میں آئے تھے۔ انہیں یہاں کی ہر چیز عجیب لگتی تھی۔ انہوں نے یہ شعبدہ بھی دیکھا تھا کہ دو لڑکیوں کو دو ٹوکروں میں بٹھایا گیا اور خالی ٹوکرے دکھا دیئے گئے۔ پھر لڑکیوں کو انہی

ٹوکروں میں سے برآمد کیا گیا۔ نسوانی حسن کے لحاظ سے غزنی بھی خوبصورت علاقہ تھا لیکن ہندوستان کا حسن انہیں زیادہ جاذب لگا۔ انہیں بتایا گیا کہ ہندوستان طلسماتی سرزمین ہے اور یہاں یہ بتانا مشکل ہے کہ شعبدہ کیا اور کرامات کون سی ہے۔ ان کے لیے سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ یہاں لوگ سانپوں کی بھی پوجا کرتے تھے اور عورتیں سانپوں کو دودھ پلاتی تھیں۔

ایک روز تھانیسر قلعے میں سات آٹھ راہب آئے۔ ان کے ساتھ چار جوان لڑکیاں تھیں۔ ان سب کا لباس ایک ایک سفید چادر تھی جو مردوں کے کندھوں سے ٹخنوں تک گئی ہوئی تھی۔ لڑکیوں کا لباس بھی یہی تھا اور ان کے سروں پر باریک کپڑے کی اوڑھنیاں تھیں۔ ان لڑکیوں کے رنگ گورے، آنکھیں شربتی اور بال گہرے بادامی تھے۔ ان کے نقش و نگار میں کشش تھی۔ مردوں کی داڑھیاں تھیں۔ ان میں ایک سفید ریش تھا۔

شام کے بعد کا وقت تھا جب یہ گروہ قلعے میں داخل ہوا۔ یہ لوگ راہب اور پُراسرار لگتے تھے۔ انہوں نے قلعہ دار سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور وجہ یہ بتائی تھی کہ ان کے ساتھ جوان لڑکیاں ہیں اس لیے وہ سرائے میں ٹھہرنے سے ڈرتے ہیں۔ انہیں لڑکیوں کے لیے محفوظ رہائشی جگہ کی ضرورت تھی۔ انہیں قلعہ دار قطب گزک تک جانے اجازت دے دی گئی۔ انہیں قلعہ دار کی طرف جاتا دیکھ کر سالار بہرام اور اس کا نائب بھی اس عجیب مخلوق کو دیکھنے چلے گئے۔ یہ لوگ لباس سے عجیب لگتے تھے۔ عجوبہ ایک تو یہ تھا کہ مرد بھی خوبصورت تھے اور لڑکیاں ان سے زیادہ حسین تھیں۔ دوسرا عجوبہ یہ تھا کہ ان میں جو سفید ریش تھا اس کے گلے کے گرد گز سوا گز لمبا سانپ لپٹا ہوا تھا۔ یہ سیاہ ناگ تھا جو اپنا منہ سفید ریش کے چہرے پر اور کبھی سر پر پھیرتا تھا۔ مردوں کے پاس بڑے خوبصورت عصا تھے۔ ہر عصا کے اوپر سانپ کا پھن بنا ہوا تھا۔ لڑکیوں کی گردنوں سے رنگدار رسیاں لٹک رہی تھیں اور رسیوں کے سروں سے باریک گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ لڑکیاں چلتی تھیں تو گھنٹیاں دھیمی آواز سے اس طرح بجتی تھیں جیسے ندی کا پانی پتھروں سے گزر رہا ہو۔

قطب گزک نے ان کا خیر مقدم کیا اور احترام سے بٹھایا کیونکہ وہ شکل و صورت

اور لباس سے قابلِ احترام لگتے تھے۔

"ہم شاید آپ کے دربار میں آنے کی جرأت نہ کرتے" سفید ریش نے کہا۔ "لیکن ہم آپ پر اعتماد کر سکتے ہیں کیونکہ آپ ایک باطل مذہب کے دشمن ہیں۔ ہمیں دلی خوشی ہے کہ آپ باطل کو کچل رہے ہیں۔ آپ یقیناً اونچے کردار کے لوگ ہیں۔"

"آپ کا مذہب کیا ہے؟" سالار سبرام نے پوچھا۔

"ہم سانپوں کے پجاری ہیں" سفید ریش نے کہا۔ "اور اس کے ساتھ ہی ہم ایک خدا کو مانتے ہیں۔ ہمارا حسب نسب اُن یونانیوں سے ملتا ہے جو سکندرِ اعظم کے ساتھ ہندوستان میں آئے تھے۔ وہ یونانیوں کا خاص فرقہ تھا جو سانپوں کا پجاری تھا۔ ان کے متعلق ایک روایت ہے کہ وہ ہمیشہ ایک شیش ناگ کی تلاش میں رہتے تھے جو انہیں یونان میں نہ مل سکا۔ یہاں ہندوستان میں انہیں مل گیا۔ وہ سکندرِ اعظم کی فوج سے الگ ہو گئے اور شیش ناگ کے پیچھے چل پڑے۔ روایت ہے کہ یہ ناگ اُن کے لیے خدا نے بھیجا تھا۔ اُس کا رنگ لال اور سنہری تھا۔ اُس کے سر پر کلغی تھی اور وہ ایک سیاہ ہرن کی پیٹھ پر سوار تھا....

"شیش ناگ آگے آگے چل پڑا۔ ہمارے آباؤ اجداد کے چند آدمی اُس کے پیچھے گئے۔ وہ ایسے دشوار گذار علاقے میں چلا گیا جہاں عام انسان نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں چٹانیں ہیں جو اوپر سے تلوار کی دھار کی طرح ہیں۔ دریائے جمنا کی ایک شاخ اس علاقے میں سے گذرتی ہے۔ اس کے اوپر قدرت کا بنایا ہوا پل ہے جو دریا کی چوڑائی جتنا لمبا پتھر ہے۔ چوڑائی میں لکڑی کے شہتیر کی طرح ہے۔ اس پر ایک انسان کا پاؤں آ سکتا ہے۔ گرنے کا خطرہ ہر قدم پر ہے۔ نیچے دریا تنگ ہے کیونکہ پہاڑوں کے درمیان سے گذرتا ہے۔ گہرائی بہت زیادہ اور بہاؤ بہت تیز ہے....

"شیش ناگ اس کے اوپر سے گذر گیا۔ چار آدمی اس کے پیچھے گئے۔ دو پھسل کر گر پڑے اور دریا انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔ دو آدمی پار جا پہنچے۔ وہ ایک خوشنما جگہ تھی جو ناگوں کی بستی تھی۔ ہمارے آباؤ اجداد وہیں آباد ہو گئے۔ ہم وہیں سے آئے ہیں۔ ہم سانپوں میں رہتے ہیں۔"

"کیا آپ سانپ کو خدا مانتے ہیں؟"

"خدا تو ہم خدا کو ہی مانتے ہیں" سفید ریش نے کہا۔ "لیکن سانپ کو ہم اس لیے لائقِ پرستش سمجھتے ہیں کہ یہ خدا اور انسان کے رابطے کا ذریعہ ہے۔ یہ شیطان بھی ہے فرشتہ بھی ہو ہے اور پتھر کو سونا بنانے کی طاقت اور کرامات کس کے پاس ہے؟ صرف سانپ کے پاس۔ یہ ایک خاص قسم کا سانپ ہوتا ہے۔ اگر اس کی عمر ایک سو سال پوری ہو جائے تو اس کے جسم میں ایک گولی پیدا ہو جاتی ہے جو چمکتی ہے۔ اسے کوئی منی کہتا ہے کوئی منکا۔ سانپ اسے ہر وقت منہ میں رکھتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اس کے ساتھ کھیلتا ہے۔ گولی کو ہوا میں اچھالتا اور اسے پکڑ لیتا ہے۔ یہ گولی اگر لوہے کے ٹکڑے پر رگڑو تو لوہا سونا بن جائے۔ اسے اپنی تلوار پر رگڑیں تو تلوار سونا بن جائے مگر آج تک کوئی انسان یہ گولی حاصل نہیں کر سکا۔ رات کو سانپ سو نہیں سکتا۔ وہ گولی منہ سے نکال کر زمین پر رکھتا ہے اور اس پر کنڈلی مار لیتا ہے۔ تب اسے نیند آتی ہے....

"ایسا سانپ صدیوں بعد سننے میں آیا ہے اگر صرف سننے میں آتا ہے۔ اسے دیکھا کسی نے نہیں۔ اس کا منکا آج تک کوئی حاصل نہیں کر سکا۔ اسے کوئی حاصل کر بھی نہیں سکتا۔ ہندوستان میں مشہور ہے کہ یہ منکا جس کے ہاتھ آ جائے گا۔ وہ سارے ہندوستان کا بادشاہ ہو گا۔ شیش ناگ بھی اس کا غلام ہو گا اور اُس کے محل، اس کی راجدھانی اور اُس کے قلعوں کی حفاظت سانپ کریں گے۔ وہ ساری دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند بادشاہ ہو گا۔"

"کیا آپ نے یا آپ کے آباؤ اجداد میں سے کسی نے یہ سانپ اور اس کا منکا دیکھا ہے؟"

"نہیں" سفید ریش نے جواب دیا۔ "ہمارے خطے میں منکے والا سانپ موجود ہے لیکن وہاں تک ہم میں سے کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ کوئی وہاں جانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔ ہم وہ جگہ جانتے ہیں جہاں وہ سانپ ہے لیکن اُس تک پہنچنے کے لیے راستہ اس قدر خطرناک ہے کہ کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہمیں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہاں ہر ناگ پھرا

ہُوا ہے اور وہاں ہیرے اور جواہرات ہیں اور ہمارے پروہت کہتے ہیں کہ وہاں جو لڑکیاں ہیں، انہیں دیکھ کر کوئی یقین سے کہہ نہیں سکتا کہ یہ اس دنیا کی لڑکیاں ہیں باہر کی دنیا والوں کو اس خطے کے متعلق علم ہے لیکن سب کہتے ہیں کہ وہاں جو لڑکیاں ہیں انسان نہیں ناگنیں ہیں جنہوں نے اپنا روپ بدل رکھا ہے۔ یہ غلط ہے۔ وہ ہماری نسل کی لڑکیاں ہیں۔ وہ جس قدر حسین ہیں اتنی ہی بدنصیب ہیں عمر کے ایک حصے تک وہ خوش رہتی ہیں مگر آگے چل کر وہ اداس رہنے لگتی ہیں کیونکہ انہیں مرد کی رفاقت میسر نہیں آتی۔"

سفید ریش ایسے انداز سے اس طلسم ہوشربا کی باتیں سنا رہا تھا کہ قلعہ دار قطب گزک اور سالار بہرام اور اس کے نائب سالار کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ اُن کے سامنے چار لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان سب کے ہونٹوں پر تبسم تھا غزنی کے یہ حکام ان لڑکیوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ ان سے زیادہ خوبصورت بھی کوئی لڑکی ہو سکتی ہے! انہوں نے مہمانوں کی خوب خاطر مدارت کی اور ان کی رہائش کا شاہانہ انتظام کر دیا۔

وہ سب سونے کے لیے چلے گئے تھے مگر سفید ریش کو قطب گزک نے اپنے پاس بٹھا رکھا تھا۔ وہ سفید ریش سے اُس خطے کے بھید لے رہا تھا اور سفید ریش اُسے کہہ رہا تھا کہ سارے ہندوستان کی بادشاہی کا راز ناگوں کے اس خطے میں ہے جہاں کوئی اجنبی نہیں جا سکتا، اور جانے کی جرأت بھی کوئی نہیں کرتا۔

"کیا وہاں تک پہنچا جا سکتا ہے؟" قطب گزک نے پوچھا اور ذرا جھجک کر بولا ــــ "مجھے دولت کی ضرورت نہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ کتنا بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بڑھاپے کی بیماریوں نے حملے شروع کر دیئے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ہندوستان کے پہاڑی علاقوں میں ایسی جڑی بوٹیاں ہیں ....."

"جو بڑھاپے کے عمل کو روک دیتی ہیں ــــ" سفید ریش نے اس کی بات پوری کرتے ہوئے کہا "میرے بال سفید ہو گئے ہیں، لیکن میرے جسم کو ہاتھ لگائیں، جوانوں جیسا مضبوط اور توانا ہے اور میری عمر ایک سو سال سے زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ نے ٹھیک سنا ہے ہمارے خطے میں ایسی بوٹی ہے جس میں سانپوں کا زہر ملا ہوا ہے۔ صرف ہم لوگ اس بوٹی سے آگاہ

ہیں۔ یہ صرف جوان ہی نہیں رکھتی بلکہ بڑی لمبی عمر دیتی ہے۔"

قطب گزک کا خیال تھا کہ ان لوگوں سے وہ اکیلا ہی راز لے رہا ہے، لیکن سالار بہرام جہاں دیدگی کا خوبصورت مجسمہ تھا، اس عجیب و غریب گروہ کے ایک آدمی اور ایک لڑکی کو اپنے کمرے میں بٹھائے ہوئے پوچھ رہا تھا کہ کیا وہ اسے اپنے ساتھ اپنے خطے میں لے جا سکتے ہیں؛ وہ آدمی اسے بتا رہا تھا کہ وہ اپنے فرشتے اور عقیدے کے ساتھ غداری نہیں کر سکتا۔ وہ باتیں کرتے کرتے کسی بہانے باہر نکل گیا اور لڑکی اس کے پاس اکیلی رہ گئی۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ بہرام نے اس کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ لڑکی نے اُسے کہا کہ اس نے اس سے زیادہ خوبصورت اور تنومند آدمی کبھی نہیں دیکھا۔

"تم تو جنت میں رہتی ہو" ــ بہرام نے کہا۔

"وہ جنت نہیں جہنم ہے جہاں اپنے جذبات کچلنے پڑیں" ــــ لڑکی نے کہا۔ "ہماری زندگی ان راہبوں کے ساتھ گزر رہی ہے۔ یہ مردہ دل لوگ ہیں۔ مجھے آپ کی عورتوں جیسی زندگی چاہیئے۔"

یہاں سے بات چل کر اُس مقام تک جا پہنچی جہاں دل تو دو ہوتے ہیں لیکن دو جسموں کی جان ایک ہو جاتی ہے۔ لڑکی نے والہانہ محبت کا اظہار کیا تو بہرام نے اس سے پوچھا کہ سانپ کے منکے کا قصہ کہاں تک درست ہے؛ لڑکی نے اُسے بتایا کہ وہ ساتھ چل کر اُس کی راہنمائی نہیں کر سکتی، اُسے راستہ سمجھا سکتی ہے۔ چنانچہ اُس نے راستہ سمجھانا شروع کر دیا اور بہرام کاغذ پر لکیریں ڈالتا گیا۔

"آپ کے پاس تیروں کا ذخیرہ ہونا چاہیئے" ــ لڑکی نے کہا۔ "وہاں آپ کو قدم قدم پر سانپ نظر آئیں گے۔ آپ انہیں تیروں سے مار سکتے ہیں۔ میں نے آپ کو جو سرنگ بتائی ہے اس کے دہانے پر ایک اژدھا کُنڈلی مارے بیٹھا ہو گا۔ اس کے سر پر تیر لگے تو مر جائے گا۔ جسم پر کہیں بھی تیر لگا تو یہ آپ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ سرنگ بہت لمبی ہے۔ اس میں سے آپ گزر گئے تو آپ کو شفاف پانی کا ایک چشمہ نظر آئے گا۔ اس کے کنارے پر آپ کو وہ سانپ نظر آئے گا جس کے پاس وہ منکا ہے وہ اس کے ساتھ کھیل رہا ہو گا۔ اسے بھی آپ تیر سے مار سکتے ہیں پھر منکا آپ کا ہو گا۔"

"اور تم مجھے کہاں ملو گی؟"

"میں آپ کو مل جاؤں گی"۔ لڑکی نے جواب دیا۔

دوسرے دن ناگ پرستوں کا یہ گروہ روانہ ہو گیا اور اپنے پیچھے پُراسرار سا ہیجان چھوڑ گیا۔

قطب گزک نے اپنے محافظوں میں سے دو کو بلایا۔ یہ دونوں اُس کی نظر میں قابلِ اعتماد اور دلیر تھے۔ اس نے اُن سے کہا۔ "میں نے تمہیں قلعہ دار کی حیثیت سے نہیں، راز دار دوست کی حیثیت سے بلایا ہے۔ اگر میرا ایک کام کر دو تو میں تمہیں عہدے دے کر غزنی بھیج دوں گا۔ اگر تم فوج سے نکل جانا چاہو گے تو تمہیں نکال دوں گا۔ تم جب یہاں سے جاؤ گے تو تمہارے پاس اتنا سونا ہو گا کہ تمہاری سات پشتیں کوئی کام کیے بغیر عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں گی۔ شرط یہ ہے کہ تم یہ راز کسی کو نہیں دو گے کہ تم کہاں جا رہے ہو۔ میں تمہیں ایک خاص لباس میں بھیجوں گا۔"

دونوں نے رضامندی ظاہر کر کے وعدہ کیا کہ وہ کسی کو پتہ نہیں چلنے دیں گے کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ قطب گزک نے ان کے آگے ایک نقشہ رکھ دیا اور انہیں راستہ بتانے لگا۔ جوں جوں محافظ راستہ سنتے جا رہے تھے، ان کے رنگ اُڑتے جا رہے تھے۔

"تم نے کل رات وہ لوگ دیکھے ہوں گے جو سفید چادروں میں ملبوس یہاں آئے تھے"۔ قطب گزک نے کہا۔ "اگر تم اس مقام سے دریا پار کر گئے تو تمہیں وہ سفید پوش آدمی ملے گا جو رات یہاں آیا تھا۔ اس کے بعد تمہارا کام آسان ہو جائے گا۔ وہ تمہیں ایک بُوٹی اور بہت سا سونا دے گا۔ یہ تم لے کے میرے پاس آ جاؤ گے۔ بُوٹی مجھے دے دینا اور سونا تم اپنے پاس رکھ لینا۔"

"یہ بوٹی کیسی ہے؟" — ایک محافظ نے پوچھا۔

"ایک بار کھا لو تو انسان ایک سو سال سے زیادہ بھی زندہ رہ سکتا ہے"۔ قطب گزک نے کہا۔ "اور مرتے دم تک انسان جوان رہتا ہے۔"

دو محافظوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مُسکرا دیئے جیسے انہیں سونے

سے زیادہ اس بُوٹی کے ساتھ دلچسپی تھی۔

"دراصل جانا مجھے خود چاہیے تھا"۔ قطب گزک نے کہا۔ "سفید پوش ناگ پرست نے کہا تھا کہ میں خود جاؤں لیکن تم جانتے ہو کہ قلعہ دار اتنے عرصے کے لیے کس طرح غیر حاضر ہو سکتا ہے۔ مجھے اتنا اختیار ہے کہ تم دونوں کو جہاں چاہوں اور جتنے عرصے کے لیے چاہوں بھیج سکتا ہوں۔"

گزشتہ رات جب بہرام لڑکی سے راستہ سمجھ رہا تھا، اُس وقت سفید پوش قلعہ دار کو راستہ سمجھا رہا تھا اور اُس نے قلعہ دار سے کہا تھا کہ وہ خود آئے۔ اُس نے قلعہ دار سے یہ بھی کہا تھا کہ اُس نے ان لوگوں کی جس طرح خاطر مدارت کی ہے، اس کے بدلے میں وہ اسے ہمیشہ جوان رکھنے والی بُوٹی اور کچھ سونا بھی دے گا۔

اور اب جب ناگ پرست چلے گئے تھے، بہرام اپنے نائب سے کہہ رہا تھا — "تم جاؤ یا میں چلا جاتا ہوں۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی گیا تو بہانہ یہی معقول ہو سکتا ہے کہ گرکوٹ تک کے علاقے میں جو کیمپ کا انتظام دیکھنا اور اسے بہتر بنانا ہے۔ لڑکی نے مجھے راستہ سمجھا دیا ہے۔ اگر ہم وہاں پہنچ گئے تو تصور میں لاؤ کہ ہم کیا سے کیا بن جائیں گے۔ ہمیں ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں جاؤں یا تم جاؤ۔ چار پانچ قابلِ اعتبار آدمی ساتھ ہونے چاہئیں۔"

"کیا آپ نے یقین کر لیا ہے کہ ان لوگوں نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے؟" — نائب سالار نے کہا۔ "کیا آپ نے سوچا ہے کہ اس لڑکی نے اتنا نازک راز آپ کو کیوں دے دیا ہے؟"

"اس لیے کہ مجھے دیکھ کر وہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو گئی تھی"۔ بہرام نے جواب دیا۔ "وہ چاہتی ہے کہ میں اُس پُراسرار اور دنیا کی نظروں سے اوجھل خطے سے سونا سمیٹ لوں اور اُسے اپنے ساتھ لے آؤں۔"

"اور میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ ان لوگوں نے اپنی لڑکیوں کی عزت بچانے کے لیے آپ کو اس لڑکی کے ذریعے دھوکہ دیا ہے"۔ نائب سالار نے کہا۔ "انہیں رات

یہاں قیام کرنا تھا۔ وہ دھوکہ دے کر اور اپنی لڑکیوں کی عزت بچا کر چلے گئے ہیں۔"

"تم میرا ساتھ نہیں دو گے؟" — بہرام نے کہا۔ "میں نے تمہیں اپنا ماتحت نہیں اپنا عزیز دوست سمجھ کر اپنے راز میں شریک کیا ہے۔ میں وہاں سے جو کچھ لاؤں گا اس میں تمہارا حصہ بھی ہوگا۔ ذرا سوچو کیا ہماری قسمت میں اپنے وطن اور اپنے عزیزوں سے دور پردیس میں لڑنا اور کٹ مرنا ہی لکھ دیا گیا ہے؟ یہ مہاراجوں اور سلطانوں کی جنگ ہے۔ خزانے بھرتے ہیں تو ان کے۔ عیش و عشرت ان کے حصے میں آتی ہے۔ وہ ہمارے خون اور ہماری جانوں کو جنگ میں جھونک کر سلطان اور مہاراجے بنے ہوئے ہیں۔ کیا ہمیں حق حاصل نہیں کہ ہم موت کے سائے سے نکل کر باقی عمر عیش و آرام سے گزاریں؟"

بہرام نے جب لڑکیوں کے حسن کا ذکر چھیڑا تو نائب سالار کی آنکھوں میں چمک آنے لگی۔ بہرام نے کہا۔ "تم کیوں فکر کرتے ہو؟ تم نہ جاؤ۔ میں جاؤں گا۔ میں اپنی جان خطرے میں ڈال رہا ہوں۔ تمہیں صرف یہ کام کرنا ہے کہ میری غیر حاضری کو چھپائے رکھو اور یہی ظاہر کرو کہ میں دور دراز کی چوکیوں کو دیکھنے اور انہیں بہتر بنانے کے لیے چلا گیا ہوں۔ قلعہ دار مجھے اس کام سے نہیں روکے گا۔ تمہارا دوسرا کام یہ ہوگا کہ قلعے پر حملے کا خطرہ تو نہیں لیکن ہم دشمن کے پیٹ میں بیٹھے ہیں۔ دشمن پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر حملہ ہو جائے تو تم قلعے کو بچانے کے لیے جان لڑا دو تاکہ کسی کو میری کمی محسوس نہ ہو۔"

نائب سالار بہرام کی باتوں میں آ گیا۔ اس نے راز چھپائے رکھنے کا وعدہ کیا اور ان کے سامنے اب مسئلہ یہ آ گیا کہ وہ کون سے چار آدمی ہو سکتے ہیں جن پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ سونے اور حسین عورت کے لالچ میں تو ہر کوئی اس خفیہ اور پراسرار مہم کے لیے تیار ہو جاتا مگر انہیں خطرہ یہ نظر آ رہا تھا کہ اتنی زیادہ دولت دیکھ کر یہ آدمی بہرام کو قتل کر دیں گے اور سب کچھ خود لے اڑیں گے۔ ان کے آپس میں لڑ مرنے کا خطرہ بھی تھا، اس لیے چار آدمیوں کے انتخاب میں انہیں بہت محتاط ہونا تھا۔ انہوں نے اسی وقت اپنے چھاپہ ماروں میں سے چار آدمیوں کا انتخاب شروع کر دیا۔

ان کا خیال تھا کہ ان دونوں کے سوا اس پراسرار خطے کا راستہ کسی اور کو معلوم نہیں۔

سفید ریش ناگ پرست قلعہ دار کو راستہ بتا گیا تھا اور وہ اپنے محافظوں کو وہاں بھیجنے

کے

کے لیے تیار کر رہا تھا۔ قلعہ دار کے سامنے بھی یہی مسئلہ تھا کہ اسے اپنا یہ مہم خفیہ رکھنا تھا۔ وہ بھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ جو راز اسے ملا ہے، وہ کسی اور کو نہیں ملا۔

سفید ریش اپنے گروہ کے ساتھ سورج نکلنے سے پہلے قلعے سے روانہ ہو گیا تھا۔ ان کے پاس پالکیوں والے اونٹ تھے جن پر لڑکیاں سوار تھیں اور مردوں کے لیے دو دو گھوڑوں والی گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ جب یہ قافلہ تھانیسر شہر میں سے گزر رہا تھا تو لوگ انہیں دیکھنے کو اکٹھے ہو گئے تھے۔ قافلہ شہر سے نکل گیا اور جنگل میں داخل ہو گیا۔ سفید ریش نے اپنے ان دو آدمیوں کو جو گاڑی بان تھے، کہا۔ "واپسی پر بھی خیال رکھنا کہ کسی چوکی کے قریب سے نہ گزرنا۔ تمہیں معلوم ہے کہ ان لوگوں کی چوکیاں کہاں کہاں ہیں۔"

دن آدھا گزر گیا تھا جب قافلہ ویران اور سنسان علاقے میں داخل ہو گیا۔ وہاں کھڈ نالے اور اونچے نیچے ٹیلے اور گھاٹیاں تھیں اور درخت بھی تھے لیکن یہ جنگل سرکنڈوں اور اونچی گھاس کا معلوم ہوتا تھا۔ سفید ریش نے قافلے کو آرام کے لیے روک لیا۔ لڑکیاں پالکیوں میں سے نکلیں۔ گھوڑوں سے رسیاں اتار دی گئیں۔ دریاں زمین پر بچھا کر سب بیٹھ گئے۔ سب بہت خوش تھے۔ لڑکیاں اچھل کود رہی تھیں۔ سفید ریش اور دوسرے آدمی انہیں دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

"ہمیں کس طرح پتہ چلے گا کہ ہم نے شکار مار لیا ہے؟" — ایک لڑکی نے پوچھا۔

"تھانیسر میں ہمارے آدمی موجود ہیں" — سفید ریش نے جواب دیا۔ "قلعے کے اندر بھی ہمارے آدمی ہیں۔ اگر قلعہ دار اور سالار ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے تو ہمارے آدمی کچھ دور تک ان کا تعاقب کریں گے۔ جب انہیں یقین ہو جائے گا کہ وہ ہمارے گمراہ کیے ہوئے جا رہے ہیں تو انہیں معلوم ہے کہ کہاں کہاں اطلاع پہنچانی ہے۔ وہ جائیں گے ضرور۔"

"جس سالار کے پاس مجھے بھیجا گیا تھا، وہ تو اسی وقت ہوش اور عقل کھو بیٹھا تھا" — ایک لڑکی نے کہا۔

"یہ مت سوچو کہ یہ لوگ اب کیا کریں گے" — سفید ریش نے کہا۔ "وہ جو کچھ بھی کریں

گئے۔ وہ ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ تھانیسر ہمیں واپس مل جائے گا۔"

ان میں سے کسی نے چونک کر کہا۔ "میں نے گھوڑے کی آواز سنی ہے۔"

"اپنے گھوڑے کی ہوگی۔" ایک نے کہا۔

کسی نے توجہ نہ دی لیکن یہ آواز اُن کے اپنے کسی گھوڑے کی نہیں تھی۔ یہ قافلہ جب تھانیسر سے دُور جنگل میں چلا گیا تھا تو ایک نوعمر لڑکا جو ایک ٹیکری پر بیٹھا تھا قافلے کو دیکھ کر ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہوگیا تھا۔ اُس وقت اونٹوں کی پالکیوں کے پردے اُٹھے ہوئے تھے اور لڑکیاں نظر آرہی تھیں گھوڑا گاڑیوں سے بھی پتہ چلتا تھا کہ قافلہ قیمتی ہے۔ لڑکا اوپر سے سرک کر دوسری طرف سے اُتر گیا اور بہت تیز دوڑتا ہوا کسی طرف غائب ہوگیا تھا۔

لڑکا جہاں رُکا۔ وہاں دس بارہ آدمی زمین پر لیٹے ہوئے تھے اور قریب ہی اُن کے گھوڑے بندھے تھے۔ لڑکے نے انہیں بتایا کہ وہ کیا دیکھ آیا ہے، اور اس قافلے کا رُخ کدھر کو ہے۔ ان میں سے ایک آدمی اُٹھا اور لڑکے کے ساتھ چلا گیا۔ اُس نے بھی ایک جگہ چھپ کر دیکھا اور لڑکے کی پیٹھ تھپک کر واپس آگیا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ سونا شکار ہے۔ پہلے تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ قافلے کا تعاقب جاری رکھا جائے اور رات کو حملہ کیا جائے لیکن ایک نے کہا کہ دن اور رات کا خیال نہ کرو صرف یہ دیکھو کہ غزنی والوں کی کوئی فوجی چوکی قریب نہ ہو۔ کسی چوکی تک آواز پہنچ گئی تو وہاں سے سپاہی دوڑے آئیں گے اور ہم میں سے کوئی بھی نہیں بھاگ سکے گا۔

"ان بدبخت مسلمانوں نے ہمارا تو ناک میں دم کر دیا ہے"— ان رہزنوں کے سردار نے کہا— "ہم مہاراجوں کو اسی لیے پسند کرتے ہیں کہ اپنی راجدھانیوں کے باہر کی وہ پرواہ ہی نہیں کرتے۔ ان غزنی والوں نے تو جنگل میں بھی اپنی حکومت قائم کرلی ہے۔ یہاں تو ہماری حکومت تھی... بہتر ہے چل پڑو جہاں تک مجھے یقین ہے، قریب کوئی چوکی نہیں۔"

قریب تو کوئی چوکی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی سپاہی تھے لیکن غزنی کی فوج کے سات آٹھ سپاہی ایک چوکی میں سے واپس تھانیسر جارہے تھے۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور گپ شپ لگاتے چلے جارہے تھے۔

ناگ پرستوں کا قافلہ کھانا کھا کر آرام کر رہا تھا۔ رہزنوں کا ایک گھوڑا ہنہنایا تھا جس کی آواز قافلے تک پہنچی تھی مگر انہوں نے توجہ نہیں دی تھی۔ انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ رہزن اپنے گھوڑے ذرا دُور چھوڑ آئے ہیں اور پیدل آکر انہوں نے گھیرا ڈال لیا ہے۔

ایک تیر آیا جو قافلے کے ایک آدمی کے سینے میں اُتر گیا۔ سب گھبرائے ہوئے اُٹھے۔ انہیں آواز سنائی دی— "سب ایک طرف کھڑے ہو جاؤ۔ کسی کی آواز نہ نکلے اور کوئی حرکت نہ ہو۔" سب ایک طرف ہوگئے سوائے اُس کے جس کے سینے میں تیر اُتر گیا تھا۔ اردگرد کے سرکنڈوں میں سے دس گیارہ آدمی باہر آئے۔ اُن کی صرف آنکھیں ننگی تھیں۔ سروں پر صافے اور چہروں پر سیاہ رومال لپٹے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ وہ جونہی سامنے آئے، قافلے کے تمام آدمیوں نے اُن سفید چادروں کے اندر سے جو انہوں نے لباس کے طور پر اپنے جسموں پر لپیٹ رکھی تھیں، خنجروں سے بڑی اور بڑی تلواروں سے چھوٹی تلواریں نکال لیں۔

وہ جو لباس سے راہب اور بڑے ہی معصوم لگتے تھے، تیغ زن بن گئے۔ وہ لڑکیوں کو اپنے حصار میں رکھے ہوئے تھے اور رہزن اس حصار کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

رہزنوں کی یہ خوش فہمی جلدی رفع ہوگئی کہ وہ ان نہتے راہبوں کو زبانی دھمکی سے زیر کرلیں گے اور اُن کے پاس جو کچھ ہوگا وہ بھی اور ان کی چاروں لڑکیوں کو بھی اُٹھا لے جائیں گے، مگر اُن کی تلواریں لمبی تھیں۔ اس سے انہوں نے قافلے کے آدھے آدمی مار ڈالے۔ لڑکیوں نے دلیری کا یہ مظاہرہ کیا کہ اپنے مرے ہوئے آدمیوں کی تلواریں اُٹھا لیں۔ رہزنوں کو اب لڑکیوں کی یہ للکار سنائی دینے لگی— "راجپوتوں کی بیٹیوں کو تم ہاتھ نہیں لگا سکو گے"— دو تین رہزن بھی مارے گئے تھے۔

غزنی کی فوج کے وہ سات آٹھ آدمی جو کسی چوکی سے تھانیسر کی طرف جارہے تھے، قریب سے گزر رہے۔ انہیں شور اور للکار سنائی دی۔ وہ رُک گئے اور ادھر دیکھا۔ انہیں ایک جگہ دس گیارہ گھوڑے نظر آئے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ ہندوستان میں رہزن اور

ڈاکو جنگلوں میں موجود رہتے ہیں اور قافلوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ وہ پیدل یا گھوڑوں وغیرہ پر سفر کرنے کا زمانہ تھا۔ تاجر بھی ان قافلوں کے ساتھ ادھر اُدھر آیا جایا کرتے تھے۔ اگر قافلہ چھوٹا ہوتا تو اس پر حملے کا زیادہ خطرہ ہوتا تھا۔ راجوں مہاراجوں نے رہزنی کا کوئی سدّباب نہیں کیا تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنی فوج کو جسے اس نے ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں میں رکھا تھا، یہ حکم دیا تھا کہ قلعوں اور شہروں سے دُور جو فوجی چوکیاں ہیں، ان کے ذمے فوجی فرائض کے علاوہ یہ ذمہ داری بھی ہے کہ اپنے اپنے علاقے میں گشت کا انتظام کریں اور مسافروں کو حفاظت اور سلامتی مہیا کریں اور ڈاکوؤں اور رہزنوں کو اپنا بدترین دشمن سمجھ کر انہیں ختم کریں۔

ان فوجیوں نے اپنے گھوڑوں کے رُخ اُدھر کو موڑے اور گھوڑے دوڑا دیئے۔ وہاں انہیں لاشیں اور خون نظر آیا۔ تین چار نقاب پوش دو لڑکیوں کو اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ فوجیوں نے انہیں للکارا تو وہ لڑکیوں کو پھینک کر بھاگ اُٹھے۔ ان کے ایک دو اور ساتھی بھی زندہ تھے۔ وہ بھی بھاگے لیکن فوجیوں نے انہیں دُور نہ جانے دیا اور انہیں اُن کے گھوڑوں تک نہ پہنچنے دیا۔ سب کو زندہ پکڑ لیا۔

ادھر آ کر دیکھا تو صرف یہ دو لڑکیاں زندہ تھیں۔ باقی دو اور ان کے ساتھ سب آدمی مارے گئے تھے۔ لڑکیوں نے ان کی لاشیں دیکھیں تو سفید ریش کے متعلق فوجیوں کو بتایا کہ ابھی زندہ ہے۔ اُسے دیکھا۔ اُس کے جسم پر کئی زخم تھے اور وہ زندہ تھا۔ فوجیوں نے اُس کے منہ میں پانی ٹپکایا۔ پھر اُسے اُٹھا کر ایک گھوڑا گاڑی میں ڈال لیا۔ لڑکیوں کو دوسری گھوڑا گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ رہزنوں کے ہاتھ باندھ کر ان کی رسیاں گھوڑوں کے ساتھ باندھ دی گئیں۔ اُن کے گھوڑے بھی ساتھ لے لیے گئے اور یہ قافلہ تھانیسر کی طرف چل پڑا۔ لاشیں وہیں رہنے دی گئیں۔

جب گھوڑا گاڑیاں، پالکیوں والے اونٹ، اتنے زیادہ گھوڑے اور چار پانچ قیدی گھوڑوں کے ساتھ بندھے ہوئے اور غزنی کے فوجی تھانیسر قلعے میں داخل ہوئے، اُس وقت سورج غروب ہو چکا تھا۔ قلعہ دار قطب گزک اور سالار بہرام غور کو اطلاع ملی تو دوڑے آئے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ رہزن ہیں جنہوں نے راہبوں کے

قافلے کو لوٹنے کی کوشش کی اور ان کے کئی آدمی اور دو لڑکیاں قتل کر دی ہیں۔ انہیں ساتھ لانے والے فوجیوں کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ لوگ کہیں سے گئے تھے۔

قلعہ دار نے حکم دیا کہ سفید ریش کو بچانے کی پوری کوشش کی جائے۔ بظاہر یہ انسانی ہمدردی کا مظاہرہ تھا لیکن قلعہ دار قطب گزک اپنی گم گشتہ [illegible] اور لمبی عمر کی خاطر سفید ریش کو بچانا چاہتا تھا۔ طبیب فوراً سرگرم ہو گئے۔ دونوں لڑکیوں پر ایسی دہشت طاری تھی کہ اُن کے منہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ انہیں الگ کمرے میں رکھا گیا اور اُن کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے دو عورتوں کو بلا لیا گیا۔ قلعہ دار اور سالار نے انہیں تسلی دلاسے دیئے اور کہا کہ انہیں فوج کی حفاظت میں اُن کی منزل تک پہنچا دیا جائے گا۔

سفید ریش بے ہوش تھا۔ رات بھر طبیب اور جرّاح اُس کے زخموں کی مرہم پٹی اور خون روکنے میں لگے رہے اور اُس کے منہ میں دوائیاں ڈالتے رہے۔ قطب گزک اُن کے سر پر سوار رہا۔ دوسرا دن آدھا گزر چکا تھا جب اُس نے آنکھیں کھولیں اور اُس نے سرگوشی میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ وہ تھانیسر قلعے میں ہے اور قلعہ دار نے اپنی ذاتی نگرانی میں اُس کی مرہم پٹی کرائی ہے۔

وہ شام کے بعد ذرا بولنے کے قابل ہُوا۔ اُسے بتایا گیا کہ اُس کے گروہ کی دو لڑکیاں زندہ بھی ہیں۔ اُس نے دونوں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو لڑکیوں کو اُس کے پاس لے گئے۔ اُن لڑکیوں نے بتایا کہ غزنی کے فوجیوں نے انہیں رہزنوں سے بچایا ہے اور انہی فوجیوں نے اُسے زندہ دیکھ کر اُسے تھانیسر تک پہنچایا ہے۔ لڑکیوں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ قلعہ دار اور سالار نے ان کا سب سے زیادہ خیال رکھا ہے اور ان کے لیے دو عورتیں مقرر کر دی تھیں۔

بوڑھے کے آنسو نکل آئے۔ اُس پر جذباتیت غالب آ گئی۔ اُس نے لڑکیوں سے کہا۔ "میں ان لوگوں کو مزید دھوکے میں نہیں رکھوں گا۔ قلعہ دار کو میرے ساتھ اپنے فائدے کے لیے دلچسپی ہو سکتی ہے، اُن فوجیوں کو میرے ساتھ کیا دلچسپی تھی؟ یہ لوگ تم جیسی دلکش لڑکیوں کو احترام سے لائے اور تمہاری دیکھ بھال کی۔ انہوں نے مجھے

نئی زندگی دی ۔۔۔۔ میں انہیں دھوکے میں نہیں رکھوں گا۔"

اُس نے قلعہ دار قطب گزک سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو قلعہ دار کو اطلاع دی گئی۔ وہ فوراً آگیا اور لڑکیاں چلی گئیں۔

"میں آپ کی فوج کو اس احسان کا صلہ دینا چاہتا ہوں"۔ سفید ریش نے نحیف آواز میں کہا۔

"آپ اسے احسان نہ سمجھیں" ۔۔۔ قطب گزک نے کہا ۔۔۔ "آپ پہلے صحت یاب ہو لیں۔ میں نے دو آدمی تیار کر لیے ہیں جو آپ کے ساتھ جائیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ مجھے کیا چاہیے۔ باقی رہا ان سپاہیوں کا معاملہ جو آپ کو وہاں سے اُٹھا لائے ہیں، تو جب آپ صحت یاب ہو کر واپس جائیں گے تو ان کے لیے کچھ سونا بھیج دینا۔"

"میرے پاس نہ آپ کے لیے کچھ ہے نہ ان سپاہیوں کے لیے" ۔۔۔ سفید ریش نے کہا ۔۔۔ "میں احسان کا صلہ آپ کو ہمیشہ جوان رکھنے والی بوٹی اور سپاہیوں کو سونا دے کر نہیں دینا چاہتا بلکہ اس احسان کا صلہ یہ ہے کہ آپ کو بتا دوں کہ نہ کوئی ایسی بوٹی ہے جو انسان کو ہمیشہ جوان رکھ سکتی ہے اور نہ کسی جگہ سونا بکھرا ہوا ہے جو میں کسی کو دے سکوں۔ اب آپ چاہیں تو مجھے اُٹھا کر قلعے کی دیوار سے نیچے پھینک دیں اور جو دو لڑکیاں آپ کے پاس ہیں انہیں اپنے قبضے میں رکھ لیں۔ میں آپ کے ساتھ بہت بڑی نیکی کر رہا ہوں کہ آپ کو اپنا راز دے رہا ہوں۔ جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے بوٹی لانے کے لیے دو آدمی تیار کر لیے ہیں، اگر وہ آدمی چلے جاتے تو جنگلوں میں بھٹک بھٹک کر مر جاتے۔ آپ کے دو بڑے اہم آدمی میرے ساتھ کی لڑکیوں کے جھانسے میں آگئے تھے۔ وہ سونے اور ہر چیز کو سونا بنانے والے منکے کی تلاش میں نکل گئے ہوتے۔"

قلعہ دار کے چہرے نے کئی رنگ بدلے اور وہ کھسیانا سا ہو کر دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

"آپ اتنے پریشان نہ ہو جائیں" ۔۔۔ سفید ریش نے کہا ۔۔۔ "میں اب بھی آپ کو اسی دھوکے میں رکھ سکتا تھا جو آپ کو دے دیا گیا تھا اور میں آپ کے ہاتھوں صحت یاب

بھی ہو سکتا تھا مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کی فوج کا اخلاق اس قدر اونچا ہے۔ یہ آپ کے مذہب کا کرشمہ ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم سب لاہور سے آئے ہیں۔ ہمیں جیپال نرد کے وزیر نے بھیجا ہے۔ ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ آپ کو اور آپ کے سالاروں کو سونے، نرد جواہرات اور حسین لڑکیوں کے خواب دکھا کر آپ کو گمراہ کر دیا جائے۔ آپ کو قلعہ سے غائب کرنا بھی مقصود تھا۔"

"آپ کو کیسے یقین تھا کہ ہم گمراہ ہو جائیں گے؟" ۔۔۔ قلعہ دار قطب گزک نے پوچھا۔

"آپ انسان ہیں، فرشتہ نہیں" ۔۔۔ سفید ریش نے کہا ۔۔۔ "انسان کتنا ہی نیک اور عبادت گزار کیوں نہ ہو، اس میں عیش و عشرت کی خواہش ضرور ہوتی ہے۔ آپ اس خواہش کو دبا سکتے ہیں، مار نہیں سکتے۔ دولت اور عورت کو عیش و عشرت کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ ہم انسان کی کمزوریوں سے آگاہ ہیں۔ ہر انسان میں ہمیشہ جوان رہنے کی بھی خواہش ہوتی ہے۔ میں نے آپ کے بڑھاپے کو دیکھ کر آپ کی اس کمزوری کو بیدار کر دیا تھا۔ آپ نے کہا کہ آپ کو سونے اور خزانے کی ضرورت نہیں، جوانی کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ وہ میں دوں گا۔"

قطب گزک کے چہرے پر ندامت کے آثار نمودار ہوئے۔

"آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے" ۔۔۔ سفید ریش نے کہا ۔۔۔ "آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ بھی ہمارے جال میں اسی طرح آتا جس طرح آپ آگئے تھے۔ ہم ان لڑکیوں کو اس لیے ساتھ لائے تھے کہ آپ کو اپنے بڑھاپے کا احساس ہو ۔۔۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ میں نے انسانوں کو اتنی قریب سے دیکھا ہے جیسے ان کے ضمیر، ان کے دل اور روحیں بھی دیکھ لی ہوں۔ میں نے آپ پر اپنے اس علم اور تجربے کو آزمایا ہے۔ اپنے نفس کی خواہشات اور دنیا کے لالچ میں آ کر انسان اپنی عقل سے باغی ہو جاتا ہے۔ فرض کو انسان بے معنی سمجھنے لگتا ہے۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ وہ تباہی کی طرف جا رہا ہے۔ وہ تسلیم نہیں کرتا کہ جوانی کبھی واپس نہیں آتی اور روحانی مسرت سونے اور جواہرات سے اور جسمانی لذت سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ جو کوئی اس راز کو پا لیتا ہے، اُسے آپ مومن اور ہم رشی کہتے ہیں۔ یہ آپ کا ایمان اور ہمارا دھرم ہوتا ہے۔ جس انسان کی اپنی ذات کا قلعہ کمزور ہوتا ہے، وہ بڑے مضبوط قلعے ہار جاتا اور دشمن

کوذسے میٹھا ہے۔ آپ اپنے فرض سے ہٹ گئے تھے۔ ہمیں اپنے منصوبے کو ابھی آگے چلانا تھا......

"میں آپ کو ایک نصیحت کرتا ہوں کہ یہ دو لڑکیاں رہزنوں سے بچ گئی ہیں، انہیں اپنے پاس نہ رکھ لینا، ورنہ یہ آپ کو آپ کے سالاروں اور کمانداروں سے اور انہیں آپس میں ٹکرا دیں گی۔ اگر شکست سے بچنا چاہتے ہیں تو اپنے نفس کو اپنے قبضے میں رکھیں۔"

سفید ریش کے زخم ایک مہینے میں ٹھیک ہو گئے۔ اس ایک مہینے میں سالار بہرام غور کو پتہ چل گیا کہ کوئی ایسا خطہ نہیں جہاں سانپ اور انسان اکٹھے رہتے ہوں، اور دونوں لڑکیوں نے اُسے یہ بھی بتا دیا کہ سانپ کے منکے کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس انکشاف کے باوجود سفید ریش کا علاج ہوتا رہا اور قطب گزک اس کی تیمارداری میں دلچسپی لیتا رہا۔ دونوں لڑکیوں کو پوری عزت سے رکھا گیا۔ آخر ان کے جانے کا وقت آ گیا۔

"آپ جا رہے ہیں" قطب گزک نے سفید ریش سے کہا۔ "آپ دشمن بن کر آئے تھے اور ہم آپ کو دوستوں کی طرح رخصت کر رہے ہیں۔ اگر آپ ہمارے سلوک کی قدر کرتے ہیں تو ہمیں اس کے عوض یہ بتاتے جائیں کہ آپ کے مہاراجہ کی نیت اور ارادہ کیا ہے۔ کیا وہ ہمارے سلطان کا باجگذار رہے گا یا اپنے باپ کی شکست کا انتقام لے گا؟"

"ہم نے آپ کے ایمان اور کردار پر جو حملہ کیا ہے، یہ اس کا ثبوت ہے کہ مہاراجہ بھیم پال آپ کے سلطان کو للکارے گا" سفید ریش نے کہا۔ "وہ اگلی لڑائی کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ باجگذار نہیں رہے گا۔ اُس نے آپ کے تمام قلعہ داروں اور سالاروں کو ذہنی اور جذباتی طور پر بیکار کرنے کے لیے یہ منصوبہ بنایا ہے جس پر عمل کرنے ہم آئے تھے۔ اُسے یقین دلایا گیا ہے کہ اس طرح غزنی کی جو فوج یہاں ہے وہ بیکار ہو جائے گی، لیکن اصل منصوبہ یہ ہے کہ وہ کسی بہت ہی دشوار جگہ سلطان محمود کو لڑائے گا اور اس کے ساتھ یہ اعلان کر دے گا کہ وہ سلطان کا باجگذار نہیں۔"

بھیم پال نندر کو تھانیسر سے اطلاع مل چکی تھی کہ اس نے سفید ریش راہبوں

اور ناگ پرستوں کی صورت میں جو حملہ کیا تھا، ناکام ہو گیا ہے لیکن اُسے یہ نہ بتایا جا سکا کہ اُس کے بھیجے ہوئے آدمیوں نے راز بھی فاش کر دیا ہے۔ وہ دراصل اس سکیم کا قائل بھی نہیں تھا۔ اُسے اپنی دلیری اور جرأت اور جنگی امور کی سوجھ بوجھ پر بجا طور پر ناز تھا۔ اُس نے جنگی تیاریاں تیز کر دیں اور کسی بڑی ہی مشکل زمین کا انتخاب کرنے لگا۔

جہلم سے راولپنڈی کی طرف جائیں تو ایک پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں سے سڑک بھی گذرتی ہے اور ریل کی پٹڑی بھی۔ ان راستوں کی صورت دروں کی سی ہے۔ یہاں ایک مقام ہے جسے ٹلہ جوگیاں کہتے ہیں اور اس پہاڑی کا نام بال ناتھ ہے۔ روایت مشہور ہے کہ رانجھے نے یہیں آ کر جوگیوں کا روپ دھارا اور کانوں میں جوگیوں والے کڑے ڈالے تھے۔

یہ مقام جوگیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ اس کے ارد گرد کا علاقہ چٹانی ہے اور کھنڈ نالے بھی ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کے دور میں یہ نشیب اور زیادہ گہرے اور دشوار ہوں گے۔

بھیم پال نندر نے سلطان محمود غزنوی سے ٹکر لینے کے لیے اسی علاقے کا انتخاب کیا اور اپنی فوج کو وہاں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ سلطان کو للکارنے کی صورت میں غزنی کی فوج کو لاہور کی طرف بڑھنے کے لیے اسی علاقے سے گذرنا تھا۔ بھیم پال نندر وسیع پیمانے پر گھات لگا رہا تھا۔ اُس نے اپنے فوجی کمانداروں سے کہا کہ وہ فوج کو پہاڑی علاقے سے روشناس کرائیں اور پہاڑی جنگ کی مشق کراتے رہیں۔ وہ زیادہ تر توجہ تیر اندازوں کی طرف دے رہا تھا اور یہ ہدایت کہ تیر انداز بلندیوں سے نیچے نہ آئیں۔ وادیوں میں بکھری ہوئی غزنوی فوج کو گھیرنے کے لیے وہ سوار دستے تیار کر رہا تھا۔ ہاتھیوں کو اس نے تنگ راستوں اور میدانی علاقوں کے لیے رکھا تھا۔

ایک روز بھیم پال نندر کو اطلاع ملی کہ تھانیسر سے غزنی کے قلعہ دار کا ایلچی آیا ہے اور اس کے ساتھ ایک سفید ریش بوڑھا اور دو لڑکیاں ہیں۔ بھیم پال نے انہیں

نندر طلال۔ ایلچی نائب سالار تھا جو بارہ محافظوں کے ساتھ آیا تھا۔

"مہاراج!" ۔۔۔ ایلچی نے کہا ۔۔۔ "آپ کی امانت واپس کرنے آیا ہوں۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے بھیجے ہوئے باقی آدمی اور دو لڑکیاں رہزنوں کے ہاتھوں ماری گئی ہیں۔ یہ شخص زخموں سے چُور زندہ تھا۔ اسے ہمارے سپاہی اٹھا لائے اور ان دو لڑکیوں کو رہزنوں سے چھڑا لائے۔ ہم انہیں جلدی واپس کر دیتے لیکن اس بزرگ کا علاج ضروری تھا۔ وہ ہم نے کیا۔ آپ اس سے اور ان لڑکیوں سے پوچھ لیں کہ ہم نے امانت میں خیانت تو نہیں کی؟ ان سے پوچھ لیں کہ ان کے گروہ کا کوئی فرد ہمارے ہاتھ سے تو نہیں مرا؟"

اُس وقت کے وقائع نگار لکھتے ہیں کہ بھیم پال نندر جیسا جابر اور جری جنگجو اتنا شرمسار ہوا کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ نائب سالار کی گردن تنی ہوئی تھی۔

"آپ ہمارے باجگزار ہیں" ۔۔۔ نائب سالار نے کہا ۔۔۔ "ہمارا اور آپ کا معاہدہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف کوئی جنگی کارروائی نہیں کریں گے لیکن آپ نے ایسی جنگی کارروائی کی ہے جس سے ثابت ہو گیا ہے کہ ہندو راجپوت سانپ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔"

بھیم پال نندر یکلخت بیدار ہو گیا اور اپنی ران پر بڑی زور سے ہاتھ مار کر بولا ۔۔۔ "باجگزار ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارے منہ میں جو آئے وہ کہہ ڈالو" ۔۔۔

درباریوں نے اپنی تلواروں کے دستوں پر ہاتھ رکھ لیے اور انہوں نے چہروں پر قہر بھرے غصے کے آثار پیدا کر لیے۔ نائب سالار نے نظریں گھما کر سب کو دیکھا اور مسکرا دیا۔

"ایک آدمی کے خلاف اتنے آدمی اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں؟" ۔۔۔ نائب سالار نے کہا ۔۔۔ "ہمارے سلطان کے دربار میں اگر اُس کا بیٹا بھی کسی مہمان کو گھور کر اپنی تلوار پر ہاتھ رکھے تو سلطان اُس کا ہاتھ کاٹ دیں۔ تلواریں میدان میں نکلا کرتی ہیں۔ اگر تم جنگجو ہوتے تو اس بوڑھے اور ان جوان لڑکیوں سے ہم پر حملہ نہ کرتے۔ یہ تمہاری بیٹیاں ہیں۔ ان کی عزت اور عصمت کو ہتھیار بناتے ہو؟"

ایک وقائع نگار لکھتا ہے کہ بھیم پال کے دربار میں جو آدمی ترجمان کا فرض ادا کر رہا تھا، اُس نے نائب سالار کے ان جملوں کا ترجمہ ذرا ڈھیلی سی زبان سے کیا کیونکہ الفاظ بڑے سخت اور توہین آمیز تھے۔ نائب سالار نے اُسے کہا ۔۔۔ "مجھے معلوم نہیں کہ تم میرے الفاظ کا صحیح ترجمہ کر کے اپنے مہاراج کو سنا رہے ہو یا نہیں، لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم میرا جوش اور جذبہ مہاراج تک نہیں پہنچا رہے ہو۔ میرے پُرجوش لہجے میں میری بات مہاراج تک پہنچاؤ۔"

ترجمان نے یہ بھی مہاراجہ بھیم پال نندر کو سنا دیا۔

"محترم مہمان!" ۔۔۔ بھیم پال نے کہا ۔۔۔ "آپ کا باجگزار میرا باپ تھا۔ وہ مر گیا ہے۔ مجھے ابھی یہ فیصلہ کرنا ہے کہ میں باج ادا کروں گا یا نہیں۔ دوستی کا معاہدہ قائم رہے گا۔"

"میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو دعوتِ اسلام دوں" ۔۔۔ نائب سالار نے کہا ۔۔۔ "آپ کے دادا نے ہم سے شکست کھائی، آپ کے باپ نے ہم سے شکست کھائی، اب آپ کی باری ہے۔ آپ نے نوجوان لڑکیوں کی قربانی دی ہے۔ آپ پتھر کے بتوں کے آگے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہیں۔ آپ کو کیا ملا؟ ۔۔۔ شکست، شرمناک شکست۔ کیا آپ ابھی تک نہیں سمجھے کہ آپ باطل کی پوجا کر رہے ہیں اور آپ کو وہ خدا سزا دے رہا ہے جو وحدہٗ لاشریک ہے، اور سزا بھی اور جزا بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اسلام قبول کر لیں۔"

"ہم کسی ایلچی کو اتنی ڈھیل نہیں دیا کرتے کہ وہ کسی کے دربار میں اُس کے مذہب کی توہین کرے" ۔۔۔ بھیم پال نندر نے کہا ۔۔۔ "آپ میری اور میرے مذہب کی توہین کر کے مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں دوستی کے معاہدے پر نظرِ ثانی کر لوں۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

نائب سالار چلا گیا۔ سفید ریش اور دونوں لڑکیاں وہیں کھڑی رہیں۔

"لے جاؤ انہیں" ۔۔۔ بھیم پال نے گرج کر کہا ۔۔۔ "انہیں میری نظروں سے اوجھل کر دو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ حربہ استعمال کیا جائے۔ یہ بوڑھا اور یہ لڑکیاں میرے

لیے طعنہ بنی رہیں گی۔ میں کھلے میدان میں لڑوں گا اور سلطان محمود کو قیدی بنا کر اور مندر میں لے جا کر پوچھوں گا کہ اب بتاؤ خدا کس کا سچا ہے۔"

جہلم کے قریب کا کوہستانی علاقہ فوجی کیمپ بن گیا۔ وہاں اتنے درخت نہ ہوں گے جتنے فوجی تھے۔ ہندؤں نے ایک بار پھر مندروں میں سلطان محمود غزنوی کے خلاف وہی پروپیگنڈہ شروع کر دیا جو وہ پہلے بھی کر چکے تھے۔ اب کے بھی اس کا اثر وہی ہوا جو پہلے بھی دیکھنے میں آیا تھا۔ وہ غیر فوجی لوگ لاہور میں جمع ہونے لگے جو تیغ زنی اور تیر اندازی کے ماہر تھے۔ لوگ مہاراجہ بھیم پال کا خزانہ بھرنے لگے۔ عورتوں نے اپنے زیورات خزانے میں جمع کرا دیئے۔ ہر کسی کے دماغ پر اسلام کا اور جنگ کا بھوت سوار تھا۔ دور دور سے ہندو جوان لاہور آنے لگے اور انہیں جہلم کی طرف روانہ کیا جانے لگا۔

محمود غزنوی کو اطلاعیں مل رہی تھیں لیکن ابھی یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ بھیم پال نڈر کا ارادہ حملہ کرنے کا ہے یا وہ حملے کی دعوت دینا چاہتا ہے۔ ۱۰۱۲ء کا سال گزر گیا۔ ۱۰۱۳ء (۴۰۴ھ) کا سال بھی گزرنے لگا۔ اکتوبر کے وسط میں اُسے مصدقہ اطلاع ملی کہ بھیم پال نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ غزنی کا باجگذار نہیں اور اُس نے دوستی کا معاہدہ بھی توڑ دیا ہے۔ سلطان کو جاسوسوں نے یہ بھی بتا دیا کہ بھیم پال نے اپنی تمام فوج جہلم کے قریب پہاڑی سلسلے میں گھات کی صورت میں پھیلا دی ہے۔

مہاراجہ بھیم پال کو نڈر کا خطاب دیا گیا تھا اور سلطان محمود غزنوی بے صبر تھا۔ کفر کے خلاف ہمیشہ پابرکاب رہتا تھا۔ وہ غصے سے لال ہو گیا۔ اُس کی فوج نے آرام کر لیا تھا اور اُس نے فوج کی کمی بھی پوری کر لی تھی۔ بھیم پال کا خیال تھا کہ سلطان محمود کچھ دیر بعد غزنی سے چلے تو اُسے یہاں پہنچتے پہنچتے چھ مہینے لگ جائیں گے۔ اُس وقت تک موسم سرما گزر چکا ہو گا اور موسم بہار کا آغاز ہو گا اور یہ موسم لڑائی کے لیے موزوں ہو چکا ہو گا۔ مگر اس کے خواب تباہ ہو گئے۔

وہ گھات مکمل کر کے لاہور میں بیٹھا تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ غزنی کی فوج مارگلہ کی پہاڑیوں میں سے نکل آئی ہے۔ مارگلہ کی پہاڑیاں راولپنڈی کے قریب ہیں۔ بھیم پال نڈر سلطان محمود کی تیز رفتاری سے واقف نہیں تھا۔ وہ لاہور سے عجلت میں روانہ ہوا۔ یہ دوڑ تھی کہ وہ بال ناتھ تک پہلے پہنچتا ہے یا سلطان محمود۔ ہوا یوں کہ سلطان محمود مارگلہ سے نکل کر رات بھر کے لیے رُک گیا۔ اُسے اپنی انٹیلی جنس سے معلوم کرنا تھا کہ دشمن کہاں ہے اور اُس کا ڈپلائے کیسا ہے اور وہ لڑائی میں کیا انداز اختیار کرے گا۔ اتنی دیر میں بھیم پال نڈر بال ناتھ کے مقام پر پہنچ گیا۔ یہ جگہ پہاڑیوں اور چٹانوں میں گھری ہوئی ہے۔ بھیم پال نے اسے قلعے کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور وہاں قلعہ بند ہو گیا۔

ایک مؤرخ نے لکھا ہے کہ یہ لڑائی مارگلہ میں ہوئی تھی لیکن بیشتر مؤرخین نے بال ناتھ کا سلسلہ کوہ لکھا ہے۔ یورپی مؤرخوں نے اسے بال ناتھ لکھا ہے۔ بیہقی، عطبی اور گردیزی نے اس جگہ کا پرانا نام نندنہ بھی لکھا ہے اور نردین بھی لیکن اس کا محل وقوع (عرض بلد اور طول بلد کے حساب سے) جو لکھا ہے وہ ٹلہ جوگیاں اور پہاڑی بال ناتھ ہے۔

سلطان محمود کو اگلے روز صبح اطلاعیں مل گئیں۔ اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بھیم پال نڈر کس مقام پر قلعہ بند ہے اور وہ زمین کیسی ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ بلندیوں پر تیر انداز ہیں۔ ان اطلاعات کی روشنی میں سلطان محمود نے اپنے سالاروں سے کہا کہ وہ لاہور تک نہیں جائیں گے اور جہلم کے پہاڑی سلسلے میں سے جو راستہ گزرتا ہے، اُس راستے پر بھی نہیں جائیں گے۔ سلطان نے گائیڈوں کا انتظام کر لیا اور اپنے چھاپہ مار دستوں کو ضروری ہدایات دے کر آگے بھیج دیا۔

بھیم پال نڈر کی فوجی طاقت سلطان محمود کی نسبت خاصی زیادہ تھی اور وہ نہایت اچھی اور جنگی لحاظ سے برتر پوزیشن میں تھی۔ غزنی کی فوج حملہ آور ہو رہی تھی۔ مورچہ بند فوج پر حملہ کرنے والی فوج کی تعداد زیادہ ہونی چاہئے کیونکہ اس کا نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ سلطان محمود کو یہ سہولت حاصل نہیں تھی۔ اسے چھاپہ ماروں کو نا بیت جا کر میں

اور ہوشمندی سے استعمال کرنا تھا۔ چھاپہ مار طریقہ جنگ کا انحصار ذاتی شجاعت اور انفرادی جذبے پر ہوتا ہے۔ چند ایک چھاپہ مار رات کی تاریکی میں اپنے ہدف سے دور رہیں اور کچھ بھی نہ کریں تو انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ وہ واپس آکر اپنی کارگزاری کے متعلق جھوٹ بول سکتے ہیں۔

سلطان محمود غزنوی کے چھاپہ ماروں کا انتخاب صرف جسمانی اور ذہنی بھرتی اور مستعدی پر نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ مذہب کے لحاظ سے جنونی افراد کو ترجیح دی جاتی تھی۔ اسی لیے یورپی مورخوں نے غزنی کے چھاپہ ماروں کو "کریک ٹروپس" لکھا ہے۔ سلطان محمود ان کے ساتھ دلی پیار سے پیش آیا کرتا اور کہا کرتا تھا کہ یہ وہ جانباز ہیں جن کی نہ قبر بنتی ہے نہ انہیں جنازہ اور کفن نصیب ہوتا ہے۔

رات کے وقت سلطان محمود کی فوج اس پہاڑی سلسلے کے قریب پہنچ گئی جو راولپنڈی کی طرف سے سوہاوہ کے قریب سے شروع ہوتا ہے۔ رات کو ہی چھاپہ مار جیش آگے چلے گئے۔ ہر جیش میں دس سے بارہ افراد تھے اور ہر ایک کے ساتھ ایک مقامی گائیڈ تھا۔ ان کا ہدف وہ چٹانیں اور پہاڑیاں تھیں جن کے نرغے میں ٹلہ جوگیاں واقع تھا اور جہاں بھیم پال نڈر موجود تھا۔ یہ خاص طور پر پیش نظر رکھیے کہ دسمبر کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ سردی عروج پر تھی۔ ہندو سمجھتے تھے کہ ایسی یخ بستہ راتوں کو کوئی جنگی کارروائی نہیں ہو سکتی، اس لیے وہ اپنی پوزیشنوں میں دبکے پڑے تھے۔

چھاپہ مار دبے پاؤں پہاڑیوں پر چڑھ گئے۔ ہندو تیر انداز سوئے ہوئے تھے۔ صرف ایک ایک سنتری ہی کھڑا تھا۔ ان سنتریوں پر قابو پانا مشکل نہ تھا۔ سوئے ہوئے تیر اندازوں کو ختم کر دیا گیا۔ دو تین چوٹیوں پر لڑائی ہوئی کیونکہ وہاں کے تیر انداز بیدار ہو گئے تھے۔ شور شرابا بھیم پال کی خیمہ گاہ تک پہنچا۔ اس نے معلوم کرانے کے لیے آدمی دوڑائے لیکن کوئی ایک بھی آدمی واپس نہ آیا۔

اگلی صبح سلطان محمود کو رات کے آپریشن کی کامیابی کی اطلاع ملی تو اس نے اپنی فوج کے کچھ دستے آگے بھیج کر اس طرح پہاڑیوں پر چڑھا دیے کہ دشمن کو پتہ نہ چل سکا۔ بھیم پال نے جو کچھ سوچا تھا وہ سلطان محمود کے دماغ میں پہنچ چکا تھا۔ بھیم پال نڈر کو یہ

بھی توقع تھی کہ سلطان محمود درّے میں سے گزرے گا اسی لیے اس نے زیادہ تر فوج اس طرف پھیلائی تھی۔

دوپہر کے وقت (عطبی کے الفاظ میں) سلطان محمود کے دستے پہاڑیوں سے بھوکے بھیڑیوں کی طرح جھپٹے، چنگھاڑتے گرجتے، نعرۂ تکبیر بلند کرتے بہت تیزی سے اترے۔ پیشتر اس کے کہ بھیم پال نڈر کا ہیڈ کوارٹر اور اس کے دفاعی دستے سنبھلتے، مسلمان ان پر جھپٹ پڑے۔ گھات لگانے والے خود گھات میں آگئے۔ اپنے دادا جے پال کی طرح بھیم پال خوش قسمت تھا کہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ پکڑا نہ جا سکا۔ محمد قاسم فرشتہ کے مطابق، بھاگنے سے پہلے اس نے یہ حکم دیا کہ تمام فوج یہاں سے نکالو اور لاہور کے مضافات میں لگا دو۔ اس کے بعد وہ کسی کو نظر نہ آیا۔

مرکز ختم ہونے سے اور جھنڈا غائب ہو جانے سے اور مرکز سے احکام نہ ملنے کی وجہ سے بھیم پال کی فوج میں ابتری پھیل گئی۔ یہ دراصل قلیل تعداد چھاپہ ماروں کی کامیابی تھی۔ غزنی کی فوج جو ڈسپلن کی پابند اور رابطے اور نظم و نسق میں رہ کر لڑنے والی فوج تھی، سارے علاقے کو صاف کرتی گئی۔

جنگی قیدیوں نے بتایا کہ مہاراجہ بھیم پال نڈر کشمیر کی طرف نکل گیا ہے۔ سلطان محمود اس قدر غصے میں تھا کہ اس نے ایک سوار دستہ ساتھ لیا اور بھیم پال کے تعاقب میں چلا گیا۔ کشمیر میں دریائے جہلم کے کنارے کشمیر کی فوج نے جس کا کمانڈر تنگا نام کا جرنیل تھا، سلطان محمود کی ہراول پارٹی کو گھیر کر مار ڈالا۔ تنگا اس آسان فتح پر اتنا خوش ہوا کہ وہ سلطان محمود کے سوار دستے پر حملہ آور ہوا مگر اسے جلدی ہی احساس ہو گیا کہ اس نے زندگی کی سب سے زیادہ بھیانک غلطی کی ہے۔ اسے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

سلطان محمود نے اعلان کر دیا کہ یہاں تمام لوگ اسلام قبول کر لیں ورنہ کسی بستی کو آباد نہیں رہنے دیا جائے گا۔ لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرنے لگے۔ عطبی اور گردیزی نے لکھا ہے کہ ٹلہ جوگیاں میں ایک مندر تھا جس میں ایک بُت ہوتا تھا اس کے

متعلق ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ یہ چالیس ہزار سال پرانا ہے۔ سلطان محمود نے اس مندر کو بنیادوں سے ہی اکھاڑ پھینکا اور بت کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔

سلطان محمود جولائی ۱۰۱۴ء میں واپس غزنی چلا گیا۔

قلعہ جو سر نہ ہوا

۱۰۱۴ عیسوی کی آخری سہ ماہی کا واقعہ ہے۔ جہلم کے قریب کے سلسلۂ کوہ کی بالا نائنہ پہاڑی پر معمولی سا ایک قلعہ تھا جس میں سلطان محمود غزنوی کی فوج کا ایک زیادہ نفری والا دستہ رہتا تھا۔ پنجاب کے مہاراجہ بھیم پال نندہ کو اس مقام پر شکست دے کر سلطان محمود نے اسے اپنا باجگزار بنا لیا تھا۔ سلطان یہاں اپنی حکومت قائم نہیں کر سکا تھا کیونکہ اس کی غیر حاضری میں غزنی کی سلطنت کے حالات بگڑنے لگے تھے۔ معاہدے کے مطابق سلطان کو حق حاصل تھا کہ وہ پنجاب میں جہاں چاہے اپنے ایک دو دستے رکھے اور ان کے اخراجات مہاراجہ پنجاب ادا کرتا رہے۔

ان دستوں کو ان علاقوں میں رہتے کئی مہینے گزر گئے تھے۔ قلعہ دار ساروکی نام کا ایک سالار تھا جو غالباً کرمان کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ ایک روز قلعے میں دو گھوڑ سوار آئے۔ ایک کا نام سعید تھا اور دوسرا غزالی فوج کا سپاہی تھا۔ وہ کشمیر سے آئے تھے۔ یہ سفر لمبا تھا جس کے اثرات ان کے چہروں اور جسموں پر صاف نظر آ رہے تھے۔ چہرے مرجھائے ہوئے اور ہونٹ پھٹے ہوئے تھے۔ ان پر گرد کی دبیز تہہ بتا رہی تھی کہ وہ بہت تیز آئے ہیں اور راستے میں بہت کم رکے ہیں۔

وہ آتے ہی قلعہ دار ساروکی کے پاس چلے گئے۔

"آپ لوگ بہت تھکے ہوئے ہیں" — ساروکی نے انہیں کہا — "آرام کر لیں، پھر میں وہاں کی خبریں سنوں گا۔"

"ہمارے چہروں پر سفر کا اتنا اثر نہیں جتنا اس خبر کا ہے جو ہم سنانے آئے

ہیں [illegible]

"کیا ہوا؟" — سارنگ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا "کیا ہندوؤں نے ہمارے آدمیوں کو قید میں ڈال دیا ہے؟ آپ لوگوں کو تبلیغ سے روک دیا ہے؟ سلطان کے احکام کی بجاآوری سے آپ کو کسی نے روکا ہے؟"

"نہیں" امام نے کہا "میں اس سپاہی کو ساتھ لایا ہوں۔ یہ عینی شاہد ہے... میں بھی سپاہی نہیں، صرف امام مسجد ہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں خوف سے بھاگ آیا ہوں۔ کالنجر (کوئی کشمیر) جادوگروں کا دیس ہے یا اُس غیر مرئی مخلوق کا جو انسانوں کو دھوکا دینے کے لیے کبھی کبھی انسانوں کے روپ میں نظر آتی ہے۔ یہ مخلوق جنات بھی ہو سکتے ہیں اور ارواح خبیثہ بھی۔"

"معلوم ہوتا ہے آپ ہندوؤں کی شعبدہ بازی کا شکار ہو گئے ہیں" — سارنگ نے کہا "آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، اسے میں اتنی جلدی تسلیم نہیں کروں گا۔ سلطان مجھے ذاتی طور پر منتخب کر کے یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ انہیں میرے متعلق بتایا گیا تھا کہ میں توہمات سے ڈرنے اور تصورات سے خوش ہونے والا آدمی نہیں ہوں۔ آپ ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں اور آپ نے ہندوؤں کے سائے میں پرورش پائی ہے۔ آپ امام ہیں، امام کو حقیقت میں رہنا چاہیے۔ آپ قوم کے قائد ہیں۔"

"ہم جو اتنی دور سے آئے ہیں" — امام نے کہا — "اور اتنا تیز آئے ہیں کہ نیند اور بھوک کا خیال نہیں کیا، کیا آپ اس سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ معاملہ کتنا سنگین ہے؟ آپ نے میری بات سننے سے پہلے ہی کیوں کہہ دیا ہے کہ میں حقیقت میں نہیں ہوں؟"

"اس لیے کہ جب آپ وہاں کے واقعات سنانے لگیں تو ان میں مبالغہ نہ ہو" سارنگ نے کہا "اب سناؤ وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"کشمیر اس قدر حسین خطہ ہے کہ طلسماتی لگتا ہے" — امام نے کہا۔ "کبھی شک ہوتا ہے کہ یہ انسانوں کا نہیں پریوں کا دیس ہے، یا وہاں اُن انسانوں کی روحیں رہتی ہیں جو زندہ تھے تو نیک اور پاک رہے۔"

"روح خدا کی امانت ہوتی ہے" — سارنگ نے کہا — "انسان مرجاتا ہے تو روح خدا کے پاس چلی جاتی ہے۔ کوئی روح زمین پر نہیں رہتی۔ خیالوں اور خیالوں

کی باتیں نہ کریں محترم امام!.... آپ نے کیا دیکھا ہے؟"

"ہم وہاں گئے اور لوگوں کو بتانے لگے کہ اسلام کیا ہے" — امام نے کہا — "ہم انہیں نماز پڑھانے لگے اور بتانے لگے کہ مسلمان کے فرائض کیا ہیں اور خدا کے ساتھ مسلمان کا کیا تعلق ہے۔ وہاں کے لوگ سلطان کے حکم سے مسلمان تو ہو گئے تھے لیکن ہم انہیں اسلام کی تعلیم دینے لگے تو وہ دل و جان سے اسلام کو قبول کرنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد وہاں راتوں کو بجلی چمکنے لگی۔ آسمان پر نہ بادل ہوتا نہ گھٹا، بجلی چمکتی ہے۔ میں جس گاؤں میں تھا، وہاں میں نے بجلی چمکتی دیکھی۔

"ایک رات گاؤں کے قریب گھوڑے دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔ کوئی نہیں ہوا کہ آوازیں دور سے آتی ہوں اور قریب سے گزر کر دور چلی گئی ہوں۔ ایک آوازیں اٹھیں اور خاموش ہو گئیں۔ یہ بلاشبہ دوڑتے گھوڑوں کی آوازیں تھیں۔ دن کے وقت گڈریے جنگل کو نکلے تو ڈرے ہوئے، دوڑتے ہوئے واپس آ گئے۔ انہوں نے کانپتے ہوئے سنایا کہ جنگل سے انہیں عورتوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیں۔ انہوں نے جا کر دیکھا، وہاں کوئی نہ تھا۔ رونے کی آوازیں بند ہوئیں تو بڑی گرجدار آواز آئی 'دیوتاؤں کا قہر آ رہا ہے... پہاڑ پھٹ جائیں گے، جنگل کو آگ لگ جائے گی۔ اپنے دیوتاؤں کو ناراض نہ کرو....'

"میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ وہ ڈریں نہیں۔ دیوتاؤں کا کوئی وجود نہیں۔ وہ صرف اللہ کو یاد کریں، مگر ان کی تسکین نہیں ہوئی۔ دو چار دنوں بعد دوسرے گاؤں کے چند ایک آدمی خوف سے بُری طرح کانپتے ہوئے ہمارے گاؤں میں آئے۔ انہوں نے سنایا کہ ان کے گاؤں کے قریب ایک پہاڑ پھٹ گیا ہے اور اس میں سے کبھی کبھی شعلے نکلتے ہیں اور کبھی کبھی پہاڑ گرجتا ہے۔ جہاں سے پہاڑ پھٹا ہے وہاں سے عجیب و غریب ڈراؤنی شکلوں کے انسان نظر آتے ہیں....

"ان کی باتیں سن کر میرے گاؤں کے لوگ اس قدر دہشت زدہ ہو گئے کہ گاؤں سے بھاگنے کی تیاری کرنے لگے۔ میں نے انہیں روکا اور بہت سمجھایا مگر وہ خوف سے مرنے لگے۔ میں یہ سمجھا کہ یہ ہندو پنڈتوں کی کارستانی ہے۔ وہ لوگوں کو ڈرا

نہیں کہ وہ اسلام قبول نہ کریں مگر کچھ واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں عقل بھی نہیں سمجھ سکتی۔ مثلاً بجلی کی چمک کو میں نہیں سمجھ سکتا۔ اگر میں سمجھ بھی جاؤں تو میں لوگوں کو نہیں سمجھا سکتا۔ پھر ایک واقعہ ایسا ہوا ہے جو آپ کو یہ سپاہی سنائے گا۔“

”ہماری چوکی دریا کے کنارے ہے“۔۔۔ سپاہی نے کہا۔ ”ہمیں ایک رات دو تین عورتوں کے رونے کی آوازیں سنائی دیں جو کی کا کمانڈر زبیر جلالی مجھے اور ایک اور سپاہی کو ساتھ لے کر باہر نکلا۔ ہم آوازوں کی طرف گئے تو آوازیں خاموش ہو گئیں۔ ایک طرف سے دو آدمی آ گئے۔ زبیر جلالی نے اُن سے پوچھا کہ عورتیں کہاں رو رہی تھیں؟ انہوں نے کہا کہ انہوں نے ایسی کوئی آواز نہیں سُنی۔ اتنے میں عورتیں پھر رونے لگیں۔ زبیر نے ان آدمیوں سے کہا کہ یہ کس کی عورتیں رو رہی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ انہیں تو کسی کے رونے کی آواز نہیں سنائی دے رہی۔ ہم حیران ہوئے کہ جو آواز ہم سُن رہے تھے، وہ اُن کے کانوں میں نہیں پڑ رہی تھی ....

”ان آدمیوں نے ہمیں بتایا کہ اس علاقے میں دو جوان لڑکیاں کبھی کبھی نظر آتی ہیں جیسے نظر آتی ہیں اُسے اپنے پاس بلاتی ہیں۔ ان کے قریب جاؤ تو غائب ہو جاتی ہیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی ہیں .... ہم چوکی میں واپس آ گئے۔ دوسرے دن زبیر جلالی نے مجھے اور ایک اور سپاہی کو ساتھ لیا۔ کہنے لگا کہ وہ رات کے رونے کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے۔ وہاں قریب کوئی آبادی نہیں۔ علاقہ بہت خوبصورت ہے۔ ہم دو پہاڑیوں کے درمیان چلے جا رہے تھے۔ اچانک ہمیں سامنے پہاڑی ڈھلان پر دو لڑکیاں کھڑی نظر آئیں۔ ان کے کندھوں سے پاؤں تک آسمانی رنگ کا اتنا باریک کپڑا لپٹا ہوا تھا جس میں سے ان کے جسم نظر آ رہے تھے۔ اُن کے بال کھلے ہوئے تھے ....

”وہ بہت ہی حسین تھیں۔ ہمیں بلا رہی تھیں۔ جہاں وہ کھڑی تھیں وہاں بڑی خوبصورت گھاس اور پھولدار جھاڑیاں تھیں۔ نیچے بھی گھاس اور جھاڑیاں تھیں۔ چیل کے لمبے لمبے درختوں کی اتنی بہتات تھی کہ وہ نیچے سے اوپر تک ایک دوسرے کے ساتھ

ملے کھڑے تھے اور انہوں نے سورج کی شعاعوں کو روک رکھا تھا۔ لڑکیاں اس حسین سبزہ زار کا حصہ معلوم ہوتی تھیں۔ ہم رک گئے۔ وہ وہیں کھڑی رہیں۔ زبیر جلالی نے کہا کہ وہ آگے جائے گا۔ ہم نے اسے روکا مگر وہ نہ رکا۔ ہم دونوں سپاہی آگے نہ گئے۔ ایک لڑکی نے ہاتھ سے اشارہ کر کے زبیر جلالی کو بلایا۔ ہمارے روکنے کے باوجود وہ بڑھتا گیا۔ جب لڑکیوں کے قریب گیا تو یکلخت غائب ہو گیا۔“

”کیا وہ ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا؟“۔۔۔ سارگی نے طنزیہ پوچھا۔

”نہیں“۔۔۔ سپاہی نے جواب دیا۔ ”وہ بہت تیزی سے زمین میں دھنس گیا۔ ہم نے اُسے غائب ہوتا دیکھ کر جب لڑکیوں کی طرف دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھیں۔ ہم دونوں سپاہی وہاں سے بھاگ آئے۔ یہ امام صاحب ہمارے علاقے کے ہیں، ہم نے انہیں بتایا۔ یہ پہلے ہی ڈرے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔“

”مجھے اپنی جان کا اتنا ڈر نہیں جتنا یہ خدشہ ہے کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا وہ اسلام سے ہٹتے جا رہے ہیں“۔۔۔ امام نے کہا۔ ”انہیں یقین ہو گیا ہے کہ انہوں نے چونکہ اپنا مذہب چھوڑ دیا ہے اس لیے ان پر قہر نازل ہو رہا ہے اور آسمانوں کی مخلوق انہیں سزا دینے کے لیے زمین پر اُتر آئی ہے۔“

”چوکی میں اپنے سپاہی بھی اس وہم میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ سلطان نے یہاں کے لوگوں پر اپنا مذہب مسلط کیا ہے اس لیے یہاں مافوق الفطرت واقعات ہو رہے ہیں“۔۔۔ سپاہی نے کہا۔ ”کمانڈر زبیر جلالی کا یوں زمین میں دھنس جانا ایک ایسا واقعہ ہے کہ جو سنتا ہے اُس کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے۔ خود اپنے سپاہیوں کے دلوں میں شکوک اور شبے پیدا ہو گئے ہیں۔“

”کیا تم میں کوئی اتنا دلیر اور جرأت مند نہیں تھا جو وہاں جا کر دیکھتا جہاں تمہارا کمانڈر زمین میں دھنس گیا ہے، وہاں گڑھا تو نہیں؟“۔۔۔ سارگی نے کہا۔ ”پہاڑی علاقوں میں گھاس اور جھاڑیوں کے نیچے چھپے ہوئے گڑھے ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہاں گڑھا کھودا گیا ہو اور لڑکیاں محض شعبدہ ہوں .... محترم امام! کیا آپ ایمان کی قوت سے واقف نہیں؟ کیا آپ نہیں جانتے کہ ایمان مضبوط ہو تو کوئی شعبدہ کامیاب

نہیں ہو سکتا؟"

امام خاموش رہا۔ سپاہی بھی چپ رہا۔

"میں تمہارے ساتھ چلوں گا" — سارنگ نے کہا — "سلطان مجھے یہاں اس ملک کی پاسبانی کے لیے نہیں بلکہ اسلام کے فروغ کے لیے اور اس عظیم مذہب کی پاسبانی کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔"

یہ واقعات کالنجر کے علاقے کے ہیں۔ کالنجر جنوبی کشمیر کا علاقہ تھا جس میں کوٹلی، بھمبر اور پونچھ تک کا علاقہ شامل تھا۔ آگے چل کر کسی دور میں کالنجر کوٹلی بن گیا اور یہ آج بھی کوٹلی کہلاتا ہے۔ راجوری کے قریب لوہ کوٹ یا لوہا کوٹ کا ایک قلعہ ہوا کرتا تھا۔ اسے لوہا اس لیے کہا جاتا تھا کہ یہ ایک پہاڑی پر بنایا گیا تھا۔ بلندی کے علاوہ اس کی مضبوطی بھی مشہور تھی اور اسے ناقابل تسخیر کہا جاتا تھا۔ کالنجر کا مہاراجہ نندہ رائے تھا۔ پنجاب سے جب بھی کسی مہاراجے نے شکست کھائی وہ بھاگ کر کالنجر جا پہنچا کیونکہ وہ بڑا مضبوط گوشۂ عافیت تھا۔ جے پال سلطان محمود سے شکست کھا کر وہیں پناہ گزیں ہوا تھا۔ اس کے بیٹے انند پال نے سلطان سے شکست کھائی تو وہیں بھاگ گیا۔ اب بھیم پال نندر کو غزنی کی فوج نے نندر جوگیاں کے علاقے میں شکست دی تو وہ بھی کشمیر کی وادیوں میں جا چھپا۔

تفصیل سے پچھلی قسط میں بیان کیا جا چکا ہے کہ سلطان محمود غزنوی بھیم پال نندر کے تعاقب میں کشمیر تک جا پہنچا۔ راجہ نندہ رائے کے ایک [illegible] تنگا نے سلطان کے ہراول دستے کو گھیر کر بالکل ہی ختم کر دیا لیکن اس کی اُسے یہ قیمت ادا کرنی پڑی کہ اُسے سلطان محمود کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ تنگا اپنے دوستوں کے ساتھ جنگی قیدی ہو گیا۔ سلطان محمود اس قدر غصے میں تھا کہ اُس نے تنگا اور اس کے تمام کمانڈروں کو ہلاک کر کے لاشیں دریائے جہلم میں پھینک دیں اور اس کے سپاہیوں کو غلاموں کی حیثیت سے غزنی بھیج دیا تھا۔ اس کے بعد سلطان نے حکم جاری کر دیا کہ لوگ اسلام قبول کر لیں ورنہ بستیاں اجاڑ دی جائیں گی۔

مہاراجہ نندہ رائے کو جرأت نہ ہوئی کہ قلعے سے باہر آ کر سلطان محمود کا مقابلہ کرتا۔

اُس کی فوجی طاقت خاصی کمزور ہو گئی تھی۔ سلطان نے اُسے پیغام بھیجا کہ وہ راجہ بھیم پال کو اُس کے حوالے کر دے یا بھیم پال کی طرح باجگزار ہو جائے۔ راجہ نندہ رائے نے دوسری شرط قبول کر لی۔ بھیم پال نندر پہلے ہی باجگزار تھا۔ معاہدے کے مطابق کالنجر کے علاقے میں بھی سلطان محمود نے دو تین چوکیاں قائم کر دیں جن میں ایک کماندار کی کمان میں تھوڑی سی نفری رکھ دی اور خود غزنی چلا گیا۔ اُس نے وہاں کی تمام آبادی کو مسلمان ہو جانے کا حکم دے دیا تھا اور اُس نے یہ انتظام بھی کر دیا تھا کہ پشاور، لاہور، ملتان اور بھیرہ سے ایسے بہت سے مسلمانوں کو جو مذہبی سبق دے سکتے تھے، کشمیر بھجوا دیا تھا۔

"کسی پر کوئی مذہب ٹھونسا نہیں جا سکتا" — سلطان محمود نے (مستند مورخوں کے مطابق) کہا تھا — "میں نے بے شک حکم دیا ہے کہ یہاں کا ہر فرد و بشر مسلمان ہو جائے لیکن میں کفار کا یہ الزام صحیح ثابت نہیں کرنا چاہتا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا گیا تھا۔ یہاں کے لوگ گنوار اور اجڈ ہیں۔ یہ لوگ حاکم کے حکم کو مذہب سمجھتے ہیں۔ ان کا مذہب وہی ہے جو اُن کے مہاراجہ کا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں بتایا جائے کہ مذہب کا تعلق خدا کے ساتھ ہے، کسی انسان کے ساتھ نہیں اور خدا مٹی اور پتھر کا بت نہیں .... اس علاقے میں مسجدیں کھڑی کر دو تاکہ یہ لوگ باجماعت نماز پڑھیں تو انہیں پتہ چلے کہ سب انسان برابر ہیں۔ کوئی امیر ہے یا غریب، راجہ ہے یا رعایا، ہر کسی کا ماتھا ایک ہی طرح ایک ہی زمین پر سجدے میں رگڑا جاتا ہے۔"

ایک مشہور تاریخ دان سر آرل سٹین کی تحریر کے مطابق سلطان محمود غزنوی نے کہا تھا — "چونکہ لوگوں کو اسلام کی عظمت اور برکت عملاً نہیں دکھائی جاتی اور سلطان کہتا کچھ اور کرتا وہ ہے جو اُس کی اپنی ذات کی عظمت کے لیے موزوں ہوتا ہے، اس لیے مسلمان اپنے ہی مذہب سے منحرف ہو جاتے ہیں۔ میں اپنی سلطنت میں یہ برداشت نہیں کروں گا۔ ان لوگوں کو ذہن نشین کرا دو کہ خدا کیا ہے۔ اس کا رسول کون ہے اور ان کے احکام کیا ہیں۔"

مہاراجہ نندہ رائے کی شکست خوردہ حکومت دو قلعوں کے اندر قید ہو گئی تھی۔ باہر سلطان محمود اللہ کی حکمرانی قائم کرنے کے احکام دے گیا تھا۔ پشاور، لاہور، ملتان اور بھیرہ

سے بہت سے ایسے مسلمانوں کو جو تبلیغ اور امامت کرا سکتے تھے، بلا کر علاقے میں پھیلا دیا گیا تھا۔ بعض جگہوں پر مسجدیں تعمیر ہونی شروع ہو گئی تھیں اور بیشتر گاؤں میں لکڑی کا ایک جھونپڑا کھڑا کر کے اسے مسجد بنا لیا گیا تھا۔

اس خطے کے رہنے والوں کا مذہب وہی تھا جو ان کے مہاراجہ کا تھا۔ ان کا مذہب پیٹ سے تعلق رکھتا تھا یا اپنی جان سے۔ اب انہوں نے مسلمان فوج کو فاتح دیکھا تو اس کا مذہب اختیار کر لیا۔ سلطان محمود اسلام کو ان کی روحوں میں اتار دینے کا اہتمام کر گیا تھا مگر ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے لیے یہ بہت بڑی شکست تھی۔ بھیم پال نندا کالنجر یا لوہ کوٹ کے قلعے میں پناہ لینے کی بجائے کشمیر کی کسی دور دراز وادی میں چھپا رہا۔ جب اسے بتایا گیا کہ سلطان محمود واپس چلا گیا ہے تو وہ کسی ویران راستے سے لاہور پہنچ گیا۔

بہت دنوں بعد لاہور میں دوسری ریاستوں کے راجے مہاراجے جمع ہو گئے۔ اس اجتماع میں بڑے بڑے مندروں کے پنڈت بھی شریک تھے اور ایک بار پھر تجویزیں اور منصوبے پیش ہو رہے تھے کہ اسلام کے سیلاب کو کس طرح روکا جائے۔ پنڈت حسب معمول فوجی حکام کو لعن طعن کر رہے تھے۔ بعض نے سلطان محمود کو قتل کرنے پر زور دیا۔ دبی دبی سی ایک آواز یہ بھی سنائی دی کہ سلطان محمود کو اب دریائے سندھ کے پار پشاور سے بھی دور روکا جائے اور اس کی فوج کو پہاڑیوں کے اندر گھیر کر بھوکا اور پیاسا مار دیا جائے، مگر اس اجتماع میں کسی بھی تجویز پر اتفاق نہیں ہو رہا تھا۔

"آپ سب میں اتفاق اور اتحاد صرف اس لیے پیدا نہیں ہو رہا کہ آپ کو اپنے اپنے راج کا فکر ہے" — بڑے پنڈت نے کہا۔ "آپ سب مسلمانوں سے ڈر گئے ہیں۔ تعداد میں مسلمانوں کی فوج ہمیشہ تھوڑی ہوتی ہے اور وہ اتنی دور سے آکر لڑتی ہے۔ یہاں کا بچہ بچہ اس فوج کا دشمن ہے۔ یہاں کی زمین اس فوج کی دشمن ہے مگر فتح ہر بار مسلمانوں کی ہوتی ہے۔ ذرا غور کرو کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ کیا محمود دیو ہے، جن ہے، بھوت ہے؟.... وہ آپ کی طرح کا انسان ہے لیکن وہ آپ سب پر اس لیے غالب آگیا ہے کہ اس کا مذہب جو کچھ بھی ہے وہ اپنے مذہب کا شیدائی ہے۔ اسی

کو مسلمان ایمان کہتے ہیں۔ یہی ان کی طاقت ہے۔ آپ میں سے کسی کو بھی اپنے مذہب کا کچھ خیال نہیں۔ آپ کے سامنے اپنا دھرم نہیں، بلکہ اپنا آپ، اپنا تخت اور اپنا تاج ہے۔"

سب خاموش تھے۔ پنڈت نے سب پر نگاہ دوڑائی۔

"ہندوستان ہندوؤں کا دیس ہے، ہندوستان دیوتاؤں اور دیوتاؤں کا دیس ہے۔ یہ اللہ اکبر کا نہیں، ہری کرشن اور ہر ہر مہادیو کا دیس ہے مگر ہمارے مذہب کی جو توہین ہو رہی ہے، وہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ دھرتی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ کسی ایک بھی مسلمان کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر آج آپ نے اس دھرتی کی پکار نہ سنی تو ہماری یہ نسل جو جوان ہو رہی ہے مسلمانوں کی غلام ہو گی اور کرشن مراری کی بنسری ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائے گی۔ اپنی آنے والی نسلوں کو اس قہر سے بچاؤ۔ یاد کرو کہ ہمارے باپ دادا نے محمد بن قاسم کا لگایا ہوا اسلام کا پودا جو درخت بن گیا تھا، کس طرح اکھاڑا تھا۔ اس درخت کی جڑیں چندر گپت اور اشوک کے اس دیس کی دھرتی میں دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ ہمارے پنڈتوں اور رشیوں نے دھرم کی لگن دل میں رکھ کر یہ جڑیں اکھاڑ پھینکی تھیں۔ انہوں نے اذانیں خاموش کر دی تھیں....

"جس پاپ کی آپ سب کو سزا مل رہی ہے، وہ یہ ہے کہ آپ نے اس جنگ کو اپنے راج پاٹ کی جنگ سمجھ لیا ہے۔ اپنے خیال بدل ڈالو۔ یہ دو مذہبوں کی جنگ ہے اور جو مذہب جیت رہا ہے وہ اسلام ہے۔ اسلام پھیل رہا ہے۔ شکست مہاراج بھیم پال نندا کو نہیں ہوئی، ہندو مت کو ہوئی ہے۔ کالنجر کے اتنے وسیع علاقے کے لوگوں کو ڈرا کر مسلمان بنا لیا گیا ہے اور وہاں مولویوں اور اماموں کی ایک فوج بھیج دی گئی ہے۔ اگر وہاں اسلام لوگوں کے دلوں میں اتر گیا تو آپ کبھی بھی اسلام کو اس دیس سے نہیں نکال سکیں گے۔"

"ہمارے جیسے یہ باتیں نہیں سنیں گے" — مہاراجہ بھیم پال نندا نے کہا — "اب سوچنا یہ ہے کہ کالنجر کے علاقے میں جس طرح اسلام کا بیج بویا جا رہا ہے، اس کا کیا علاج کیا جائے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے محمود سے شکست کھائی ہے اور کالنجر کی فوج بھی محمود کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ مجھے تمام مہاراجوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک فیصلہ کن جنگ لڑنی ہے۔"

"آپ نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے تو یہ بھی تسلیم کریں کہ آپ آئندہ بھی شکست کھا سکتے ہیں"۔ پنڈت نے کہا۔ "تیاری میں وقت لگے گا اگر یہ جنگ فیصلہ کن نہ ہوئی تو جنگ کے لیے تیاری میں مزید وقت ضائع ہوگا۔ فوری ضرورت یہ ہے کہ کالنجر میں جس طرح تمام تر آبادی کو مسلمان بنا لیا گیا اور اسلام کو ان کے دلوں میں اتارنے کا جو اہتمام کیا گیا ہے، اس کا توڑ سوچا جائے۔"

"آپ وہاں اپنے مذہب کا پرچار نہیں کر سکتے"۔ کالنجر کے راجہ نندہ رائے نے کہا۔ "سلطان محمود وہاں اپنی چوکیاں قائم کر کے کچھ فوج وہاں چھوڑ گیا ہے۔ یہ فوج گشت پر رہتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس فوج کو سلطان محمود یہ اختیار دے گیا ہے کہ جو کوئی ہندو مت کا پرچار کرے اسے وہیں قتل کر دو۔ وہاں اگر ہندو مت رہ گیا ہے تو وہ میرے قلعے میں ہے۔ باہر اسلام کی باتیں اور چرچے ہیں اور جن مولویوں اور اماموں کا ذکر آپ نے کیا ہے، انہیں اپنی فوج کا تحفظ حاصل ہے۔"

"ہر کام تلوار سے نہیں کیا جا سکتا"۔ بھیم پال نندر کے وزیر نے کہا۔ "شعبدے دکھاؤ۔ اگر ان لوگوں کو اسلام قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو حکم چلائے بغیر انہیں ہم اسلام سے متنفر کر سکتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف شکوک پیدا کر سکتے ہیں۔ کہاں ہیں اس فن کے اُستاد؟ ..... انہیں استعمال کرو۔ کالنجر کے جنگل، پہاڑ اور وادیاں اس کام کے لیے موزوں ہیں۔ وہاں کے لوگوں کو ڈراؤ، فریب دو اور خوبصورت چسکے بھی۔ محمود اپنی فوج کی جو تھوڑی سی نفری چھوڑ گیا ہے، اس پر خوف بھی طاری کرو اور انہیں حسین جال میں بھی پھانس کر بیکار کر دو۔ ان میں سے کچھ آدمیوں کو اپنے ہاتھ میں لو۔ اس دوران جنگی تیاری کرتے رہو۔ اگر ہم نے وہاں اپنی درپردہ کارروائیاں نہ کیں تو وہ علاقہ مسلمانوں کا گڑھ بن جائے گا اور ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔"

"انسان کی کمزوریوں کو استعمال کرو"۔ بڑے پنڈت نے کہا۔ "پیار اور خوف ہر

کسی کی کمزوری ہے۔ پیار اور محبت کا پیغام خواہ جھوٹا ہی ہو، انسان اسے فوراً قبول کرتا ہے۔ مسلمان کو زہر پیار میں لپیٹ کر دو، اور ان لوگوں کے ذہنوں میں ایسے توہمات ڈال دو جو اُن پر خوف طاری کریں۔ افواہیں پھیلاؤ، جھوٹ پھیلاؤ۔ اسلام پھیلانے والے اور اسلام قبول کرنے والے آپ کے جال میں آ جائیں گے۔"

یہ ایسی تجویز تھی جو سب کو پسند آ گئی اور سب نے اس پر اتفاق کیا۔

۱۰۱۴ء کی آخری سہ ماہی میں آج کے جنوبی کشمیر میں ایسے واقعات رونما ہونے لگے تھے کہ وہاں توہمات اور خوف کی حکمرانی تھی۔ جن گاؤں میں کوئی مافوق الفطرت واقعہ نہیں ہوا تھا وہاں دوسری جگہوں سے افواہیں پہنچ جاتی تھیں۔ ان کے مطابق پہاڑ آگ اگلتے تھے۔ آسمان صاف ہوتا تھا مگر بجلی چمکتی تھی۔ بڑی خوبصورت چڑیلیں مسافروں کے راستے روکتی تھیں۔ لوگ سن کر ہی ڈر جاتے تھے اور یہ ڈر اُس وقت دہشت بن جاتا تھا جب کوئی اجنبی خوف سے کانپتے ہوئے انہیں سناتا تھا کہ غزنی کے مسلمان لوگوں کے بچوں کو ذبح کر کے کھاتے ہیں۔

سلطان محمود کی فوج کی ایک چوکی کا کمانڈر زبیر جلالی زمین میں دھنس گیا تھا۔ یہ حادثہ بڑا سنگین تھا۔ اس کی اطلاع ساردگ تک پہنچانا ضروری تھا۔ تمام چوکیاں جو کالنجر میں قائم کی گئی تھیں، ان کا کمانڈر ساردگ تھا جس کا ہیڈ کوارٹر مرجرگیاں کے مقام پر تھا۔ اُسے امام اور سپاہی نے آ کر اطلاع دی تو وہ کالنجر کو روانہ ہو گیا۔ اس کے قافلے میں اُس کے چند ایک محافظ تھے۔ قافلہ گھوڑوں پر سوار تھا اور ان کا سامان خچروں اور ٹٹوؤں پر لدا ہوا تھا۔ اُن سے کچھ دُور دُور دو گھوڑ سوار جا رہے تھے جو لباس اور چال ڈھال سے غریب اور بے ضرر مسافر لگتے تھے۔ وہ ساردگ کے قافلے کو دیکھ کر آگے نکل گئے۔

امام اور سپاہی جب کشمیر سے آ رہے تھے تو وہ دیکھ نہیں سکے تھے کہ یہی دونوں گھوڑ سوار اسی طرح اُن سے کچھ دُور دُور چلے آ رہے تھے۔ جب امام اور سپاہی بالاتھ میں داخل ہوئے تو گھوڑ سوار کہیں چلے گئے تھے۔ اب ساردگ، امام اور سپاہی کے ساتھ روانہ ہوا تو دو سوار اُن سے دُور دُور چلے جا رہے تھے۔

ساروگ کو کسی گائیڈ کی ضرورت نہیں تھی۔ امام اور سپاہی راستے سے واقف تھے۔ وہ مسافت کی عام رفتار سے تیز چلے جا رہے تھے۔ اُن کے نیچے سے اونچی نیچی زمین، پتھریلے کھڈ نالے گھاٹیاں اور ٹیلے پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔ انہیں کشمیر کے پہاڑوں کی برف پوش، سپید سپید چوٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ امام ساروگ کو بتا رہا تھا کہ ان چوٹیوں کے دامن میں جو خطہ ہے وہ کس قدر حسین ہے اور وہاں کے لوگوں کا حسن اس خطے سے زیادہ دلکش ہے۔

سفر کی پہلی رات چٹانوں اور ٹیلوں کے علاقے میں آئی۔ قافلہ رات بھر کے لیے رُک گیا۔ موسم سرد تھا۔ قافلہ جب منزل کو روانہ ہونے لگا تو ایک گھوڑا بڑی زور سے ہنہنایا اور بے لگام ہو کر دوڑ پڑا۔ یہ ایک محافظ کا گھوڑا تھا۔ ابھی سوار اس کی پیٹھ پر نہیں بیٹھا تھا۔ محافظ نے چلا کر کہا — سانپ..... ناگ — اس کے ساتھ ہی ایک اور گھوڑا ڈر کر دوڑ پڑا۔ گھوڑے اور ٹٹو چلنے کو تیار تھے اس لیے کھلے گھومتے تھے۔ دو گھوڑوں کی خوفزدہ آوازیں سن کر تمام گھوڑے، خچر اور ٹٹو ڈر کر بھاگ اُٹھے۔ کسی پر کوئی سوار نہیں تھا۔

سب نے دیکھا کہ ایک ڈیڑھ گز لمبا سانپ رینگ رہا تھا۔ وہ علاقہ سرسبز تھا۔ گھاس اونچی بھی تھی اور چھوٹی چھوٹی بھی خودرو پودے تھے اور درخت بھی۔ وہاں چٹانیں اور ٹیلے تھے۔ خچر اور ٹٹو سامان سمیت بھاگ گئے تھے۔ کسی کو سانپ کو مارنے کا ہوش نہ رہا۔ اصل مسئلہ گھوڑوں کو پکڑنے کا تھا۔ علاقہ ایسا تھا کہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ جانور کدھر نکل گئے ہیں۔ سب اُن کے پیچھے دوڑ پڑے۔ سانپ سے ڈرے ہوئے جانور کو پکڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

وہ سب چٹانوں اور ٹیلوں میں غائب ہو گئے تو ایک چٹان کی اوٹ سے دو آدمی سامنے آئے۔ سانپ آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ ان میں سے ایک آدمی نے سانپ کو گردن سے پکڑا اور پرے لے جا کر اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ بندھے ہوئے تھیلے میں ڈال کر تھیلے کا منہ بند کر دیا۔ وہاں ایک اور گھوڑا کھڑا تھا۔ وہ آدمی ایک گھوڑے پر سوار ہوا اور دوسرے کی لگام پکڑ کر ادھر آ گیا۔ اُس کا ساتھی گھوڑے پر سوار ہوا اور

دونوں وہاں سے غائب ہو گئے۔

"آج کا دن تو یہ اپنے گھوڑے ٹٹو پکڑتے رہیں گے" — ایک نے کہا۔ "آگے چلو۔ یہ واپس نہیں جائیں گے" — "ہو سکتا ہے واپس چلے جائیں" — دوسرے نے کہا — "ان پر نظر رکھو۔"

دن کا پچھلا پہر تھا جب ساروگ کا قافلہ اس حال میں کالنجر کی طرف چلا جا رہا تھا کہ نصف قافلہ پیدل تھا اور سامان والے صرف دو ٹٹو ساتھ تھے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے ان دو چار گھوڑوں اور دو ٹٹوؤں کو پکڑا تھا۔ ساروگ رستم کا بیٹا تھا۔ میدانِ جنگ کا دھنی تھا۔ کسی دشواری اور کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اُس نے قافلے سے کہا کہ جو پیدل چلتے تھک جائے وہ گھوڑے پر سوار ہو جائے۔ میں خود پیدل چلوں گا۔ ہندوستان کے ناگ ہمارا راستہ نہیں روک سکتے۔

اب راستہ پہاڑیوں کے اندر سے گزرتا تھا۔ ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف دُور نیچے کو گئی ہوئی ڈھلان تھی۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر راستہ مڑتا تھا۔ کبھی دو پہاڑیوں کے درمیان چلا جاتا تھا۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتے جا رہے تھے، سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہوائیں یخ ہوتی جا رہی تھیں۔ اگر ان کے پاس کھانے پینے کا سامان نہیں تھا تو بھی بھوک اور پیاس سے مرنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا..... وہاں پانی کی بہتات تھی اور پھلدار درخت بھی تھے۔ بچے کچھے گھوڑوں کے لیے گھاس ہی گھاس تھی۔

قافلے نے رات چٹانوں میں قدرتی گفاؤں میں گزاری۔ گھوڑے باہر بندھے رہے۔ روانگی کے لیے گھوڑوں پر زینیں ڈالی گئیں اور قافلہ روانہ ہو گیا۔ ساروگ خود پیدل چلنے لگا۔ اُس نے امام کو ایک گھوڑے پر سوار کر دیا۔ چونکہ وہ خود پیدل چل رہا تھا اس لیے اُس کے محافظ بھی پیدل چلنے لگے — اور اچانک امام کا گھوڑا رک کر تھر تھر کانپنے لگا۔ گھوڑوں کی کیفیت کو وہی سمجھ سکتے ہیں جن کی زندگی گھوڑوں کے ساتھ گزری ہو۔ ساروگ نے گھبرا کر کہا — "گھوڑے سے کود آؤ" — اور امام گھوڑے سے کود آیا۔ معاً گھوڑا خوف

سے ہنہنا کر بھاگ اُٹھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے گھوڑے بھی بے قابو ہو کر ہنہنانے لگے۔

"سانپ۔ سانپ" ۔۔۔ کسی نے چلا چلا کر کہا۔

اب ایک کی بجائے دو سانپ تھے۔ دونوں ایک ہی رنگ کے اور ایک ہی لمبائی کے تھے۔ گھوڑے لگاموں میں چھڑا کر ادھر اُدھر بھاگ اُٹھے تھے اس لیے سب انہیں پکڑنے کو دوڑے، سانپوں کو مارنے کا کسی کو ہوش نہ رہا۔ دو گھوڑے ڈھلان سے پھسل کر نیچے گرے، پیچھے سیلابی جلم بہا چلا جا رہا تھا۔ ساروگ کے محافظ دور اوپر کھڑے گھوڑوں کو دریا میں بہتا دیکھتے رہے۔

قافلے کے تمام آدمی جب ہری بھری چٹانوں میں گھری ہوئی اس جگہ سے جہاں انہوں نے رات گزاری تھی، چلے گئے تو دو آدمی سامنے آئے جو چھپ چھپ کر قافلے کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے دونوں سانپوں کو پکڑ لیا اور تھیلے میں ڈال کر تھیلا ایک گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ دیا۔

ساروگ کے آدمیوں نے ایک دو گھوڑے اور ایک ٹٹو پکڑ لیا اور منزل کو روانہ ہو گئے۔

"ایسا ہو نہیں سکتا" امام نے ساروگ سے کہا۔ "یہ علاقہ سانپوں کا نہیں۔ اگر یہاں سانپ ہیں بھی تو باہر نہیں نکل سکتے کیونکہ سردی ان کے لیے قابلِ برداشت نہیں۔ میں اس پہاڑی کے ساتھ اسی راستے گزرا تھا۔ رات کو اس جگہ قیام کیا تھا۔ ہمیں کوئی سانپ نظر نہیں آیا تھا"۔

"پھر سوچو" ۔۔۔ ساروگ نے کہا "آپ راستہ بھول گئے ہیں۔ کوئی آبادی دیکھتے ہیں۔ اس علاقے میں راستے سے بھٹک جانا کوئی بڑی بات نہیں"۔

ساروگ کا حوصلہ ابھی تک قائم تھا۔ وہ قافلے کو پیدل لے جا رہا تھا۔ سب کو حوصلہ دے رہا تھا اور وہ اس وہم میں مبتلا ہو گیا تھا کہ امام اُسے غلط راستے پر لیے جا رہا ہے۔ وہ چلتے گئے اور شام سے ذرا پہلے انہیں ایک موڑ مڑتے ہی دو گھوڑ سوار آتے نظر آئے۔

سوار اُن کے قریب آ کر رک گئے۔ وہ کود کر گھوڑوں سے اترے اور سڑک کے کنارے گھٹنے ٹیک کر اور ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ساروگ اُن کے قریب جا رکا۔ ان دونوں نے سر جھکا لیے۔ ساروگ نے امام سے کہا کہ آپ ان کی زبان جانتے ہیں۔ انہیں اٹھاؤ اور ان سے راستہ پوچھو۔

امام نے انہیں اٹھنے کو کہا ۔۔۔ وہ اٹھے اور ایک نے ہاتھ جوڑتے ہوئے بھکاریوں کے لہجے میں کہا "ہم آپ کے غلام ہیں۔ آپ مسلمان ہیں، ہم نے آپ کا مذہب قبول کر لیا ہے"۔

امام نے انہیں اپنی منزل بتا کر پوچھا "کیا ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں؟"

"نہیں" ۔۔۔ ایک نے کہا "ہم آپ کو بہت دور سے دیکھ کر آئے ہیں۔ ہم حیران ہیں کہ آپ اس علاقے سے زندہ کس طرح نکل آئے ہیں۔ اسے ہم موت کی وادی کہا کرتے ہیں۔ اس علاقے میں تو شیر بھی نہیں آتا۔ یہ سانپوں کا علاقہ ہے۔ آپ جدھر جا رہے ہیں، اُدھر ہر درخت کے ساتھ ایک سانپ لپٹا ہوا نظر آئے گا۔ آپ یہ راستہ چھوڑ دیں" ۔۔۔ اور وہ راستہ بتانے لگا، پھر بولا "مگر آپ نہیں سمجھ سکیں گے۔ تین چار موڑ مڑ کر آپ بھول جائیں گے کہ کدھر جانا ہے۔ ہم دونوں آپ کے ساتھ چلیں گے"۔

امام نے ساروگ کو بتایا تو ساروگ نے کہا کہ انہیں ساتھ لے چلو۔ ہم انہیں اُجرت دیں گے۔

دونوں سوار اس پیدل قافلے کے گائیڈ بن گئے۔ راستے میں ساروگ نے امام کی معرفت ان آدمیوں سے پوچھا کہ وہ ان عجیب و غریب واقعات سے واقف ہیں جو کالنجر کے علاقے میں رونما ہو رہے ہیں؟

"ہم اُدھر سے ہی بھاگ کر آئے ہیں" ۔۔۔ ایک آدمی نے جواب دیا "ہم اپنے بال بچوں کو اُدھر لے آئے ہیں"۔

"کیا تم نے پہاڑوں سے آگ نکلتی دیکھی ہے؟"

"ہم بہت دور رہتے تھے" ۔۔۔ اسی آدمی نے جواب دیا "ہم نے دور سے دیکھی

دیکھی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اُدھر سے آسمان جل رہا ہو۔ راتوں کو بجلی چمکتی دیکھی ہے
.... اور آوازیں آتی ہیں کہ اپنا مذہب نہ چھوڑو۔"

"تم نے بھی اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کیا ہے؟"

"ہاں!" ــــ اُس نے کہا۔ "ہم اسلام کو سچا مذہب سمجھتے ہیں اس لیے اُدھر سے بھاگ آئے ہیں۔ ہم آپ کا مذہب نہیں چھوڑیں گے۔"

دونوں باری باری سارنگ کو وہ واقعات سناتے رہے جو امام اور سپاہی نے سارنگ کے پاس آکر اُسے سنائے تھے۔ دونوں آدمی ڈرے ہوئے تھے اور امام انہیں تسلی دے رہا تھا کہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا .... وہ آدمی غلاموں کے انداز سے آگے آگے چلے جا رہے تھے۔

دیوکوٹ جنوبی کشمیر میں ایک گاؤں ہوا کرتا تھا جو دیودار اور چیل کی لکڑی کے بنے ہوئے بیس پچیس گھروں سے مل کر بنا تھا۔ اس کی ساری آبادی ہندو تھی اور وہاں لکڑی کا مندر بھی تھا۔ اس سے تھوڑی دور غزنی کی فوج کی ایک چوکی تھی جس میں تیس کے لگ بھگ سپاہی رہتے تھے اور اُن کا ایک کماندار ازمیر تھا جو ملتان کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ کسی وقت وہ قرامطی ہوا کرتا تھا۔ سلطان محمود نے ملتان کو فتح کر کے قرامطیوں کی اصلیت بے نقاب کر دی تو قرامطیوں نے سنی عقیدہ قبول کر لیا۔ ان میں ازمیر بھی تھا۔

ایک روز وہ دو سپاہیوں کے ساتھ روزمرہ گشت پر گاؤں میں گیا۔ سلطان محمود کے حکم سے وہاں سے مندر ہٹا کر مسجد بنا دی گئی تھی اور وہاں ایک امام بھی مقرر کر دیا گیا تھا جو وہاں کے لوگوں کو اسلام کے سبق دیتا اور انہیں اسلامی عبادت سکھا رہا تھا۔

اس گاؤں کے لوگ بھی دہشت زدہ تھے۔ انہوں نے قریب کی پہاڑی پر بجلی چمکتی اور اس کی روشنی گاؤں پر پڑتی دیکھی تھی۔ امام نے ایک رات باہر جا کر ایسی ہی روشنی میں تین لڑکیاں بالکل برہنہ دیکھی تھیں۔ ہوا بہت تیز تھی جس سے اُن کے بال اُڑ اُڑ کر ان کے چہروں کو ڈھانپ رہے تھے۔ وہ چٹان کی ڈھلان پر چیل کے پیڑوں کے درمیان کھڑی تھیں۔ رات تاریک تھی۔ سامنے والے پہاڑ پر چمک ہوئی اس کی روشنی

اس چٹان پر پڑی۔ امام اتفاق سے باہر کھڑا تھا۔ اُسے اس روشنی میں جو بہت تیز نہیں تھی، یہ لڑکیاں نظر آئیں۔ روشنی بجھ گئی۔ ذرا دیر بعد پھر روشنی اسی جگہ پڑی تو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

امام نے احکام کے مطابق قریبی چوکی میں جا کر کماندار ازمیر کو بتایا تھا کہ رات اُس نے کیا دیکھا ہے۔ اُس نے ازمیر کو یہ بھی بتایا تھا کہ گاؤں کے لوگ اُس کے پیچھے پڑے ہوتے ہیں کہ اگر اسلام خدا کا مذہب ہے تو امام انہیں اس کا معجزہ دکھائے۔ گاؤں کے لوگ کہتے تھے کہ انہیں اپنا مذہب تبدیل کرنے کی سزا مل رہی ہے اور بہت بڑی آفت آ رہی ہے۔

ازمیر گاؤں میں گیا۔ اُس نے لوگوں کا خوف دور کرنے کی کوشش لیکن وہ خود گھبرایا ہوا تھا۔ وہ عالم فاضل نہیں تھا۔ ولی اللہ نہیں تھا۔ پیغمبر نہیں تھا۔ اس کے پاس کوئی ٹھوس دلیل نہیں تھی جس کے زور پر وہ ڈرے ہوئے لوگوں کو قائل کرتا۔ اُس کے پاس ایک ہی دلیل تھی جو اُس نے ان الفاظ میں دی ــــ "اگر کسی نے اسلام کے خلاف بات کی تو اُس کی گردن اُڑا دی جائے گی۔"

وہ امام کے ساتھ مسجد میں چلا گیا اور امام سے کہا ــــ "میں فوجی ہوں۔ آپ امام ہیں، عالم ہیں۔ کیا آپ کا علم یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں کو کچھ بتائیں، ورنہ مسلمان سپاہی بھی اسلام سے دستبردار ہو جائیں گے۔ میں ہاتھوں سے لڑ سکتا ہوں اور لڑا ہوں۔ میں نے قلعوں کی دیواریں پھلانگی ہیں مگر مذہب کے معاملے میں اُجڈ اور بڑا ہی کمزور انسان ہوں۔ مجھے یہاں اس لیے رکھا گیا ہے کہ اسلام کی پاسبانی اور آپ کی حفاظت کروں۔ سلطان کا حکم ہے کہ لوگوں کے دلوں پر قبضہ کرو مگر یہاں ایسے واقعات ہو رہے ہیں کہ لوگوں کے دل شکوک اور خوف سے بھر گئے ہیں۔ مجھے کچھ بتائیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں بھی گمراہ ہو جاؤں۔"

امام کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ ازمیر وہاں کے لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر واپس آگیا۔ وہ پریشان اور مضطرب تھا۔ اُسے گاؤں کے لوگوں کی یہ آوازیں جیسے تنہائی میں بھی سنائی دے رہی تھیں ــــ "اگر اسلام سچا مذہب ہے تو اس کا معجزہ دکھا

اُس کی چوکی ایک پہاڑی کی ڈھلان پر تھی۔ یہ بھی لکڑی کا ایک دو منزلہ مکان تھا۔ رات کو ازمیر بالائی منزل کی کھڑکی کھولے باہر دیکھ رہا تھا۔ رات اندھیری تھی اور سرد بھی تھی۔ اُسے باہر کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ کشمیر کے پھولوں کی مہک اُسے مسحور کر رہی تھی۔ وہ اسلام کا شیدائی تھا مگر یہاں آکر اسلام کڑے امتحان میں پڑ گیا تھا۔ ازمیر کو یقین تھا اور یہ اُس کا ایمان تھا کہ ہندوؤں کا مذہب باطل ہے اور بُت پرستی کفر ہے مگر اُس کے لیے ثابت کرنا محال ہو گیا تھا کہ اُس کا مذہب برحق ہے۔

اُسے دُور کسی پہاڑ کی چوٹی پر یا ڈھلان پر روشنی سی نظر آئی۔ اچھی خاصی چمک تھی۔ یہ روشنی ایک دو بار چمکی اور بجھ گئی۔ ازمیر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ سوچنے لگا کہ کل کسی گاؤں سے یہ خبر آئے گی کہ رات اُن کے گاؤں پر بجلی گری تھی یا یہ کہ رات ایک پہاڑی نے شعلے اُگلے تھے۔

کمانڈار ازمیر اتنا پریشان ہوا کہ قبلہ رُو ہو گیا اور اُس کے ہاتھ اپنے آپ دعا کے لیے اُٹھے۔ وہ گڑگڑایا ــــــ "خدائے ذوالجلال! اپنے نام کی لاج رکھ لو۔ اپنے مذہب کی لاج رکھ لو۔ مجھے اپنے نور کی چمک دکھاؤ کہ میں باطل کی ان روشنیوں کا راز پا کر انہیں بجھا سکوں"۔

اگلی صبح اُس کے دل پر یہی بوجھ تھا۔ وہ اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اپنے مذہب کی عظمت ثابت کرے مگر اُس کے پاس اتنا علم نہیں تھا اور اتنی عقل بھی نہیں تھی۔ سورج اُوپر اُٹھ آیا تو وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اکیلا ہی باہر نکل گیا۔ وہ لوگوں کے جھونپڑوں میں جا کر اُن کی باتیں سننا چاہتا تھا۔

اُس زمانے میں اس علاقے کا جنگل گھنا تھا اور اس میں درندے بھی پائے جاتے تھے۔ ریچھ بھی کہیں کہیں نظر آتا تھا۔ ازمیر کے پاس برچھی تھی اور کمان بھی۔ وہ چوکی سے کچھ دُور جنگل میں چلا گیا۔ آگے ایک ندی تھی۔ اُسے عورتوں کے ہنسنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اُس نے درختوں کی اوٹ میں جا کر دیکھا تین جوان لڑکیاں ندی میں نہا رہی تھیں اور

ایک دوسری پر پانی کے چھینٹے پھینک رہی تھیں۔ کمر کے اوپر سے وہ برہنہ تھیں۔ اس سے نیچے ہر لڑکی نے باریک سا کپڑا باندھ رکھا تھا۔

ازمیر لڑکیوں کے حُسن پر حیران نہ ہوا کیونکہ خدا نے اس خطّے کو نسوانی حُسن سے نوازا تھا۔ حیران وہ اس پر ہوا کہ قریب کوئی آبادی نہیں تھی اور یہاں کوئی عورت نہانے یا کپڑے دھونے کے لیے نہیں آئی تھی۔ یہ لڑکیاں دیہاتی بھی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ اُسے شک ہونے لگا کہ یہ وہی لڑکیاں ہیں جن کے متعلق مشہور ہے کہ چڑیلیں یا بدروحیں ہیں اور وہ کہیں کہیں، آبادیوں سے دُور نظر آتی ہیں۔

وہ انہیں مبہوت ہو کر دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک لڑکی نے ایک طرف دیکھتے ہوئے بڑی زور سے چیخ ماری اور دوڑ پڑی۔ ایک اور لڑکی اُس کے پیچھے دوڑی۔ تیسری جو ندی کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی، اُٹھی اور جب دوڑنے لگی تو پانی میں گر پڑی۔ پانی گہرا نہیں تھا۔ گھٹنوں سے بھی نیچے تھا۔ ازمیر درختوں سے آگے ہو گیا۔ تب اُس نے ایک بہت بڑا ریچھ دیکھا جو ندی میں اُتر رہا تھا اور بڑے غصے سے غرّا رہا تھا۔ لڑکی اُٹھی لیکن ریچھ کو اتنی قریب دیکھ کر اُس پر اتنی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ وہ پھر گر پڑی۔ ریچھ اُسے پکڑنے کے لیے ندی میں اُتر گیا۔

ازمیر فوراً سمجھ گیا کہ یہ لڑکیاں انسان ہیں، چڑیلیں، یا بدروحیں نہیں۔ اُس نے لگام کو جھٹکا دے کر ایڑ لگائی۔ گھوڑا تیزی سے آگے بڑھا۔ ازمیر نے برچھی کو دائیں ہاتھ میں تول کر پوری طاقت سے برچھی پھینکی۔ برچھی تیر کی طرح گئی۔ ریچھ پانی میں اچھلتا کودتا لڑکی تک پہنچ گیا لیکن اڑتی ہوئی برچھی اُس کے پہلو میں اُتر گئی۔ ریچھ بڑی زور سے غرّایا اور پانی میں گرا۔ وہ پھر اُٹھا اور ایک جگہ گھومنے لگا۔ آخر گر پڑا۔

ازمیر گھوڑے سے اُترا اور دوڑ کر ندی سے لڑکی کو اُٹھا لیا۔ ریچھ پانی میں آہستہ آہستہ تڑپ رہا تھا۔ لڑکی بے ہوش ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ کی لڑکیاں جانے کہاں بھاگ گئی تھیں۔ ازمیر نے لڑکی کو گھوڑے کی پیٹھ پر ڈالا۔ کنارے پر پڑے ہوئے لڑکی کے کپڑے اُٹھائے اور اُس پر ڈال دیئے اور واپس چوکی کی طرف چل پڑا۔ وہ لڑکی کو بچانے کی کوشش کر رہا

تھا اور وہ لڑکی سے یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور دوسری لڑکیاں کون ہیں اور کہاں رہتی ہیں۔

وہ چوکی میں پہنچا تو اُسے لڑکی کی آواز سنائی دی۔ وہ اُٹھنے کی کوشش کر رہی تھی ازمیر نے اُسے گھوڑے سے اُتار لیا۔ وہ ہوش میں آگئی تھی۔ اُس کے چہرے پر خوف اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ پہلے وہ ریچھ سے ڈر کر بے ہوش ہوئی تھی، اب ازمیر کو اور اجنبی جگہ کو دیکھ کر اتنی ڈری کہ اُس کا سر ڈھلنے لگا۔ ازمیر نے ہندوستانی زبان میں بات کی جو لڑکی نے سمجھ لی۔ ازمیر نے اُسے کپڑے پہننے اور چلنے کو کہا۔

"تم نے مجھے ریچھ سے بچایا ہے؟" — لڑکی نے پوچھا۔

"اگر میں نہ ہوتا یا میرے پاس برچھی نہ ہوتی تو تم زندہ نہ ہوتیں" — ازمیر نے کہا — "تمہارا جسم چیرا پھاڑا ہوا ندی میں بہہ رہا ہوتا۔ میں نے ریچھ کو مار ڈالا ہے۔ ڈرو مت۔ جہاں کہو گی وہاں پہنچا دوں گا۔"

لڑکی کپڑے پہن کر اندر چلی گئی۔ ازمیر اُسے الگ کمرے میں لے گیا اور اُسے غور سے دیکھا۔ لڑکی اُس کے تصوروں سے زیادہ خوبصورت تھی۔

"میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟" — لڑکی نے پوچھا۔

"جس سلوک کا تمہیں ڈر ہے، وہ میں جنگل ہی میں کر سکتا تھا" — ازمیر نے کہا — "میں نے تمہارے ننگے جسم پر کپڑے ڈالے تھے۔ میں تمہیں بُری نیت سے یہاں نہیں لایا۔ اب بتاؤ کہاں جاؤ گی۔ میں تمہیں وہاں چھوڑ آؤں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم یہاں کی رہنے والی نہیں۔ تمہاری زبان اس خطے کی نہیں۔ تمہاری ڈیل ڈول اور تمہارا چہرہ اس خطے کا نہیں۔ تم کسی غریب کسان یا گڈریئے کی بھی بیٹی نہیں۔"

"اگر میں تمہارے کسی بھی سوال کا جواب نہ دوں تو میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟"

"پوچھے بغیر چھوڑوں گا نہیں" — ازمیر نے کہا — "ایک پاک امانت کی طرح تمہیں رکھوں گا۔"

لڑکی ہنس پڑی اور اُس نے ایسی حرکتیں اور ایسی باتیں شروع کر دیں جیسے ازمیر

کو بچپن سے جانتی ہو۔ وہ ازمیر کو اپنا آپ پیش کر رہی تھی۔

"میں مسلمان ہوں لڑکی!" — ازمیر نے کہا — "میں اپنے مذہب اور اپنے سلطان سے غداری نہیں کروں گا۔ مجھے پتھر سمجھو۔"

لڑکی نے کچھ اور داؤ آزمائے۔ آخر اُسے یقین ہو گیا کہ یہ شخص واقعی پتھر ہے۔

"تم نے میری جان بچائی ہے" — لڑکی نے کہا — "اور تم ویسے نہیں جیسا میں سمجھتی تھی۔ تمہارا حق ہے کہ میں تمہیں اپنے راز سے آگاہ کر دوں، پھر میرے ساتھ جو بھی سلوک کرنا چاہو کرنا... میں اُن چڑیلوں میں سے ایک ہوں جو لوگوں کو جوان اور خوبصورت لڑکیوں کے روپ میں نظر آتی ہیں، لیکن میں انسان ہوں۔ سب لڑکیاں انسان ہیں۔ ہمارا مستقل ٹھکانہ قلعہ کالنجر میں ہے۔ عارضی ٹھکانہ وہاں سے تھوڑی ہی دور پہاڑ پر ہے جہاں سے تم مجھے اٹھا لائے ہو۔ آج رات ہمیں وہاں سے اُس گاؤں پر بجلی چمکانی تھی جو اُس پہاڑی کی دوسری طرف ہے۔"

"بجلی چمکانے کا راز کیا ہے؟"

"تم اُن لوگوں کو پکڑ سکتے ہو" — لڑکی نے کہا — "مگر اب مشکل ہو گیا ہے۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ میں انہیں زندہ یا مردہ نہیں ملوں گی تو وہ اپنا راز فاش ہونے کے خوف سے یہاں سے چلے جائیں گے۔ کیا تم کوئی طریقہ سوچ سکتے ہو؟"

"میں تمہیں وہیں لے جا کر چھوڑ دوں گا جہاں سے لایا ہوں" — ازمیر نے کہا — "اور خود چھپ جاؤں گا۔ ہو سکتا ہے وہ تمہیں ڈھونڈ رہے ہوں۔ میں انہیں پکڑ لوں گا... اگر تم نے دھوکہ دیا تو یاد رکھو کہ میں جہاں بھی چھپوں گا، تم میرے تیر کی زد میں ہو گی۔"

"میں دھوکہ نہیں دوں گی" — لڑکی نے کہا — "تم نے میری جان بچائی ہے۔ میں تمہیں اس کا انعام دوں گی۔"

لڑکی اُسی جگہ پہنچ گئی جہاں ریچھ نے اُس پر حملہ کیا تھا۔ ریچھ ندی میں پڑا تھا، پانی اتنا زیادہ نہیں تھا کہ اُسے بہا لے جاتا۔ لڑکی کنارے کنارے آگے چلی گئی اور ادھر اُدھر دیکھتی رہی۔ خاصی دیر بعد ندی کے دوسرے کنارے پر دو آدمی نمودار ہوئے۔ انہوں

نے لڑکی کو بلایا۔ لڑکی نے انہیں اشارہ کیا کہ اِدھر آ جاؤ۔ وہ دونوں ندی سے گزر کر لڑکی کے پاس آ گئے اور اس سے پوچھنے لگے کہ وہ کہاں رہی ہے۔

اونچی گھاس میں سے ازمیر اور چار سپاہی اُٹھے۔ ازمیر کے ہاتھ میں کمان تھی جونہی دونوں آدمیوں نے انہیں دیکھا تو وہ گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے مگر ازمیر کی للکار نے انہیں بھاگنے نہ دیا۔ قریب جا کر انہیں گھیر لیا۔

"ہمیں اپنے ٹھکانے پر لے چلو" — ازمیر نے انہیں کہا۔

دونوں نے ٹالنے کی اور کچھ نہ سمجھنے کی اداکاری کی لیکن ازمیر نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے چلیں۔ دونوں نے لڑکی کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ اُن کا راز اسی نے فاش کیا ہے۔ ازمیر نے تلوار نکال لی اور انہیں آگے آگے چلنے کو کہا۔ وہ چل پڑے اور گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔ ذرا آگے جا کر وہ پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ درخت بہت زیادہ تھے بیلیں زمین پر بھی پھیلی ہوئی اور درختوں پر بھی چڑھی ہوئی تھیں۔ یہ جگہ ایسی تھی کہ اُدھر سے کبھی کسی کا گزر نہیں ہوا تھا۔

خاصا اوپر گئے تو پہاڑی کی ابھی چوٹی نہیں آئی تھی۔ وہاں پہاڑی دیوار کی طرح سیدھی ہو گئی تھی۔ وہاں خشک لکڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس سے ذرا پرے ایک گُف سی بنی ہوئی تھی۔ باہر کی آوازیں سن کر گُف میں سے دو لڑکیاں نکلیں۔ ازمیر نے انہیں ندی میں نہاتے دیکھا تھا۔ وہ فوجیوں کو اپنے آدمیوں کے ساتھ دیکھ کر گھبرا گئیں۔ ازمیر نے گُف میں جا کر دیکھا۔ وہاں پانچ چھ فٹ اونچا لکڑی کا ایک تختہ رکھا تھا جو قد آدم آئینہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ آئینے کی طرح شفاف اور چمکدار تھا۔

"یہ سب کیا ہے؟" — ازمیر نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں" — ایک آدمی نے کہا — "ہم تو ایسے ہی یہاں آ گئے ہیں۔"

ازمیر نے اُس لڑکی کی طرف دیکھا جسے اُس نے ریچھ سے بچایا تھا۔ یہ لڑکی ازمیر کی احسان مند تھی۔ اس کے عوض اُس نے ازمیر کو یہ راز بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اب پردہ ڈالنا بیکار ہے کیونکہ وہ پردہ اُٹھا چکی ہے۔

ازمیر کو وہ اوپر لے گئے۔ وہاں سے اُس نے دیکھا۔ دور نیچے درختوں اور سبزہ زار

میں اپنی چوکی نظر آ رہی تھی اور اس سے ذرا دور وہ گاؤں درختوں میں سے ذرا ذرا دکھائی دے رہا تھا جہاں ازمیر گیا تھا۔ اُسے بتایا گیا کہ پہاڑی جہاں سے عمودی ہو جاتی ہے، وہاں لکڑیوں کے ڈھیر کو آگ لگائی جائے گی۔ یہ آگ نیچے کے گاؤں والوں کو نظر نہیں آ سکتی۔ اس کے سامنے اور اوپر جہاں وہ کھڑے تھے، یہ آئینہ رکھا جائے گا۔ آگ پر تیل پھینکتے رہیں گے جس سے شعلہ اور زیادہ بھڑکے گا اور اوپر کو لپکے گا۔ اس کی چمک آئینے پر پڑے گی۔ آئینے کو چوکی اور پھر گاؤں کی سمت کر کے آہستہ آہستہ ایک دو بار ہلایا جائے گا۔ اس کی چمک دور نیچے اس طرح پڑے گی جس طرح بجلی چمکتی ہے۔

ازمیر کے لیے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہ تھا۔ اسے یہ بتایا گیا کہ اس رات اس کی چوکی اور گاؤں پر چمک ماری تھی۔ اس سے پہلے کسی اور جگہ سے گاؤں پر چمک ماری جا چکی تھی۔

"یہ عقل کا کھیل ہے" — ایک آدمی نے کہا۔ "رات کو پہاڑی سے آگ کا عکس اس چمکدار تختے پر لیا جاتا ہے تو دور نیچے سے دیکھنے والوں کو یوں نظر آتا ہے جیسے یہ چمک آسمان کی ہو۔ ان پہاڑیوں کی بلندیوں سے جو لوگ واقف ہیں، رات کو بھی شک نہیں کر سکتے کہ یہ چمک پہاڑ سے آئی ہے۔ اگلے روز ہمارے آدمی گاؤں میں جا کر افواہیں پھیلاتے ہیں، اور لوگوں کے ذہنوں پر یہ غلط بات مسلط کر دیتے ہیں کہ انہوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے اس لیے انہیں دیوتاؤں کے اشارے مل رہے ہیں کہ وہ اپنے مذہب میں واپس آ جائیں ورنہ اُن پر قہر نازل ہو گا ... خوبصورت برہنہ لڑکیوں کے روپ میں نظر آنے والی چڑیلیں سی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ یہ اس خطے کی رہنے والی نہیں۔ یہ لاہور اور بھٹنڈہ کے راج محل کی خاص لڑکیاں ہیں۔"

خُدا نے ازمیر کی دُعا قبول کر لی اور اپنے نور کی چمک دکھا دی تھی۔ یہ اسے اب لوگوں کو دکھانی تھی۔ اُس نے ان آدمیوں اور لڑکیوں کو اپنی چوکی میں لے جا کر پہرے میں بٹھا دیا اور اُن سے پوچھنے لگا کہ ان کے اور ساتھی کہاں کہاں ہیں۔

سارگ کا قافلہ ابھی تک دو گائیڈوں کی راہنمائی میں چلا جا رہا تھا۔ امام نے کئی بار گائیڈوں سے کہا کہ اب تک انہیں اپنی منزل پر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ گائیڈوں نے

انہیں بتایا کہ انہوں نے راستہ اختیار کیا ہے لیکن یہ محفوظ اور آسان راستہ ہے۔

یہ راستہ آسان نہیں تھا۔ اُن کے گائیڈ انہیں منزل سے بہت دُور ویرانے میں لے گئے تھے۔ ایک شام قافلے نے ایک جگہ قیام کیا اور گائیڈوں نے انہیں بتایا کہ کل دن کے پہلے پہر وہ منزل پر پہنچ جائیں گے۔ سب تھکے ہوئے تھے کھانا کھا کر فوراً سو گئے۔

صبح ان کی آنکھ کھلی تو دونوں گائیڈ غائب تھے۔ وہ اپنے گھوڑوں پر چلے گئے تھے۔ انہیں اِدھر اُدھر دیکھا لیکن بیکار تھا۔ وہ کہاں نظر آ سکتے تھے۔ ان کے اردگرد اونچے پہاڑ کھڑے تھے نیچے سے اوپر تک چیل کے درختوں نے پہاڑوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ انہیں وہی راستہ معلوم تھا جس راستے سے وہ آئے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں اور منزل کتنی دُور ہے۔

"ہندو ڈنک مار گیا ہے"۔ ساروگ نے امام سے کہا۔ "ان دونوں آدمیوں کو معلوم تھا کہ آپ مجھے یہاں کے پُراسرار واقعات بتاتے جا رہے ہیں"۔

"ہم جب بالناتھ سے آ رہے تھے تو میں نے تین چار بار کچھ دور دو آدمی جاتے دیکھے تھے"۔ ایک محافظ نے کہا۔ "میں انہیں مسافر سمجھتا رہا۔ یہ وہی نہ ہوں"۔

"میں نے انہیں اس سے پہلے بھی دیکھا تھا جب ہم نے پہلا سانپ دیکھا تھا"۔ ایک اور محافظ نے کہا۔ "ان کے چہرے نظر نہیں آتے تھے"۔

"وہی تھے یا کوئی اور تھے، اب کیا فرق پڑتا ہے"۔ ساروگ نے کہا۔ "ہم بہت بڑے دھوکے کا شکار ہو چکے ہیں۔ اب یہاں سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈو.... اور دیکھو۔ تھیلوں میں کھانے کی جو بھی چیز باقی ہے وہ پھینک دو۔ ہو سکتا ہے وہ ان میں زہر ملا گئے ہوں"۔

ان کی بڑی کٹھن اور خطرناک مسافت شروع ہو گئی۔ دن بھٹکتے گذر گیا۔ رات آ گئی جو انہوں نے سو کر گذاری لیکن یہاں سردی زیادہ تھی۔ اگلا دن بھی سبز پوش وادیوں میں بھٹکتے گذر گیا۔

اگلی رات جب وہ سردی سے بچنے کے لیے کوئی جگہ دیکھ رہے تھے، اُن کے

گائیڈ جو انہیں اتنے حسین ویرانے اور اتنی پُر پیچ بھول بھلیوں میں چھوڑ گئے تھے، قلعہ لوہ کوٹ میں ہندو قلعہ دار کے پاس بیٹھے اپنی کارگذاری سنا رہے تھے۔

"تم نے انہیں ہلاک کیوں نہ کر دیا؟" قلعہ دار نے کہا۔ "سلطان محمود کا قلعہ دار معمولی آدمی نہیں ہوتا۔ میں خوش ہوں کہ تم نے بہت موٹا شکار پکڑا ہے لیکن اُسے زندہ نہیں رہنا چاہیئے"۔

"کالنجر سے ہمیں حکم ملا تھا کہ کسی مسلمان فوجی کو قتل نہ کیا جائے"۔ ایک گائیڈ نے کہا۔ "ہم خود نہیں سمجھ سکے کہ ایسا حکم کیوں ملا تھا۔ ہم ان کے کھانے میں بڑی آسانی سے زہر ملا سکتے تھے"۔

"مہاراجہ کالنجر نے کچھ سوچ کر ہی کہا ہو گا کہ انہیں قتل نہ کیا جائے"۔ قلعہ دار نے کہا۔ "وہ شاید محمود پر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ معاہدے کے مطابق اُن کے فوجیوں کی جانیں یہاں محفوظ ہیں۔ اگر وہ خود ہی کہیں بھٹک بھٹک کر مر جاتے ہیں تو ہم انہیں روک نہیں سکتے"۔

اور سارو گ کو اپنے قافلے کے ساتھ بھٹکنے سے کوئی بھی نہ روک سکا۔ انہیں کہیں کوئی آبادی نظر نہیں آتی تھی نہ کوئی اکیلا دکیلا جھونپڑا یا کوئی انسان نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی انہیں ببر شیروں کا جوڑا نظر آ جاتا تھا یا بھیڑیوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ دنیا کا اتنا حسین اور جانفزا خطہ انہیں بڑا ہی ہولناک اور پُراسرار دکھائی دیتا تھا۔

ہندوؤں نے بڑی کامیاب چال چلی تھی۔ سلطان محمود کی فوج کی جو نفری یہاں چھوڑ گیا تھا، اس کا سب سے بڑا افسر سارو گ تھا۔ سارو گ کو غائب کر دینے سے ہندو یہ فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے کہ انہوں نے اسلام کے خلاف جو شعبدہ بازی کی طرح کی مہم چلا رکھی تھی اسے بے خوف و خطر اور تیز کر دیں۔ ہندو عیارانہ چالوں میں ہمیشہ تیز اور دانشمند رہا ہے۔ مندروں میں پنڈت بھجنوں کے ساتھ ہندوؤں کو بتاتے تھے کہ گئو ماتا جتنی مقدس ہے، مسلمان اتنی ہی ناپاک ہے اور اسلام کا خاتمہ دھرم کا فرض ہے۔ پنڈتوں نے مسلمان کے قتل کو ایک نیکی اور مذہبی فریضہ قرار دے رکھا تھا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے ہندوستان

سے اسلام کے خاتمے کو آج بھی مذہبی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ آج بھی ہندو اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے اپنی بیٹی کی عصمت قربان کر دیا کرتا ہے۔

۱۰۲۴ میں راجہ نندہ رائے کالنجر کے قلعے میں اپنے تخریب کاروں کے استاد ہدایت کار سے یہ رپورٹ سن رہا تھا کہ اُس نے لوگوں کو بجلی کی چمک اور حسین لڑکیوں کو چڑیلیں اور بدروحیں بنا کر دکھانے اور افواہ بازی کی جو مہم شروع کی تھی وہ بے نقاب ہو گئی ہے اور غزنی کے فوجیوں نے ہمارے دو آدمیوں اور تین لڑکیوں کو سامان سمیت پکڑ لیا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ مسلمان فوجی ان آدمیوں اور لڑکیوں کو ہر گاؤں میں لے جاتے اور لوگوں کو دکھاتے ہیں کہ یہ ہے بجلی کی چمک اور چڑیلوں کی حقیقت۔

ازمیر نے جن آدمیوں اور لڑکیوں کو گرفتار کیا تھا، اُن سے اس وعدے پر اُن کے ساتھیوں کے متعلق پوچھ لیا تھا کہ وہ اُن کی جان بخشی کر کے انہیں رہا بھی کر دے گا۔ اُس نے جس طرح انہیں پکڑا تھا، اسی طرح اُس نے اُن کی نشاندہی پر اُن کے ساتھیوں کو پکڑ لیا۔ اُن کے پاس بھی یہی سامان تھا لیکن اُن کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں تھی۔ وہ زیادہ آدمی تھے۔ وہ گاؤں گاؤں جا کر افواہیں پھیلاتے اور لوگوں کو ڈراتے تھے۔

ایک روز ازمیر نے یہ انتظام کیا کہ دو تین گاؤں کے لوگوں کو ایک جگہ جمع کر لیا اور اُن کے سامنے ان افواہ بازوں کو کھڑا کر کے انہیں کہا کہ وہ لوگوں کو بتائیں کہ وہ جو کچھ کہتے رہے ہیں وہ سب جھوٹ اور دھوکہ تھا۔ بہت سے لوگوں نے ان آدمیوں کو پہچان لیا۔ ان آدمیوں نے لوگوں کو اپنی اصلیت بتا دی۔ پھر شام کے بعد ازمیر نے لوگوں کو بجلی کی چمک بھی دکھائی اور تینوں لڑکیوں کو نیم برہنہ کر کے ایک پہاڑی کی ڈھلان پر کھڑا کر کے دُور اوپر سے اُن پر آئینہ نما تختے سے روشنی ڈلوائی، پھر لڑکیوں کو اسی نیم برہنہ حالت میں نیچے بلا کر لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔

مہاراجہ نندہ کو جب پتہ چلا کہ اُن کی مہم ناکام اور بے نقاب ہو گئی ہے تو اُس نے یہ حکم دے دیا کہ اس علاقے میں جو مسلمان امام اور استاد لوگوں کو اسلامی طریقے اور عبادت سکھا رہے ہیں، انہیں اس طرح غائب کر کے قتل کر دیا جائے کہ کسی کو ان کا سراغ نہ ملے۔ غزنی کی فوجی چوکیوں میں جو فوجی ہیں، انہیں بھی اکیلے دکیلے غائب کرنا شروع کر دیا جائے۔

ازمیر ایک رات اپنی چوکی میں اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ ایک کمرے میں اُس نے ان ہندو مردوں اور لڑکیوں کو قید کر رکھا تھا جو لوگوں کو فریب دیتے اور نظریاتی تخریب کاری کرتے پھر رہے تھے۔ ان پر اُس نے پہرہ کھڑا کر رکھا تھا۔ اُس نے انہیں کہہ دیا تھا کہ کل وہ مردوں کو بالناتھ بھیج دے گا جہاں اُن کی قسمت کا فیصلہ سالار گ کرے گا اور لڑکیوں کو سپاہیوں کی حفاظت میں کالنجر بھیج دیا جائے گا۔

ایک سپاہی نے اُسے آ کر بتایا کہ ایک لڑکی اُس سے ملنا چاہتی ہے۔ اُس نے لڑکی کو بلایا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے اُس نے ریچھ سے بچایا تھا۔

"کیا تم آج رات بھی مجھے اپنے پاس نہیں بلاؤ گے؟" لڑکی نے اُس سے پوچھا۔ "یہ میری خواہش ہے۔"

ازمیر کی ہنسی نکل گئی۔ اُس نے کہا۔ "مجھے احساس ہے کہ تم غیر معمولی طور پر خوبصورت لڑکی ہو۔ میں نے اتنی خوبصورت لڑکی کبھی نہیں دیکھی۔ میں تمہاری حیرت کو بھی سمجھتا ہوں کہ مجھ جیسا جوان فوجی جو اتنی مدت سے گھر سے دُور جنگلوں میں موت کے سائے میں پڑا ہے، تم جیسی حسین لڑکی کی طرف وہ توجہ کیوں نہیں دیتا جس کی تمہیں توقع ہے۔ اگر تم مسلمان ہوتیں، اگر تم پر یہ فرض عائد ہوتا جو مجھے سونپا گیا ہے اور اگر تم ایمان کا مطلب سمجھ سکتیں تو تمہیں حیرت نہ ہوتی۔ تمہاری نظر جسم پر ہے۔ یہ تمہارا مذہب ہے۔ میری نظر رُوح پر ہے۔ یہ میرا مذہب ہے۔"

"اگر میں تمہاری خاطر تمہارا مذہب قبول کر لوں تو؟"

"ناگن کا زہر نکال دو تو بھی وہ ناگن ہی رہے گی۔" ازمیر نے کہا۔ "اُسے شہد کھلاتی رہو تو بھی اُس میں زہر بنے گا اور ناگن ڈس لے گی۔ یہ اس کی فطرت ہے..... میں یہاں عشق بازی اور شادی کرنے نہیں آیا۔ مجھے تمہارے جسم کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ میری طاقت ہے کہ میری نگاہ نہ اپنے جسم پر پڑتی ہے نہ تم جیسی کسی حسینہ کے جسم پر..... اور لڑکی! میرے مذہب کا حکم ہے کہ دشمن کی عورت تمہاری قید میں ہو تو اُس کی مجبوری سے فائدہ اُٹھانا گناہ ہے۔ اُسے الگ رکھو۔"

لڑکی کے آنسو نکل آئے اور وہ ازمیر کی چارپائی پر اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اُس نے ایک بازو ازمیر کے گلے میں ڈال دیا اور اُس کے اتنی قریب ہو گئی کہ اُس کے بکھرے بکھرے ریشمی بال ازمیر کے گالوں سے مس کرنے لگے۔

"تم نے مجھے ریکھ سے بچایا ہے" لڑکی نے کہا۔ "اب تم مجھے رہا کر کے حفاظت سے واپس بھیج رہے ہو اور ہم تین لڑکیاں اتنے دنوں سے تمہارے پاس تمہارے رحم و کرم پر ہیں مگر تم ہمارے لیے پتھر بنے رہے ...."

لڑکی بولتے بولتے چپ ہو گئی۔ اُس نے ازمیر کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔ اُس کے چہرے پر درد کے آثار بڑے صاف تھے۔

"مجھے خون کی بُو آ رہی ہے" — لڑکی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم مجھے تکلیف میں معلوم ہوتے ہو۔ ازمیر! کیا تم زخمی ہو؟"

ازمیر نے بایاں ہاتھ اوپر کیا۔ اس ہاتھ میں خنجر تھا۔ خنجر کی نوک خون آلود تھی۔ لڑکی اُس کے دائیں طرف بیٹھی تھی۔ وہ دیکھ نہیں سکی تھی کہ جب وہ اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تھی تو ازمیر نے اپنے سرہانے کے نیچے سے خنجر نکال کر اس کی نوک اپنے ننگے پاؤں کے اوپر والے حصے میں اُتار دی تھی اور نوک کو دبا رہا تھا۔ لڑکی نے خون آلود خنجر دیکھا تو مُنہ کر ازمیر کے سامنے آ گئی۔ اُسے ازمیر کا زخمی پاؤں نظر آ گیا جس سے خون نکل رہا تھا۔ لڑکی نے اُسے حیران ہو کر دیکھا۔

"حیران نہ ہو لڑکی!" ازمیر نے کہا۔ "میں فرشتہ نہیں، انسان ہوں اور جوان آدمی ہوں۔ تمہارے جسم کے لمس نے میرے ذہن سے میرا فرض اُتارنا شروع کر دیا تھا۔ میں سلطان کے آگے جوابدہ نہیں بلکہ خدا کے آگے جوابدہ ہوں۔ یہاں مسئلہ مہاراجوں اور سلطانوں کی فتح و شکست کا نہیں، یہاں تمہارے اور میرے مذہب کی لڑائی ہے۔ میں اپنے مذہبی اصولوں کو تمہارے حُسن پر قربان نہیں کر سکتا اور میں اپنے اوپر جبر بھی نہیں کر سکتا۔ اپنی توجہ تم سے ہٹانے کے لیے خنجر کی نوک اپنے پاؤں میں اُتار لی تھی .... جاؤ، تم چلی جاؤ۔"

لڑکی نے اُس کا ایک ہاتھ تھاما اور اپنی آنکھوں سے لگایا، پھر اُس کا ہاتھ چوم لیا۔ وہ کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ لڑکی اچانک گھومی اور کمرے سے نکل گئی۔

اگلی صبح ازمیر نے تینوں لڑکیوں کو گھوڑوں پر بٹھایا۔ آٹھ دس سوار ساتھ لیے اور کالنجر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لڑکی اپنا گھوڑا بار بار ازمیر کے گھوڑے کے قریب لے آتی تھی مگر ازمیر سوائے مسکرانے کے اُس کے ساتھ کوئی بات نہیں کرتا تھا۔

آدھی رات کے قریب وہ کالنجر کے دروازے پر پہنچے۔ ازمیر نے لڑکیوں کو گھوڑوں سے اُتارا اور واپس ہونے لگا۔

"میں تمہارے احسان کا صلہ نہیں دے سکی" — لڑکی نے کہا۔ "مجھے ساری عمر افسوس رہے گا۔ اپنے آپ کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔"

"صلہ خدا دے گا" — ازمیر نے کہا۔ "اپنے راجہ سے کہنا کہ مردوں کی طرح میدان میں آئے۔ عورتیں جنگ نہیں جیت سکتیں۔"

وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ واپس آ رہا تھا تو اُس کی رُوح بھی مسرور تھی۔ خدا نے اُسے اپنا نور دکھایا تھا۔ وہ خدا کے سامنے سرخرو تھا۔ اُس نے اپنا فرض خوش اسلوبی سے اور جنگجوؤں کی طرح ادا کر دیا تھا۔

نائب سالار سارونگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ابھی تک وادیوں میں بھٹک رہا تھا۔ اگر وہاں پھلدار درخت اور پانی کی افراط نہ ہوتی تو وہ اب تک زندہ نہ رہتے۔

پہلے لوہ کوٹ کے قلعہ دار کو اطلاع دی گئی کہ بالناتھ کے قلعہ دار سارونگ کو اُس کے محافظوں اور ایک امام کے ساتھ فلاں علاقے میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ قلعہ دار نے یہ اطلاع کالنجر کے راجہ نندا رائے کو دی۔ نندا رائے نے حکم دیا کہ انہیں گرفتار کر کے قلعے میں لایا جائے۔ اس سے پہلے اُس کا یہ حکم تھا کہ کسی مسلمان فوجی کو قتل نہ کیا جائے۔ اس کی بجائے انہیں غائب کیا جائے۔ اب جب اُسے یہ پتہ چلا کہ اسلام کے خلاف اُس نے جو مہم شروع کرائی تھی، وہ ناکام ہو گئی ہے اور تینوں لڑکیاں واپس آ گئی ہیں اور تمام آدمی سلطان محمود کے فوجیوں کی قید میں ہیں تو اُس نے حکم دیا کہ سارونگ اور اس کے ساتھیوں کو ڈھونڈو۔ وہ زندہ مل جائیں تو انہیں یہاں لے آؤ۔

بہت دنوں بعد ایک ادرچوکی کا ایک سپاہی ازمیر کے پاس آیا اور اپنی چوکی کے

اور وہ دونوں گناہگار ہمیں لوٹ کر بھاگ گئے ہیں۔ ان کا انجام بھیانک ہو گا۔ ہمارے دلوں میں اللہ کی خوشنودی رہی تو یہ پتھر بھی ہمیں پانی دیں گے۔"

اور پتھروں نے انہیں پانی دیا۔ آدھی رات گزر گئی تھی۔ چاند اوپر آگیا تھا۔ گھوڑے اپنی چال چلے جا رہے تھے۔ دائیں طرف ایک وادی راستے سے آملتی تھی۔ وہاں جا کر دونوں گھوڑے رک گئے۔ لگامیں جھٹکنے پر بھی نہ چلے۔ عمران نے گھوڑوں کے منہ دیکھے۔ دونوں گھوڑے نتھنے پھلا رہے تھے اور دونوں وادی کی طرف دیکھتے تھے۔ دونوں آہستہ سے ہنہنائے اور وادی کی طرف چل پڑے۔

"اتر آؤ رشی!" — عمران نے گھوڑے کے پہلو میں جا کر رشی کو اپنی باہوں میں سے کر اتارا اور کہا — "انہوں نے پانی کی مُشک لے لی ہے۔ پانی قریب ہی ہو گا۔"

دوسرے گھوڑے پر زنام اوریزی سوار تھا۔ وہ بھی اُتر آیا۔ دونوں گھوڑے وادی کے اندر دوڑ پڑے۔ قدرت نے جانوروں کو یہ وصف عطا کر رکھا ہے کہ پانی کی بُو دور سے سونگھ لیتے ہیں۔ بعض چھوٹے جانور اور پرندے بارش سے بہت پہلے محسوس کر لیتے ہیں کہ بارش برسے گی۔ ان دونوں گھوڑوں نے پانی کی مُشک لے لی تھی۔ عمران نے پہلے ہی اپنے ساتھیوں کو بتا رکھا تھا کہ اس خشک پہاڑی خطے میں کہیں کہیں پانی مل جاتا ہے۔

گھوڑے دوڑتے گئے۔ عمران بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھوڑوں کے پیچھے گیا۔ کچھ دور جا کر گھوڑے رک گئے۔ وہاں پہاڑ کا دامن ایک وسیع اور بلند غار کی طرح کٹا ہوا تھا۔ چاندنی میں وہاں پانی صاف نظر آرہا تھا۔ وہاں شاید چشمہ تھا۔ گھوڑے پانی پی رہے تھے۔ پانی کی وجہ سے وہاں تھوڑی سی گھاس بھی تھی۔ گھوڑے پانی پی کر گھاس کھانے لگے۔ ان کے سوار بیٹھ گئے تاکہ گھوڑے سیر ہو جائیں۔

اُس وقت قاسم ملتی اور ناظر غزنی کی سمت جا رہے تھے مگر وہ جا کہیں بھی نہیں رہے تھے۔ وادیوں میں بھٹک رہے تھے۔ ملتی غزنی کے عام راستے پر جاتے ڈرتا تھا۔ اُسے توقع تھی کہ پہاڑیوں کے اندر اندر سے وہ لمغان میں نکل جائے گا مگر یہ وادیاں ایسی تھیں

راج محل کے ناچنے گانے والیاں اور دیگر عورتیں رہتی تھیں۔ جب یہ خبر اُس لڑکی کے کانوں میں پڑی جسے ازمیر نے ریتھ سے بچایا تھا تو وہ باہر نکل آئی۔ وہ بھی مسلمان فوجیوں کی قید میں رہ چکی تھی، اس لیے اُسے ان قیدیوں میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ تینوں قیدیوں کو ایک مذمت کیلئے بٹھا دیا گیا تھا۔ لڑکی نے قریب آکر دیکھا۔ ان میں ازمیر بھی تھا۔

لڑکی ہندو فوجیوں کے کمانڈر کو الگ لے گئی اور اُسے کہا کہ وہ ازمیر کو چھوڑ دے۔ اُس نے اپنے کمانڈر کو بتایا کہ اس آدمی نے اُس کی جان بچائی تھی اور اُس نے اس کا صلہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہندو کمانڈر ازمیر کو رہا کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ لڑکی نے اُسے کہا کہ وہ منہ مانگا انعام دے گی اور ازمیر کو اس طرح قلعے سے نکالے گی کہ کسی کو پتہ نہیں چل سکے گا۔

یہ لڑکی اپنا جادو چلانے کی ماہر تھی۔ ہندو کمانڈر کو اُس نے رام کر لیا۔ اس کے عوض لڑکی نے جو انعام پیش کیا، اُسے وہ تصور میں بھی نہیں لا سکتا تھا۔

قیدیوں کو ابھی کسی کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ قیدیوں کو اب قید خانے میں بند کرنا تھا۔ لڑکی ازمیر کو ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں پودوں اور جھاڑیوں کی اوٹ تھی۔ اندھیرا ابھی گہرا ہو رہا تھا۔ لڑکی دوڑی گئی اور کچھ کپڑے اُٹھا لائی۔

"آج مجھے سکون نصیب ہوا ہے" — لڑکی نے ازمیر سے کہا — "میں تمہارے احسان کا صلہ دے رہی ہوں۔ جاتے جاتے ایک اور خبر سن لو۔ یہاں دو اور مہاراجوں کی فوج آرہی ہے۔ ایک فوج لاہور کی ہے۔ راجہ بھیم پال خود ساتھ آرہا ہے۔ ان کے آتے ہی وہ راجہ نندہ رائے سلطان محمود کو پیغام بھیجے گا کہ وہ اس کا باجگزار نہیں۔ اگر اس میں ہمت ہے تو خود آکر باج وصول کرے۔ میں تمہیں یہ اطلاع اس لیے دے رہی ہوں کہ اس کے فوراً بعد تمہاری چوکیوں پر حملے ہوں گے۔ مجھے صرف تمہاری ذات کے ساتھ دلچسپی ہے۔ تمہاری تعداد بہت تھوڑی ہے۔ تم مارے جاؤ گے یا پکڑے جاؤ گے۔ پھر میں تمہیں چھڑا نہیں سکوں گی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم اپنی چوکی سے چلے جاؤ؟"

ازمیر ہنس پڑا۔ اُس نے لڑکی کا شکریہ ادا کیا۔ وہ اُس کے لائے ہوئے کپڑے

پہنچ چکا تھا۔

قلعے کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ اندر سے ایک گھوڑا دروازے پر آ رکا۔ گھوڑے پر بڑھے ہوئے پیٹ والا ایک پنڈت سوار تھا۔ اُس کے سر پر پھندنوں والی پگڑی تھی۔ اُس کے ساتھ لڑکی تھی۔ اُس نے قلعے کے دروازے کے انچارج سے کہا کہ پنڈت جی مہاراج ہمارے پاس آئے تھے۔ یہ اب ساتھ والے گاؤں میں جا رہے ہیں۔ وہاں کوئی آدمی مر گیا ہے۔ مجھے کہا گیا ہے کہ ان کے لیے دروازہ کھلوا دوں۔

وہ راج محل کی لڑکی تھی۔ سب جانتے تھے کہ اس لڑکی کی کیا اہمیت ہے۔ اُس کے کہنے پر دروازہ کھول دیا گیا اور پنڈت جی مہاراج نکل گئے۔ اُن کے پیچھے دروازہ بند ہو گیا۔ ازمیر نے گھوڑا دوڑایا نہیں۔ آہستہ آہستہ چلا گیا۔ قلعے سے دُور جا کر اُس نے کُرتے کے اندر ٹھونسے ہوئے وہ کپڑے نکال کر پھینک دیئے جو اُس کا پیٹ بڑھا ہوا دکھانے کے لیے ٹھونسے گئے تھے۔ اُس نے پگڑی بھی اُتار پھینکی اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

اگلے دن کے پچھلے پہر وہ اپنی چوکی میں پہنچ گیا۔ نائب سالار سارنگ، امام اور دیگر تمام افراد جو ٹولہ جوگیاں بالناتھ سے چلے اور تخریب کاروں نے انہیں ویرانے میں گمراہ کر دیا تھا اب ازمیر کی چوکی میں پہنچ چکے تھے کیونکہ یہ چوکی اُس جگہ کے زیادہ نزدیک تھی جہاں معرکہ لڑ کر انہیں چھڑایا گیا تھا۔

"تم کہاں تھے اور کس طرح آ گئے ہو؟" — سارنگ نے ازمیر سے پوچھا۔

"جو بات سب سے زیادہ ضروری ہے پہلے وہ سُن لیں" — ازمیر نے کہا۔ "یہاں کے حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ میں کالنجر قلعے سے کسی کی مدد سے فرار ہو کر آ رہا ہوں۔ کالنجر کے مہاراجہ نے اس علاقے میں اسلام کے خلاف جو تخریب کاری کرائی ہے، وہ آپ نے دیکھ لی ہے۔ یہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ کفار کا وار خالی گیا ہے۔ آپ کو گرفتار کر کے کالنجر لے جانا اس امر کی دلیل ہے کہ مہاراجہ کالنجر اور یہاں کے چھوٹے چھوٹے راجے اور رائے ہمارے باجگزار نہیں رہنا چاہتے اور وہ ہمارے خلاف جنگی تیاریاں کر رہے ہیں۔ مجھے قلعے میں پتہ چلا ہے کہ کالنجر میں ان لوگوں کی فوجیں اکٹھی ہو رہی ہیں اور لاہور کا

مہاراجہ بھیم پال بھی آ رہا ہے۔ غالباً متحدہ افواج کی کمان وہ اپنے ہاتھ میں رکھے گا۔ یہ مہاراجے سب سے پہلے سلطان کو پیغام بھیجیں گے کہ وہ اُس کے باجگزار نہیں۔ اگر سلطان میں اتنی ہمت ہے تو خود آ کر باج وصول کرے۔ اس کے بعد ہماری چوکیوں کو صاف کیا جائے گا۔"

"ایسا ہونا ہی تھا" — سارنگ نے کہا۔ "دشمن کو اپنی شکست کا انتقام لینا ہی چاہیے اور پھر ہندو ایسا دشمن ہے جو شکست کو اپنے سامنے دیکھتا ہے تو تلوار تمہارے قدموں میں رکھ کر بیٹھ جاتا ہے، مظلوم اور بھکاری بن جاتا ہے۔ اگر اسے کہو کہ اپنی تمام بیٹیاں اور بہنیں ہمارے حوالے کر دو تو فوراً حوالے کر دے گا مگر تمہاری تلوار کے نیچے سے نکلتے ہی سانپ بن جائے گا اور اُس کی ساری سوچیں اور ساری کوششیں اس پر مرکوز رہیں گی کہ وہ کس طرح اور کتنی جلدی تمہیں ڈنک مارے۔ ہندو کے ساتھ ہماری جنگ زمین کے لیے نہیں، یہ مذہبی جنگ ہے جو اُس وقت تک لڑی جاتی رہے گی جب تک ہندوستان میں ایک بھی مسلمان یا ایک بھی ہندو زندہ رہے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندو ہم پر کب حملہ کرتا ہے۔"

"میں عرض کر رہا ہوں کہ ہمیں دیکھتے نہیں رہنا" — ازمیر نے کہا۔ "ہمیں آج ہی ایک قاصد غزنی کو روانہ کرنا ہے۔ دشمن کے ارادوں اور اُس کی طاقت کے متعلق کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ آپ کے پاس تو اتنی نفری نہیں کہ آپ حملہ روک سکیں۔"

اُسی وقت دو قاصد تیار کر کے انہیں پیغام دیا گیا اور انہیں کہا گیا کہ وہ کم سے کم رکیں اور راستے کی چوکیوں سے گھوڑے بدلتے جائیں۔

قاصد توقع سے زیادہ تیز گئے۔ سلطان محمود نے اپنی فوج کو تیز رفتاری کی بڑی سخت ٹریننگ دے رکھی تھی اور اپنے سپاہیوں کے ذہن میں یہ ڈال رکھا تھا کہ چند لمحوں کی تاخیر شکست کا باعث بن سکتی ہے۔ اس ٹریننگ کا نتیجہ تھا کہ قاصد متوقع وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ وہ جب سلطان محمود کو کشمیر کے حالات اور دشمن کے ارادے سنا رہے تھے، اُن کے سر ڈول رہے تھے اور آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

ایک انگریز تاریخ دان سر ہنری ہوورتھ نے اپنے ایک مقالے میں (۱۸۹۸ء میں)

سلطان محمود کے دور کے ایک وقائع نگار ابن اسفندیار کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ سلطان نے اپنے سالاروں اور دیگر کمانڈروں کو مقصد اور پروگرام بتائے بغیر نہایت عجلت میں کوچ کا حکم دے دیا۔ اُس کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اسلام کے معاملے میں جذباتی تھا۔ اُس نے جب سنا کہ وہ جنوبی کشمیر میں جو اسلام رائج کر آیا تھا، اُس کے خلاف پُراسرار اور زمین دوز تخریبی کارروائیاں کیں اور نائب سالار سارو گ اور اُس کے ہمسفروں کو گرفتار کیا تو سلطان ایسے غصے میں آگیا جس پر وہ قابو نہ پا سکا۔

سر سری ہوورتھ نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ سلطان نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ کشمیر جا رہا ہے اور اُس کے وہاں پہنچنے تک برفباری شروع ہو چکی ہو گی جو شکست کا باعث بھی بن سکتی ہے۔

ایک اور وقائع نگار محمد حیدر گرگانی بن محمد حسین نے اپنی تصنیف "تاریخ راشدی" (انگریزی ترجمہ سر ای ڈینی سن راس) میں بھی ایسی ہی رائے کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ سلطان نے غالباً پہلی فتوحات کے زعم میں پلاننگ کے بغیر ایسے میدانِ جنگ کی طرف کوچ کا حکم دے دیا جس کی دشواریوں، دستوں، خطروں اور موسمی حالات سے وہ پوری طرح واقف نہیں تھا۔

اُس نے کچھ فوج پشاور سے اپنے ساتھ لی اور حسبِ معمول اتنی تیزی سے کشمیر پہنچ گیا جس پر تاریخ دان بھی حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ جنوری ۱۰۱۵ (۴۰۶ ہجری) کے پہلے ہفتے میں کشمیر پہنچ گیا تھا۔ پہاڑوں پر اور وادیوں میں برف کی چادر بچھ چکی تھی۔ چیل کے پیڑ بھی برف سے لد گئے تھے۔ سلطان کو یہ انٹیلی جنس رپورٹ ملی کہ مہاراجہ نندہ رائے اور بھیم پال نڈر کالنجر کی بجائے قلعہ لوہ کوٹ میں ہیں۔ لہٰذا کالنجر پر وقت ضائع کرنے کی بجائے لوہ کوٹ کو محاصرے میں لیا جائے۔ یہ قلعہ سر ہو گیا تو کالنجر بغیر محاصرے کے مل جائے گا۔

اُدھر لوہ کوٹ میں مہاراجوں کو اطلاع مل گئی کہ سلطان محمود آ گیا ہے۔ مہاراجہ نندہ رائے نے اپنے جاسوسی اور تخریب کاری کے نظام کے سربراہ کو بلا کر کہا کہ اُن آدمیوں کو لے آؤ۔ تھوڑی دیر میں اُس کے سامنے دس بارہ آدمی کھڑے کر دیئے گئے۔

"کیا انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کرنا کیا ہے؟" نندہ رائے نے ان سے پوچھا۔

سب نے بلند آواز سے کہا "معلوم ہے مہاراج!" — اور ان میں سے ایک نے کہا "ہم اس علاقے کے رہنے والے مسلمان ہیں۔ ہم اس علاقے کے لباس میں سلطان محمود کے پاس جائیں گے۔ اُسے بتائیں گے کہ ہم مسلمان ہیں اور اُس کی رہنمائی کے لیے آئے ہیں کیونکہ برف نے راستے بند کر دیئے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ لوہ کوٹ تک کس راستے سے پہنچا جا سکتا ہے۔ ہم اسلام کے شیدائیوں کی طرح باتیں کریں گے۔ ہم نے نماز اور کلمے زبانی یاد کر لیے ہیں۔"

"شاباش!" — نندہ رائے نے کہا — "اُسے لوہ کوٹ تک لے آنا۔ ہمیں پوری اُمید ہے کہ اُسے یہاں سے پسپا ہونا پڑے گا۔ اُسے تم ہی واپس لے جاؤ گے۔ واپسی کے سفر میں تم اپنی اسواری رکھنا۔"

یہ دس بارہ آدمی ہندو تھے اور تربیت یافتہ تخریب کار۔ اُنہوں نے مسلمانوں کی طرح چھوٹی چھوٹی داڑھیاں رکھی تھیں اور لباس بھی بدل لیے تھے۔

سلطان محمود نے لوہ کوٹ کی طرف پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ اُس دور میں یہ رواج تھا کہ حملہ آور کسی اجنبی علاقے میں جاتے تو وہاں کے گائیڈ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ پہاڑی علاقوں میں گائیڈوں کی ضرورت زیادہ شدید ہوتی تھی۔ سلطان محمود کی فوج کی جو چوکیاں پہلے سے موجود تھیں، انہوں نے مخبروں اور گائیڈوں کا انتظام کر رکھا تھا۔ سلطان نے پیش قدمی کی تو راستے میں اُسے دس بارہ آدمی ملے جنہوں نے جوشیلے اور جذباتی انداز سے راہنمائی کی پیشکش کی۔ انہوں نے چونکہ کہا تھا کہ وہ اس علاقے کے مسلمان ہیں اور وہ یہاں کے مہاراجوں سے اُس سلوک کا انتقام لینا چاہتے ہیں جو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھا تھا، اس لیے سلطان نے انہیں اپنی فوج کے سالاروں میں تقسیم کر دیا۔

سلطان محمود نے لوہ کوٹ کے متعلق بہت کچھ سنا تھا لیکن اُسے جب قلعہ نظر آیا تو اُس نے محسوس کیا کہ اسے بہت کم بتایا گیا ہے۔ وہ قلعے سر کرنے کا ماہر تھا لیکن لوہ کوٹ کا قلعہ دیکھ کر اُس نے اپنے آپ میں دھچکہ سا محسوس کیا۔ اس قلعے کو بجا طور پر ناقابلِ تسخیر کہا جاتا تھا۔ تمام مؤرخوں نے اسے ناقابلِ تسخیر لکھا ہے۔ یہ پہاڑی پر تعمیر کیا گیا تھا لیکن

تو یہ بلندی اس کی تسخیر میں حائل تھی۔ اس کی دیواریں پتھروں اور مٹی کی تھیں اور بہت چوڑی اور اس کے کئی برج تھے جہاں سے محاصرہ کرنے والی فوج کو نہایت آسانی سے تیروں کی زد میں لیا جا سکتا تھا۔ دیواروں میں نقب لگانے والے ماہر اور بے حد دلیر نقب زن بھی یہاں بے بس تھے۔ قلعے کے دروازوں کے باہر ایسی ڈھلانیں تھیں کہ ہاتھیوں کی ٹکروں سے یا بڑے بڑے شہتیر بیلوں کے ساتھ باندھ کر ان سے بھی دروازے نہیں توڑے جا سکتے تھے۔

سلطان محمود نے قلعے کو دیکھا تو اپنی فوج کو روک کر کھڑا کر لیا۔ خود گھوڑے پر سوار ذرا بلندی پر چلا گیا اور بڑی بلند آواز سے اس نے اپنی فوج کا حوصلہ بلند کرنے کے لیے کہا — "اللہ کے سپاہیو! آج تم سلطنتِ غزنی کی خاطر نہیں، اپنے اللہ اور رسولؐ کی خاطر لڑو گے۔ ہم نے یہاں کے بچے بچے کو مسلمان کر دیا تھا مگر یہاں کے کفار نے یہاں کی غریب اور مجبور مخلوق کو صرف اس لیے ظلم کا نشانہ بنائے رکھا کہ یہ مسلمان ہو گئی ہے۔ آج تمہیں یہاں انہی کفار کے خون سے اسلام کی قندیل روشن کرنی ہے ..... وہ قلعہ نظر آ رہا ہے۔ برف میں ڈھکا ہوا یہ قلعہ تمہیں للکار رہا ہے۔ یہاں کا موسم تمہیں للکار رہا ہے۔ تم میدانوں اور ریگستانوں میں لڑے ہو۔ آج ثابت کر دو کہ زمین و آسمان جم جائیں مگر مسلمان کی رگوں میں خون گرم رہتا ہے اور ایمان کی حرارت برف کے پہاڑ پگھلا دیا کرتی ہے۔ ہم بہت دور سے آئے ہیں۔ ہم خدا کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ قسم کھاؤ کہ اس قلعے پر اسلام کا پرچم لہراؤ گے ورنہ واپس نہیں جاؤ گے۔"

سلطان محمود نے ایسی تقریر کبھی نہیں کی تھی۔ وہ سپاہیوں تک جوشیلے پیغام ان کے کمانڈروں کے ذریعے پہنچایا کرتا تھا۔ اس نے فوج کو ٹریننگ دے رکھی تھی۔ اس کے سامنے جذباتی تقریریں کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں لیکن اسے لوہ کوٹ کا قلعہ اور موسم نظر آ رہا تھا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ عزم کا اس قدر پکا سلطان خود اعتمادی سے دبنگ آواز میں بولنے والا جس کے چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کبھی نہیں دیکھی گئی تھی، اس وقت جانے کیسی ذہنی کیفیت میں تھا کہ اس کی آواز میں لرزہ تھا اور کبھی تو وہ چپ ہو جاتا تھا جیسے موزوں الفاظ ڈھونڈ رہا ہو۔

اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے گھوڑے سے اتر کر دو رکعت نفل نہ پڑھے اور یہ بھی نہ کہا (جیسے وہ اکثر کہا کرتا تھا) کہ مجھے اللہ کا اشارہ مل گیا ہے۔ فتح ہماری ہوگی۔ اس نے گھوڑے کی لگام کو جھٹکا دیا اور گھوڑا نیچے اتار لیا۔

اللہ اکبر کے نعرے لوہ کوٹ کے اردگرد گرجنے لگے۔ قلعہ جس پہاڑی پر کھڑا تھا اس سے ہٹ کر ٹیکریاں اور نیچی نیچی چٹانیں تھیں۔ ان پر درخت تھے لیکن قلعے والی پہاڑی کی ڈھلان سے تمام درخت کٹوا دیئے گئے تھے۔ اس پہاڑی کے دامن اور اردگرد کی چٹانوں کے دامن میں کچھ فاصلہ تھا۔ سلطان محمود نے قلعے کے گرد گھوم کر جائزہ لیا۔ قلعے کی دیواروں اور برجوں سے ہندو اسے للکار رہے تھے اور طعن بھی کر رہے تھے۔ ایک وقائع نگار نے لکھا ہے کہ فارسی کا ایک نعرہ بار بار سنائی دیتا تھا — "سلطان غزنی! تمہارے خدا نے تمہاری قسمت میں برف کی قبر لکھ دی ہے"

سلطان نے اردگرد کی چٹانوں پر تیر انداز چڑھا کر دیواروں پر تیر برسائے اور ان کے سائے میں نقب زنوں کو اس کام کے لیے آگے کیا کہ وہ قلعے والی پہاڑی میں سرنگ کھود دیں۔ انہیں معلوم تھا کہ کشمیر کی پہاڑیاں پتھریلی نہیں۔ ان میں مٹی زیادہ ہوتی ہے۔ لہٰذا کھدائی آسان تھی۔ سلطان نے یہ بھی سوچا تھا کہ سرنگ چند گز کھودی گئی تو کھودنے والے اس کے اندر تیروں سے محفوظ ہو جائیں گے اور کھودتے چلے جائیں گے۔

نقب زنوں نے سرنگیں کھودنے کے لیے ہلہ بولا لیکن ان میں سے ایک بھی زندہ نہ رہا۔ اوپر سے تیر صحیح معنوں میں موسلا دھار بارش کی طرح آئے اور تمام نقب زن وہیں ختم ہو گئے۔ اردگرد کی چٹانوں سے دیواروں پر جو تیر چلائے جاتے تھے وہ دوری کی وجہ سے کوئی نقصان نہیں کرتے تھے۔

چند ایک سپاہیوں نے دلیری کا یہ بے مثال مظاہرہ بھی کیا کہ وہ دروازہ توڑنے کا سامان اور آگ لگانے والی اشیا کے ساتھ قلعے کے دروازے کی طرف دوڑے مگر دروازے کے نیچے ڈھلان پر برف پڑی ہوئی تھی۔ سپاہی اوپر چڑھتے پھسلتے تھے۔ اوپر سے تیروں کی بوچھاڑیں آئیں اور سب کی لاشیں لڑھکتی ہوئی نیچے آئیں۔

دوسرے دروازوں پر بھی ایسے ہی حملے ہوتے گئے۔ صرف ایک دروازے تک چند ایک سپاہی پہنچ سکے اور انہوں نے کلہاڑوں سے دروازہ توڑنا شروع کیا مگر اوپر سے ان پر جلتی ہوئی گٹھڑیاں اور دہکتے ہوئے انگارے انڈیل دیئے گئے۔ سپاہیوں کے کپڑوں کو آگ لگ گئی۔ ان کے جسم جھلس گئے۔

علبی، گردیزی، ابن الاثیر اور دو یورپی مؤرخوں نے لکھا ہے کہ رات کو بھی سلطان کے نقب زن حیش قلعے کی پہاڑی کی ڈھلان میں سرنگیں کھودنے کی کوشش کرتے رہے۔ صبح سلطان نے دیکھا کہ پہاڑی کے دامن میں نقب زنوں کی لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔ سلطان کے منہ سے غصے سے جھاگ پھوٹنے لگی۔ وہ ہر طرف گھوڑا دوڑاتا اور سرنگیں کھودنے کے حکم دیتا پھر رہا تھا۔ اسلام کے نام پر سپاہی اور کماندار قربان ہوتے چلے جا رہے تھے۔

پھر ایک اور رات آ گئی اور اس رات کے ساتھ صرف برفباری نہیں بلکہ برفانی طوفان آ گیا۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ جھکڑ اتنے تیز اور برفباری اتنی زیادہ تھی کہ گھوڑے بھی برداشت نہ کر سکے۔ بیشتر گھوڑے ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ کوئی اوٹ نہیں تھی چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی چنانچہ برف تلے دبتی جا رہی تھیں۔ طوفان کا جدھر کا رخ تھا ادھر دریائے جہلم تھا۔ گھوڑوں کے ساتھ سوار بھی ادھر کو ہی ہٹتے جا رہے تھے اور اوپر سے لڑھکتے دریا میں گرتے جا رہے تھے۔ وہاں دریا بہت نیچے بہتا ہے۔ اس کا پاٹ تنگ ہے اس لیے گہرا بھی ہے اور بہاؤ بہت تیز۔

صبح طلوع ہوئی تو کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کل والی جگہ ہے۔ طوفان تھم گیا تھا اور برف کئی کئی فٹ پڑ چکی تھی۔ اس برف میں غزنی کے ہزاروں فوجی دب گئے تھے۔ سالاروں نے سلطان سے کہا — "اللہ کو یہی منظور تھا۔ اتنی فتوحات کے بعد ایک شکست کو ہم خاطر میں نہیں لاتے۔ ہم پھر آئیں گے۔ باقی فوج کو بچا لیں۔"

سلطان محمود نے خود اعتمادی اور تحمل سے تسلیم کر لیا کہ وہ ہار گیا ہے۔ اس نے واپسی کا حکم دے دیا۔ اب تو واپسی بھی محال ہو گئی تھی۔ راستے بند ہو گئے تھے۔ اس مشکل وقت میں وہ گائیڈ آگے آئے جو دراصل ہندو تھے مگر اپنے آپ کو جوشیلے مسلمان ظاہر کرتے تھے۔

انہوں نے سلطان کو تسلی دی کہ واپسی کا ایک راستہ ابھی محفوظ ہے۔ فوج بکھری ہوئی تھی۔ تین حصوں میں بٹ گئی۔ گائیڈوں نے اپنے آپ کو ان تینوں حصوں میں تقسیم کر لیا۔ سلطان کے سینکڑوں سوار گھوڑوں سمیت دریا میں بہہ گئے تھے۔ لاتعداد فوج لوہ کوٹ کے تیروں اور برف کے طوفان کی نذر ہو گئی تھی۔ اب بچی کھچی فوج تین حصوں میں تقسیم ہو کر گائیڈوں کے پیچھے چلی تو اس کا جو حشر ہوا اسے محمد قاسم فرشتہ یوں بیان کرتا ہے:

"سلطان محمود محاصرہ اٹھانے اور غزنی کو واپس چلے جانے پر مجبور ہو گیا۔ اس کی فوج کو مقامی گائیڈوں نے ایسا گمراہ کیا کہ بہت دنوں تک اس کی فوج برف کی اس دنیا میں بھٹکتی رہی۔ برف کے نیچے کھائیاں اور کھڈ تھے۔ دریا کی ڈھلان میں بھی برف تلے چھپ گئی تھیں۔ گھوڑے اور پیادے پھسلتے اور سیدھے دریا میں جاتے اور غائب ہو جاتے تھے۔ بہت سے سپاہی اکڑ کر مر گئے۔ اگر کوئی رک گیا تو وہیں اکڑ گیا۔۔۔۔

"یہ سلطان کی بہترین فوج تھی۔ وہ قلعہ تو سر نہیں کر سکا تھا لیکن گائیڈوں نے اسے گمراہ کیا اور خود غائب ہو گئے۔ سلطان محمود جب ٹلہ جوگیاں کے نائب سالار سار دگ کے کیمپ میں پہنچا، تو اس کے ساتھ اتنی تھوڑی فوج تھی جسے وہ بڑی آسانی سے گن سکتا تھا۔ چند دنوں بعد وہ غزنی چلا گیا۔"



طمع تخت کی اور تاج کی

۳ جولائی ۱۰۱۷ء (۵ صفر ۴۰۸ھ) کے روز سلطان محمود غزنوی کو اپنی تاریخ کی ایک بہت بڑی جنگ بہت برے اور بے حد خطرناک ایمان فروشوں کے خلاف لڑنی پڑی۔ اُس کی سلطنت اور اسلام کے خلاف یہ بڑی ہی خطرناک اور دور رس نتائج کی حامل سازش تھی جس کے پیچھے یہودیوں اور عیسائیوں کا ہاتھ تھا۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ محمود غزنوی ۱۰۱۵ء میں کشمیر سے شکست کھا کر واپس گیا تھا۔ اُسے کشمیر کی برفباری نے شکست دی تھی اور اُس کی شکست خوردہ فوج کو ہندو گائیڈوں نے مسلمانوں کے بہروپ میں گمراہ کیا اور فوج برف سے اٹی ہوئی وادیوں اور برف سے لدی ہوئی ڈھلانوں میں تباہ و برباد ہو گئی تھی۔

اتنے زیادہ نقصان کی تلافی کے لیے کئی سال درکار تھے۔ اس عرصے کے لیے سلطان محمود غزنوی فوجی لحاظ سے ختم ہو گیا تھا۔ وہ معمولی سا حملہ کر کے لڑنے کے بھی قابل نہیں رہا تھا۔ غزنی میں اُس کی کچھ فوج موجود تھی اور کچھ سرحدوں پر خیمہ زن تھی۔ اس سے وہ حملہ روک سکتا تھا۔ جوابی حملہ کرنے کے لیے اُس کے پاس کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اسے ہندوؤں کے حملے کا خطرہ بس تھا۔ اُس وقت تک وہ ہندوؤں پر دہشت طاری کر چکا تھا۔ وہ کشمیر سے شکست کھا کر قلعہ جوگیاں (بال ناتھ) رکا تھا۔ راجہ بھیم پال تھوڑی سی فوج سے اُس پر حملہ کر دیتا تو اُسے زندہ پکڑ سکتا تھا مگر راجے مہاراجے اُسے زخمی شیر سمجھتے ہوئے اُس کے قریب نہیں جاتے تھے۔

سلطان محمود کو خطرہ اپنے بھائیوں سے تھا جن کی ریاستیں اُس کی سلطنت کے ارد گرد تھیں۔ وہ سب مل کر بھی اور باری باری بھی اُس کے خلاف لڑ کر شکست کھا چکے

تھے اور اس سے خائف رہتے تھے۔ اب ان کے لیے بڑا اچھا موقع تھا کہ اُس پر ٹوٹ پڑتے۔

مئی ۱۰۱۵ء میں سلطان محمود جب ہندوستان سے واپس غزنی گیا تو اُس کی حالت کٹی ہوئی پتنگ جیسی تھی جو ہوا کے رحم و کرم پر ڈولتی زمین کی طرف آتی ہے اور اُسے پتہ نہیں ہوتا کہ زمین پر گرے گی یا کسی درخت کی ٹہنیوں میں اُلجھ کر پھٹ جائے گی۔ اُس کے ساتھ تھوڑی سی فوج تھی اور یہ فوج ماتمی جلوس کی طرح غزنی میں داخل ہوئی تھی۔ غزنی کے لوگ جو اس کے استقبال کے لیے راستے میں آن کھڑے ہوئے تھے، اُن کے ہونٹ سل گئے تھے۔ اُن کے فاتحانہ نعرے اُن کے سینوں میں قید ہو گئے تھے۔ عورتیں جو دروازوں میں اور منڈیروں پر کھڑی تھیں، انگلیاں دانتوں تلے دبا کر رہ گئیں۔

سلطان محمود غزنوی نے اپنی قوم کو اس اُداس سکوت میں دیکھا تو اُس نے گھوڑا روک لیا اور اپنے سالار التونتاش کو بلایا۔

"التونتاش! یہ لوگ خاموش کیوں ہیں؟ اگر فوج ماری گئی ہے تو ان کے نعرے کیوں مر گئے ہیں؟...... انہیں کہو کہ فوج قوم کے لیے زندہ رہتی ہے۔ انہیں کہو کہ تم نہ مر جاؤ۔ نعرے لگاؤ۔ کہو اسلام زندہ باد۔ کہو سلطنت غزنی زندہ باد۔ اپنے زخمی سپاہیوں کے حوصلے بڑھاؤ۔ تمہارے نعرے ان زخمی شیروں کو اٹھا دیں گے اور وہ جو شہید ہو گئے ہیں وہ اپنی زندگی قوم کو دے گئے ہیں۔"

التونتاش نے بلند آواز سے سلطان محمود کے الفاظ دہرائے تو غزنی کے در و دیوار اور غزنی کا آسمان اسلام زندہ باد، پاسبان اسلام زندہ باد اور بت شکن زندہ باد کے نعروں سے لرزنے لگے۔

"اور ان ماؤں اور بہنوں سے کہو کہ اسلام کی ناموس تم سے تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی مانگ رہی ہے۔"

التونتاش نے بلند آواز سے سلطان کے یہ الفاظ بھی دہرائے تو عورتوں نے اُن پھولوں کا جو انہوں نے سلطان کی حالت دیکھ کر چھپا لیے تھے، زخم خوردہ فوج پر مینہ برسا دیا۔ عورتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں ـــ "ہمارے بیٹوں کو لے جاؤ۔ ہمارے بھائیوں

کو بے جاؤ۔"

سلطان محمود غزنوی نے قوم کا حوصلہ بڑھا دیا تھا مگر اُس کے اپنے سینے میں جو خلش تھی، اُس نے اسے بے چین کیے ہوئے تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے لوہ کوٹ (کشمیر) میں اپنی شکست کی تمام تر ذمہ داری اپنے اوپر ڈال لی تھی۔ اُس نے اپنے سالاروں اور غزنی میں مقیم اپنی فوج کے کمانڈروں کو بلا کر کہا کہ فتح و شکست خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اس شکست کا ذمہ دار میں خود ہوں۔ میں نے وہاں کے موسم کی طرف توجہ نہ دی۔ میں نے اپنے مخبروں اور جاسوسوں سے وہاں کی کیفیت نہ پوچھی اور پھر میں ہندو راہنماؤں کے جھانسے میں آ گیا۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ قوم کو یہ شکست فتح میں بدل کر دکھائیں۔ ہمارا کام صرف حکومت کرنا نہیں۔ میرا یہ حکم یاد رکھو اور اس کی تعمیل کرو کہ قوم کا کوئی فرد تمہیں شکست کا طعنہ دیتا ہے تو اس طعنے کو خندہ پیشانی سے قبول کرو اور اسے یقین دلاؤ کہ تمہاری فوج تمام شکوے دُور کر دے گی۔

ذمہ داری اپنے اوپر لینے کے باوجود اُسے چین نہ آیا اور وہ اپنے مرشد ابوالحسن خرقانی سے ملنے روانہ ہو گیا۔ خرقانی ایک دن اور آدھی رات کی مسافت جتنی دُور رہتے تھے۔ اُس نے اپنے محافظوں کے ساتھ تیز رفتاری سے یہ مسافت طے کی اور اپنے مرشد کے قدموں میں جا گرا۔

"سلطان کا انداز بتا رہا ہے کہ شکست کھا کر آیا ہے" — ابوالحسن خرقانی نے کہا — "مگر سلطان کی آنکھوں میں یہ آنسو کیسے؟"

"ندامت کے" — سلطان محمود نے کہا — "میرے مرشد میری روح بے چین ہے۔ جن کی لاشیں کشمیر کی برف تلے چھوڑ آیا ہوں، ان کی روحیں راتوں کو سونے نہیں دیتیں۔ میں کچھ سوچنے کی حالت میں نہیں رہا۔"

"وہم ہے سلطان!" — خرقانی نے کہا — "شہیدوں کی روحیں انہیں بے چین نہیں کیا کرتیں جو اُن کے لہو کے ایک ایک قطرے کا انتقام لینے کا عزم رکھتے ہیں۔ یہ بھی تمہاری فوج ہے۔ اسلام کے نام پر لڑنے کے لیے جس میدان میں جاؤ گے یہ روحیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ تم جیسے پُرعزم جنگجو کے راستے میں یہ جذبات رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ ہمت

نہ ہارو سلطان! ہندوستان کی مسجدیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔"

"میں بہت بڑے دھوکے میں آ گیا تھا" — سلطان محمود نے کہا — "ایک تو موسم نے دھوکہ دیا، دوسرے ہندو راہنماؤں نے مسلمان بن کر دھوکہ دیا۔"

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی" — خرقانی نے کہا — "کفر اسلام کو دھوکے دیتا چلا آیا ہے، دھوکے ہی دیتا چلا جائے گا۔ آئندہ ان دھوکوں سے بچو۔ ابھی تو آپ کو اپنی زمین پر جنگ لڑنی پڑے گی۔ یہودی اور عیسائی مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے ہماری جڑوں میں اتر گئے ہیں۔ خلیفہ جو اُمتِ رسولؐ کے اتحاد کی علامت تھا وہ خود اقتدار کی ہوس کا شکار ہو گیا ہے۔ ملت کی مرکزیت بکھر گئی ہے۔ اگر آپ اسلام کی خاطر جنگ و جدل کے شیدائی ہیں تو سلطانی کو دل سے نکال دیں۔ نظر دشمن پر رکھیں۔ فوجی طاقت سے دشمن کو مرعوب کریں، اپنی قوم کو نہیں۔ تاج اور تلوار ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ محبت تاج سے ہوتی ہے یا تلوار سے۔ وہ تلوار قابلِ نفرت ہوتی ہے جو تاج کی حفاظت کے لیے چلے۔ ایک شکست سے دل برداشتہ نہ ہو سلطان! اُٹھتے وہی ہیں جو گرتے ہیں۔ گر کر اُسی شان سے اُٹھو جس شان سے آپ نے دشمن کو للکارا تھا۔ اپنی غلطی اپنے سر لو۔ قوم کو دھوکے میں نہ رکھنا۔"

"آپ نے فرمایا ہے کہ یہودی اور عیسائی ہماری جڑوں میں اتر گئے ہیں" — سلطان محمود نے پوچھا — "آپ کا یہ اشارہ کس طرف ہے؟"

"اسلام کا سب سے بڑا دشمن یہودی ہے" — شیخ ابوالحسن خرقانی نے کہا — "وہ مسجدِ اقصیٰ کو اپنی عبادت گاہ سمجھتا ہے۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ فلسطین کو اپنا وطن بنا کر خانہ کعبہ پر بھی قبضہ کر لے اور ہمارے اس مقدس مقام کو مسمار کر دے۔ یہودی خود لڑنے والی قوم نہیں۔ اس کے پاس دولت ہے جسے وہ مسلمان کی جڑیں کاٹنے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ ہندوؤں کی طرح یہودی بھی اپنی بیٹیوں کو استعمال کرتے اور عیسائیوں کو مدد دے رہے ہیں۔ قرامطی فرقہ انہی کی پیداوار ہے۔ آپ کے خلاف لڑنے والے مسلمان ان سے در پردہ گٹھ جوڑ کیے ہوئے ہیں۔ آپ کو خانہ جنگی میں الجھانے

والے یہودی اور عیسائی ہیں... ہو سکتا ہے آپ کو اب ایک محاذ پر اسی سرزمین پر لڑنا پڑے۔ اپنے حریفوں کو اپنا دوست بنانے کی کوشش کرو۔ اپنے اللہ پر بھروسہ رکھو، ہوش میں رہو اور اپنی قوم کو اپنے ساتھ رکھو۔ فوراً ہی فوج تیار کرو اور خوارزم کی طرف توجہ دو۔ میں نے سنا ہے کہ خوارزم میں یہودیوں کا جادو چل رہا ہے۔"

اُس دور میں خوارزم ایک الگ ملک تھا جس کا دارالحکومت جرجانیہ تھا۔ بعد میں یہ گرگنج کہلایا۔ آج کل یہ ارگنج کہلاتا ہے۔ بخارا اسی ملک کا ایک صوبہ تھا۔ خوارزم میں مامونی خاندان کی بادشاہی تھی۔ بادشاہ خوارزم شاہ کہلاتا تھا۔ یہ پہلے بھی مسلمان ملک تھا۔ ۹۹۵ء میں ابو علی مامون بن محمد بن علی نے خوارزم پر حملہ کر کے اس کے بادشاہ ابو عبداللہ کو قید میں ڈال دیا اور تمام ملک پر قبضہ کر لیا تھا۔ دو ہی سال بعد ۹۹۷ء میں ابو علی مامون قتل ہو گیا لیکن اس کے دشمن مامونی خاندان کا تختہ نہ اُلٹ سکے۔ ابو علی کے بیٹے ابوالحسن علی مامون نے بادشاہی سنبھال لی۔ وہ بارہ سال بعد ۱۰۰۹ء میں بڑھاپے سے بہت پہلے مر گیا۔ وفات سے تین ساڑھے تین سال پہلے اُس نے سلطان محمود غزنوی کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے استحکام کے لیے سلطان کی بہن سے جس کا نام کاہ کالجی تھا، شادی کر لی تھی۔ ابو علی کی وفات کے بعد کاہ کالجی سلطان محمود کے پاس واپس آ گئی تھی۔

ابوالحسن علی مامون کی وفات کے بعد اُس کا چھوٹا بھائی ابو العباس مامون تخت نشین ہوا۔ اُس کی عمر اُس وقت پچیس سال تھی۔ اُس کی دو بیویاں تھیں۔ خوارزم شاہ کا وزیر ابو الحارث بن محمد تھا۔ وہ ابو العباس مامون کے باپ ابو علی مامون کے وقتوں سے وزیر چلا آ رہا تھا۔ بوڑھا ہو چکا تھا۔ اسے مامونی خاندان کے ساتھ دلی محبت پیدا ہو گئی تھی اور اُس کے سینے میں ایک سچے مسلمان کا جذبہ اور درد بھی تھا۔ ابو علی مامون کے بیٹے اُس کے ہاتھوں میں جنے پلے تھے۔ وہ انہیں باپ کی طرح مشورے دیا کرتا اور انہیں ناروا حرکتوں سے روکا کرتا تھا۔ خوارزم کے صوبہ بخارا کا گورنر امیر الپتگین پختہ عمر کا تجربہ کار اور گھاگھ آدمی تھا۔ اُس کے متعلق وزیر ابو الحارث کی رائے اچھی نہیں تھی۔ بظاہر وہ خوارزم شاہ کا وفادار بلکہ خوشامدی تھا مگر اُس کے مشورے اور اس کی رپورٹیں نیک نیتی پر مبنی نہیں

ہوتی تھیں۔

ابو العباس جب تخت نشین ہوا تو اُس نے اپنے وزیر ابو الحارث کو تنہائی میں بلایا اور اس کے ساتھ اپنے ملک کے دفاع اور رعایا کی خوشحالی کے لیے تبادلۂ خیالات کرنے لگا۔

"میرا باپ قتل ہو گیا تھا اور میرا بڑا بھائی مر گیا ہے" — ابو العباس نے کہا۔ "میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ راز کی ایک بات ہے جو دل میں کانٹے کی طرح اُتر گئی ہے۔ کیا آپ اس راز سے پردہ اُٹھا سکتے ہیں؟"

"جن پردوں کو میری بوڑھی آنکھیں چاک کر سکتی ہیں، اُن پردوں میں چھپے ہوئے راز مامونی خاندان سے کبھی نہیں چھپائے" — وزیر نے کہا۔ "مجھے اپنے دل کا کانٹا دکھائیں۔ شاید میں نکال سکوں۔"

"آپ جانتے ہیں کہ میرے بھائی کی وفات پر ہمارا امیر بخارا الپتگین آیا تھا" — ابو العباس نے کہا۔ "اُس نے مجھے کہا تھا کہ آپ کے بڑے بھائی کی وفات کے افسوس کے ساتھ میں آپ کو خوارزم شاہی کی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور آپ پر یہ راز فاش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کے والد مرحوم کو قتل کیا گیا تھا اور آپ قاتلوں کو جانتے ہیں مگر آپ کو یہ معلوم نہیں کہ آپ کے بھائی ابو الحسن مامون بھی قتل ہوئے ہیں، طبعی موت نہیں مرے ہیں۔ اس خبر پر حیران نہ ہوا کیونکہ میں اپنے دشمنوں کو جانتا ہوں۔ امیر بخارا نے کہا کہ میرے بھائی کو ایسا زہر دیا گیا تھا جس کے اثرات پیٹ کی کسی بیماری سے ملتے جلتے تھے۔ یہ زہر آہستہ آہستہ اثر کرتا رہا اور طبیب اسے پیٹ کا مرض سمجھتے رہے۔"

"یہ ممکن ہے" — ابو الحارث نے کہا۔ "دشمن کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ کے دشمن آپ کی جنگی طاقت سے خائف ہیں، وہ ایسے ہی اوچھے حربے استعمال کر رہے ہیں۔"

"لیکن محترم وزیر!" — ابو العباس نے کہا۔ "الپتگین نے وثوق سے کہا ہے کہ میرے بھائی کو سلطان محمود نے زہر دلوایا ہے اور یہ زہر اُسے سلطان محمود کی بہن کاہ کالجی نے جو اُس کی بیوی تھی، پلایا تھا۔ اُس نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ سلطان محمود نے میرے بھائی سے کہا تھا کہ اُس کی اطاعت قبول کر لے۔ میرے بھائی نے انکار کر دیا تھا۔ کیا میں

یقین کر لوں کہ التگین نے سچ کہا ہے؟"

"نہیں" ــــ وزیر ابوالحارث نے جواب دیا ــــ "میں اس انکشاف کو اس لیے صحیح نہیں مان سکتا کہ یہ التگین نے کیا ہے، اور اس لیے بھی نہیں مانوں گا کہ سلطان محمود مردِ میدان ہے۔ اُسے زہر دیا جا سکتا ہے، وہ زہر دے نہیں سکتا۔ میں اُس کے ذاتی کردار سے واقف ہوں۔ وہ سلطانی کا اور اپنی سلطنت کی توسیع کا خواہشمند ہوتا تو زندہ رہنے کی کوشش کرتا مگر تم دیکھ رہے ہو کہ وہ کتنی بار ہندوستان کے دور اندر جا کر جنگیں لڑ چکا ہے اور اب پھر ہندوستان گیا ہوا ہے۔ وہ اسلام کا شیدائی اور مبلغ ہے۔ وہ بت شکن ہے۔"

ان کے درمیان یہ باتیں اُس وقت ہو رہی تھیں جب سلطان محمود غزنوی کشمیر میں لوہ کوٹ کے قلعے کا محاصرہ کیے ہوئے تھا اور اُس کی فوج برف باری میں تباہ ہو رہی تھی۔

"آپ دیکھ رہے ہیں کہ سلطان محمود کتنی بار مرنے کی کوشش کر چکا ہے" ــــ وزیر ابوالحارث نے کہا ــــ "ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کی جنگی طاقت معمولی نہیں۔ اس طاقت سے صرف محمود ٹکر لے سکتا ہے اور وہ لے رہا ہے۔ ایسے جنونی اور جنگجو کسی کو زہر نہیں دیا کرتے۔"

"میں قتل نہیں ہونا چاہتا" ــــ ابوالعباس نے کہا ــــ "میں دوست بنانا چاہتا ہوں جو زندہ رہیں اور زندہ رہنے دیں۔ مجھے مشورہ دیں کہ میں ترکستان کے خوانین کو دوست بناؤں یا سلطان محمود کو۔ مجھے سلطان محمود سب سے زیادہ طاقتور نظر آتا ہے۔ آپ کی رائے اس کے متعلق جو کچھ بھی ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ جس طرح اپنے دشمنوں کو زیر کر کے اُن کے علاقے سلطنتِ غزنی میں شامل کر چکا ہے، اسی طرح وہ مجھے بھی کسی وقت کہہ دے گا کہ میری اطاعت قبول کرو۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لیے ایک مخلص اور طاقتور دوست کی ضرورت ہے۔"

"اور وہ صرف سلطان محمود ہے" ــــ وزیر نے کہا۔

"میرے دل میں جو بات آئی ہے وہ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں" ــــ ابوالعباس نے کہا ــــ "دوستی کے رشتے باتوں اور وعدوں سے پکے نہیں ہو سکتے۔ میں نے ایک طریقہ سوچا ہے۔ وہ یہ ہے کہ میں سلطان محمود سے اُس کی بہن کاہ کالجی کا رشتہ مانگ لوں۔ وہ میرے بڑے بھائی کی بیوہ ہے۔ مجھے اچھی لگتی تھی۔ عمر میں مجھ سے شاید ایک سال بڑی ہے۔ کیا سلطان محمود مجھے یہ رشتہ دے دے گا؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا" ــــ ابوالحارث نے کہا اور ہنس کر بولا ــــ "کیا آپ نے یہ خطرہ محسوس نہیں کیا کہ اس عورت نے آپ کے بھائی کو زہر دیا ہے تو وہ آپ کو بھی زہر دے سکتی ہے؟"

"نہیں" ــــ ابوالعباس نے کہا ــــ "کالجی مجھے زہر نہیں دے سکتی" ــــ اُس نے وزیر سے نگاہیں پھیر کر خلا میں دیکھا اور جذباتی سی سرگوشی کی ــــ "کالجی مجھے زہر نہیں دے سکتی" ــــ وہ وزیر سے مخاطب ہو کر ذرا بلند آواز سے بولا ــــ "وہ جان گئی تھی کہ مجھے اُس کے ساتھ روحانی لگاؤ پیدا ہو گیا ہے۔ میں اس کے خاوند کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ مجھ سے پیار کرتی تھی۔ مجھے پیار سے شہزادہ کہتی تھی..... سچ بتاؤں محترم وزیر! بھائی کے مرنے کے بعد میں محسوس کر رہا ہوں کہ بھائی کی جدائی کو میں نے برداشت کر لیا ہے، کالجی کی جدائی ناقابلِ برداشت ہے۔"

"کیا آپ محبت کی خاطر کالجی سے شادی کرنا چاہتے ہیں یا سلطان محمود کے ساتھ دوستی قائم کرنے کے لیے؟"

"دونوں باتیں میرے سامنے ہیں" ــــ ابوالعباس نے جواب دیا ــــ "لیکن غالب کالجی کی محبت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کالجی کو مجھ سے پیار تھا، وہ پاک محبت تھی جیسی ایک بہن یا اچھی بھابھی کی ہوتی ہے لیکن اب صورت بدل گئی ہے۔ میں کالجی میں اتنا کھل گیا تھا کہ میری چھوٹی بیوی الجوری مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔ الجوری کے باپ الپ تاق کو آپ جانتے ہیں۔ ہماری فوج کا ایک سالار ہے۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ الجوری کو مجھ سے شکایت ہے۔ میں نے اپنے اس سسر سے کہا تھا کہ وہ مجھ پر اور میرے بھائی کی بیوی پر ایک بے ہودہ الزام عائد کر رہا ہے اور وہ آئندہ ایسی جرأت نہ کرے۔

ہیں نے اُس کے ماتھے پر جو شکن دیکھے تھے وہ اچھے نہیں تھے۔

"سلطان محمود کو ہندوستان سے واپس آنے دیں" — وزیر نے کہا۔ "آپ کی اس تجویز میں آپ کی محبت بھی شامل ہے اور سیاست بھی۔ آپ ابھی سوچیں، میں بھی سوچوں گا۔"

یہ باتیں اُس وقت ہو رہی تھیں جب سلطان محمود کو کشمیر کی برفباری شکست سے دوچار کر رہی تھی اور اُس کی وہ جنگی طاقت جس کی وجہ سے ابوالعباس اُسے اپنا برادرِ نسبتی اور اتحادی بنانا چاہتا تھا، وہ دریائے جہلم میں ڈوب رہی تھی اور برف کے نیچے دفن ہو رہی تھی۔

اس سے چھ ماہ بعد کا واقعہ ہے کہ وزیر ابوالحارث ایک روز ابوالعباس کے پاس گیا اور اُسے تنہائی میں لے جا کر کہا۔ "غزنی سے ایک عجیب خبر آئی ہے۔ سلطان محمود ہندوستان سے ایسی بری شکست کھا کر آیا ہے کہ اُس کے ساتھ فوج کا دسواں حصہ بھی نہیں اور جو فوج آئی ہے وہ زخمی ہے۔ اب کے گھوڑے کے ساتھ نہ سونے جواہرات سے لدے ہوئے ہاتھی ہیں نہ ہندوستان کے جنگی قیدی۔ وہ اپنی جنگی قوت تباہ کر آیا ہے۔"

"میں اس کے باوجود اُس کی بہن کالہ کاہجی کے ساتھ شادی کر لوں گا" — ابوالعباس نے کہا۔ "آپ کو زندگی کا جو تجربہ ہے وہ مجھے نہیں لیکن آپ میری تائید کریں گے کہ میں سلطان محمود کے مشکل وقت میں دوستی کا ہاتھ بڑھاؤں گا تو وہ میرا ممنون و مشکور ہو گا، پھر ہم پر کبھی مشکل وقت آن پڑا تو وہ ہماری مدد کو ضرور پہنچے گا..... آپ یہ بتائیں کہ اُس تک یہ پیغام پہنچانے کا کون سا موقع موزوں ہو گا، اور کیا مجھے خود جانا چاہیئے؟"

"موقع یہی موزوں ہے" — وزیر نے کہا۔ "شکست پر اظہارِ افسوس کرنا ضروری ہے اور رسمی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ آپ اُس کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔ آپ کا جانا ضروری نہیں، میں جاؤں گا اور میں شادی کا پیغام بھی دوں گا۔"

چند دنوں بعد وزیر ابوالحارث روانہ ہوا، دس بارہ محافظوں اور تحائف سے لدے ہوئے چار اونٹوں کے ساتھ غزنی پہنچا۔ سلطان محمود کو اطلاع ہوئی کہ خوارزم شاہ ابوالعباس کا وزیر آیا ہے تو سلطان نے اُسے اُسی وقت بلا لیا۔

"خوارزم شاہ ابوالعباس مامون نے سلطان عالی مقام کی خدمت میں برادرانہ سلام مع کچھ تحائف بھیجے ہیں" — وزیر نے کہا — "اور دلی رنج کا اظہار کیا ہے کہ سلطان عالی مقام کو ہندوستان کی مہم میں بہت نقصان اُٹھانا پڑا اور ناکامی ہوئی۔ خوارزم شاہ نے فرمایا ہے کہ خدائے ذوالجلال نے سلطان کو جہاں اتنی فتوحات عطا فرمائی ہیں وہاں ایک شکست بھی اُسی کا دین ہے۔ سلطانِ غزنی کو اللہ تعالیٰ نے جو حوصلہ عطا فرمایا ہے، اس کے سامنے یہ شکست کوئی معنی نہیں رکھتی۔ خوارزم شاہ ابوالعباس مامون نے فرمایا ہے کہ میری طرف سے کسی بھی قسم کی مدد اور کسی بھی قسم کے تعاون کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ بھائی مشکل کے وقت کام آتے ہیں۔"

"یہ میرے دربار کے آداب کے خلاف ہے کہ ایک بادشاہ کا وزیر میرے سامنے کھڑا ہو کر بات کرے" — سلطان محمود نے کہا۔ "آپ میرے برابر بیٹھ جائیں" —

وزیر سلطان محمود کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا تو سلطان نے کہا "میں خوارزم شاہ ابوالعباس مامون کا مشکور ہوں کہ انہوں نے اُس وقت دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے جب مجھے یہ خطرہ ہے کہ میرے حریف میری کمزوری سے فائدہ اُٹھائیں گے۔ اُن کی خدمت میں میرا سلام پیش کر دینا اور کہنا کہ مجھے دوستوں کی ضرورت ہے لیکن میں مدد صرف اللہ سے مانگا کرتا ہوں..... مجھے خوارزم کے اندرونی حالات کے ساتھ دلچسپی ہے۔ ابوالعباس ابھی نوجوان ہے۔ کیا وہ سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے کہ دریائے زرافشاں کے کنارے بخارا میں کیا ہو رہا ہے؟ کیا وہ اپنے امیر ایلتگین کی نیت کو سمجھتا ہے؟"

"اگر وہ نہیں سمجھتا تو میں جو ہوں" — ابوالحارث نے کہا۔ "امیر ایلتگین کی نیت پر مجھے بھی شک ہے لیکن ہمیں اپنی فوج پر بھروسہ ہے۔"

"جہاں تک میں جانتا ہوں، آپ کو اپنی فوج پر اتنا بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے" — سلطان محمود نے کہا۔ "فوج کیا ہوتی ہے؟..... سالاروں اور نائب سالاروں کو فوج کہتے ہیں۔ فیصلے اُن چند ایک آدمیوں کے ہوتے ہیں اور فوج کو آلۂ کار کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ حکومت کا نشہ سالاروں پر طاری ہوتا ہے لیکن قوم کی نفرت فوج کے حصے میں آتی ہے۔ سالاروں کی بداعمالیوں کی سزا سپاہیوں کو ملتی ہے۔ آپ۔

کو نظر سالاروں پر رکھنی چاہیے۔"

کچھ دیر اُن کا تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔ وزیر تجربہ کار اور دانشمند تھا۔ اُس نے شادی کا پیغام دینے کا موقع پیدا کر لیا۔

"سلطانِ غزنی!" — وزیر نے کہا — "ابوالعباس مامون نے مدد کی پیشکش تو آپ کو کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خود مدد کے طلبگار ہیں۔ انہیں فوری طور پر کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ وہ دوستی کے خواہاں ہیں۔ انہیں ایسا دوست چاہیے جو انہیں وقت پر دھوکہ نہ دے۔ ایسا دوست آپ کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس دوستی کے دائمی استحکام کے لیے انہوں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ آپ کی بہن کاہ کاجی کے ساتھ شادی کریں جو اُن کے بڑے بھائی کی بیوہ بھی ہے۔ انہوں نے پوچھا ہے کہ سلطانِ عالی مقام اُن کی عرضداشت کو قبول فرمائیں گے؟"

"اس کا فیصلہ کاجی خود کرے گی" — سلطان محمود نے کہا — "میں کسی کی دوستی کو پکا کرنے کے لیے اپنی بہن کو اس طرح استعمال نہیں کروں گا۔ میں اُسے مشورہ دے سکتا ہوں۔ خوارزم اور غزنی کی دوستی کی اہمیت بتا سکتا ہوں، لیکن اُس پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونسوں گا۔ کچھ دنوں بعد آپ مجھ سے جواب لے سکتے ہیں۔"

"ابوالعباس اُس وقت اچھا لڑکا تھا جب وہ خوارزم کا بادشاہ نہیں تھا" — سلطان محمود کو اُس کی بہن کاہ کاجی نے جواب دیا — "اب وہ جوان ہے اور بادشاہ بھی۔ اب دیکھنا پڑے گا کہ اُس میں کیا تبدیلی آئی ہے۔"

"اُس کے پیغام کا جواب تم دو گی" — سلطان محمود نے کہا — "فیصلہ میرا نہیں ہو گا۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے ابوالعباس کے وزیر کو یہ کہہ کر رخصت کر دیا تھا کہ میں اپنی بہن پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونسوں گا۔"

"لیکن مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت تو ہے" — بہن نے کہا — "اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے خوارزم شاہ کے ساتھ شادی کر کے غزنی کو کوئی فائدہ پہنچے گا تو میں اُس کے ساتھ شادی کر سکتی ہوں۔ میرے دل میں کسی بادشاہ کے ساتھ شادی کرنے

کی خواہش نہیں ہے۔ میں کسی کے حرم کی زینت نہیں بننا چاہتی۔ میں ملکہ بھی نہیں بننا چاہتی۔ جس کے بھائی کے شب و روز جہاد میں گزر رہے ہوں، وہ بہن ملکہ نہیں بنے گی۔ مجھے یہ بتائیں کہ ابوالعباس خوارزم شاہ کی تیسری بیوی بن کر اسلام اور سلطنتِ غزنی کو کوئی فائدہ پہنچے گا تو میں اُس کی زوجیت کو قبول کر لوں گی۔"

"خوارزم ایک ایسا ملک ہے جس کی فوج جہاد میں استعمال کی جا سکتی ہے" — سلطان محمود نے کہا — "مسلمان بادشاہیاں اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں آپس میں ٹکرا رہی ہیں۔ ان میں سے دو تین کے حکمران متحد ہوتے ہیں تو صرف اس لیے کہ انہیں کسی طاقتور حریف سے خطرہ ہوتا ہے۔ اُن کا اتحاد اسلام کی خاطر نہیں ہوتا۔ یہ لوگ مسلسل خانہ جنگی میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ اور یہودی اور عیسائی جلتی پر تیل ڈال رہے ہیں۔ میں انہیں کفر کے خلاف متحد کرنا چاہتا ہوں۔ خوارزم ایک طاقتور ملک ہے لیکن مجھے اطلاعیں ملی ہیں کہ اس ملک میں کوئی فتنہ سر اُٹھا رہا ہے۔ شاید ابوالعباس کو اس کا علم نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایلک خان اُسے میرے خلاف کر دے۔ خوارزم کی فوج ان حالات میں غزنی پر چڑھ دوڑے گی جب میں فوج کی کمی پوری کر رہا ہوں۔ میں اُن کا مقابلہ اب بھی کر سکتا ہوں لیکن یہ خانہ جنگی ہو گی۔ یہ دو مسلمان ملکوں کی جنگ ہو گی جس میں اسلام کی طاقت ضائع ہو گی اور اس کا فائدہ کفار کو پہنچے گا اور اس کا فائدہ ہندوستان کے ہندوؤں کو بلکہ ہندوؤں کے باطل مذہب کو پہنچے گا۔"

"اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ابوالعباس کی زوجیت میں جا کر اُسے ایلک خان کے فتنہ پرداز ہونے سے بچا سکتی ہوں تو مجھے اُس کی زوجیت قبول ہے" — کاجی نے کہا۔

"یہ تم بہتر سمجھتی ہو کہ جب تم اُس کے بھائی کی بیوی تھیں تو ابوالعباس پر تمہارا کتنا کچھ اثر تھا" — سلطان محمود نے کہا — "اور تمہارا اُس کے ساتھ کوئی رابطہ تھا یا نہیں؟"

"اُس وقت وہ میرے زیرِ اثر تھا" — کاہ کاجی نے کہا — "میرے دل میں اُس کا پیار تھا اور وہ میرے پیار کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ زیادہ وقت میرے پاس گزارتا تھا۔ اُس کا باپ قتل ہو گیا تھا اور اُس کی ماں مر گئی تھی۔ وہ تھا تو شہزادہ مگر شاہانہ جاہ و

جلال سے جذبات کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ وہ مجھے اپنی ماں بھی اور اپنی بہن بھی سمجھا کرتا تھا۔ اس کی شادی ہوئی پھر اس کی دو بیویاں ہو گئیں مگر وہ روحانی تسکین مجھ سے حاصل کیا کرتا تھا۔ اس کا بھائی مر گیا اور میں تین ماہ بعد اس کے گھر سے رخصت ہوئی تو آپ تصور میں نہیں لا سکتے کہ وہ کس طرح رو رہا تھا۔ اپنے بھائی کی موت پر وہ اتنا نہیں رویا تھا۔"

"پھر تم اسے اپنے سانچے میں ڈھال سکتی ہو"۔۔۔ سلطان محمود نے کہا۔۔۔ "اس کے دماغ میں صرف غزنی کی نہیں اسلام کی محبت پیدا کرنی ہے۔ مجھے اپنی سلطنت کو خطروں سے بچانے کی ضرورت نہیں۔"

"اگر اس کا دماغ پھر نہیں گیا تو میں اسے اپنے سانچے میں ڈھال سکتی ہوں"۔۔۔ کالجی نے کہا۔۔۔ "میں آپ کے عزم اور اسلام کی ناموس کے لیے اپنے جذبات اور اپنی زندگی وقف کر دینا چاہتی ہوں۔ میں خوارزم کی فوجی طاقت کا دھارا کفار کی طرف موڑ دوں گی۔ میں آپ کے ساتھ جہاد میں شریک نہیں ہو سکتی لیکن میں آپ کے جہاد میں جان ڈال سکتی ہوں۔ آپ کو طاقت دے سکتی ہوں۔"

سلطان محمود نے اسی روز تحائف کے ساتھ ابوالعباس مامون کو پیغام بھیج دیا کہ وہ سلطان کی بہن کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔

ایک مہینے کے اندر اندر شادی ہو گئی۔

اور یہ شادی اتنے بڑے طوفان کا باعث بن گئی جس نے عالم اسلام کو ہلا ڈالا۔ صرف زمین پر ہی لڑائی نہ ہوئی، سلطان محمود غزنوی کو زمین دوز بھی لڑنا پڑا جس میں دونوں فریقوں کے ہزار آدمیوں نے حصہ لیا۔ اس ہولناک جنگ سے پہلے ایک ڈرامہ کھیلا گیا جس کی ابتدا شادی کی ضیافت پر ہی کر دی گئی۔

یہ سب سے بڑی ضیافت تھی۔ خوارزم کے دارالحکومت جرجانیہ میں چراغاں نے دن کا منظر بنا دیا ہوا تھا۔ ابوالعباس مامون نے اپنے تمام ستارے جرجانیہ کے قلعے کی دیواروں اور شہر کی منڈیروں پر بکھیر لیے تھے۔ دوسری ریاستوں کے حاکم کئی ضیافت میں موجود تھے اور

اور اس ضیافت میں سلطان محمود کی نمائندگی اس کے دو مشہور سالار — ابو عبداللہ محمد الطائی اور الطنطاش کر رہے تھے۔ ان دونوں کے ساتھ محافظوں کے علاوہ دو اور فوجی کمانڈر تھے جو سلطان محمود کے محکمہ جاسوسی اور سراغرسانی کے اعلیٰ حاکم تھے۔

ضیافت میں خوارزم کے صوبہ بخارا کا گورنر الپتگین بھی تھا۔ ابوالعباس مامون کی فوج کا سالار خمرطاش بھی تھا جو خوارزم کے ایک بڑے شہر ہزار اسپ میں متعین تھا، اور وہ سالار ابواسحاق بھی تھا جو ابوالعباس مامون کا سسر تھا۔ ان تینوں کے چہروں پر خوشی کا ہلکا سا تاثر بھی نہ تھا۔ وہ تینوں اکٹھے بیٹھے تھے۔ وہ سلطان محمود کے نمائندہ سالاروں سے ذرا ہٹ کے بیٹھے تھے یا ان سے دور بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے غزنی کے وہ دو فوجی کمانڈر بیٹھے تھے جو جاسوسی اور سراغرسانی کے سربراہ تھے۔ ان دونوں کو سلطان محمود نے خاص مقصد کے لیے بھیجا تھا۔

"میری بہن کے ساتھ شادی کر کے ابوالعباس مامون ہمارا دوست یا ہمارا راست بن گیا ہے"۔۔۔ سلطان محمود نے انہیں کہا تھا۔۔۔ "ہو سکتا ہے ابوالعباس ہمارا بہت راست بن ہی جائے لیکن آپ ہی نے اپنے ذرائع سے وہاں کے اندر کے حالات معلوم کر کے مجھے بتایا ہے کہ خوارزم کے امرا میں اور ابوالعباس کے سالاروں میں [illegible] کہیں سازش سر ابھار رہی ہے۔ [illegible] یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم الطائی اور الطنطاش ہی کے ساتھ رہو۔ تم شہری لباس میں ہو گے اور اپنے آپ کو سمرقند کے تاجر ظاہر کرو گے۔ وہاں زیادہ مہمان ہوں گے۔ [illegible] کھیلا جا رہا ہے۔ تم وہاں کے تین آدمیوں کے ساتھ ساتھ رہنا، ان کی طرف نگاہ رکھنا۔ ان کی آپس میں گفتگو، ان کے انداز اور ان کی حرکتیں دیکھنا اور یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ ان کے ارادے کیا ہیں۔ ان میں ایک الپتگین امیر بخارا ہے، دوسرا ابواسحاق اور تیسرا خمرطاش۔ یہ دونوں سالار ہیں۔"

ان دونوں کو اس سے زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود ہی اپنے جاسوسوں سے معلوم کر چکے تھے کہ خوارزم میں کوئی بہت بڑا خطرہ پرورش پا رہا ہے چنانچہ جرجانیہ کی ضیافت میں وہ [illegible] پر کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ دونوں فوجی ہیں اور ایسے

سراغرساں کہ اُن کی نظریں زمین کی تہوں میں بھی اور انسانوں کے سینوں کے اندر بھی چلی جاتی ہیں۔ وہ ڈھیلے ڈھالے جسموں والے احمق سے تاجر لگتے تھے۔ دونوں التگین، ابواسحاق اور خمرطاش کے پیچھے بیٹھے تھے۔ مشعلوں کی روشنی میں گھوڑ دوڑ شروع ہونے والی تھی۔ گھوڑ سواری کے کرتب دکھائے جانے تھے۔ تیغ زنی کے مظاہرے اور کشتیوں کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

ابوالعباس مامون کی آمد کا اعلان ہنگامہ خیز موسیقی سے ہوا۔ ابوالعباس کاہ کاکی کے ساتھ آرہا تھا۔ کاکی دراز قد، خوبصورت اور جوان تھی۔ اُس کی چال میں شاہانہ جلال اور انداز میں وقار تھا۔ ابوالعباس بھی خوبرو تھا۔ ان دونوں کے پیچھے ابوالعباس کی پہلی دو بیویاں آرہی تھیں۔

"سلطان محمود نے اپنی بہن کے عوض خوارزم شاہ کو نہیں پورے خوارزم کو خریدنے کی کوشش کی ہے" — خوارزم کے سالار ابواسحاق نے جو ابوالعباس کا سُسر بھی تھا، طنزیہ کہا۔

التگین نے پیچھے دیکھا۔ پیچھے دو اجنبی بیٹھے ہوئے تھے جو سلطان محمود کی جاسوسی کے نظام کے اعلیٰ حاکم تھے۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟" — التگین نے مسکرا کر اُن سے فارسی زبان میں پوچھا۔

دونوں مسکرائے اور سر ہلا دیئے۔ یہ اشارہ تھا کہ ہم آپ کی زبان نہیں سمجھتے، حالانکہ ان دونوں کی مادری زبان فارسی تھی۔ التگین، خمرطاش اور ابواسحاق نے باری باری اُن سے اشاروں میں پوچھنے کی کوشش کی تو ایک نے کہا — "کرک تاغ" — یہ شرق میں بہت دور ایک پہاڑی علاقہ تھا جہاں کی زبان کچھ اور تھی۔

"یہ ہماری زبان نہیں سمجھتے" — التگین نے اپنے ساتھیوں سے کہا — "میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا.... ہاں، ابواسحاق! آپ کیا کہہ رہے تھے؟"

"میں کہہ رہا تھا کہ یہ شادی غزنی اور خوارزم کی ہوئی ہے" — ابواسحاق نے کہا — "سلطان محمود اور اُس کی بہن اس نوجوان مامون کو انگلیوں پر نچائیں گے اور اسے پتہ ہی نہیں چلے گا کہ خوارزم پر غزنی کا قبضہ ہو گیا ہے۔ کیا آپ اس صورت کو برداشت کر

لیں گے التگین؟"

"وقت آنے دو" — التگین نے کہا — "خوارزم میں غزنوی آئے تو ان کی لاشیں بھی نہیں ملیں گی۔"

"اس کا انتظام پہلے سے ہونا چاہیئے" — سالار خمرطاش نے کہا۔

"فوج آپ کی کمان میں ہے" — امیر التگین نے کہا — "اسے اپنے اثر میں لے لیں۔"

"کیا ہمیں یہ باتیں یہاں کرنی چاہئیں؟" — ابواسحاق نے کہا۔

"گھبرائیں نہیں" — خمرطاش نے کہا — "پیچھے والے دونوں ہماری زبان نہیں سمجھتے۔"

"دائیں بائیں آواز جا سکتی ہے" — التگین نے کہا — "احتیاط ضروری ہے.... ابواسحاق! کیا آپ کی بیٹی کا ابوالعباس پر کوئی اثر نہیں؟"

"ہے تو سہی" — ابواسحاق نے کہا — "لیکن اب کیسے رہے گا۔ محمود کی بہن بہت چالاک عورت ہے۔ اب میری بیٹی کا اثر ختم ہو جائے گا۔"

پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں آدمی اُن کی باتیں غور سے سُن رہے تھے۔ التگین اور اُس کے ساتھیوں نے جب بھی پیچھے دیکھا، اُن دونوں کو گھوڑوں کے کھیل تماشے میں محو پایا۔ گھوڑوں کے دوڑنے کا اور مہمانوں کی چیخ و پکار کا شور بہت زیادہ تھا۔ سلطان محمود کے یہ دونوں حاکم التگین اور دونوں سالاروں کی باتیں سُننے کی کوشش کرتے رہے مگر انہوں نے موضوع بدل لیا تھا۔ ان کی باتوں سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں اور وہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے۔

جشن کا ہنگامہ آدھی رات کو ختم ہوا۔

امیر بخارا التگین، سالار ابواسحاق اور خمرطاش ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور ایک عورت اندر آئی جس کا چہرہ نقاب میں تھا۔ اندر آتے ہی اُس نے چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔ وہ ابوالعباس کی بیوی اور ابواسحاق کی بیٹی انگوری تھی۔

"رات کی باتیں معلوم ہو گئی ہیں" — انگوری نے بیٹھتے ہوئے کہا — "کاہ کاکی

کی جو خادمہ رات کے لیے مقرر کی گئی تھی، میں نے اُسے پہلے ہی ہاتھ میں لے لیا تھا۔ رات اُس نے حجلۂ عروسی کے دروازے کے ساتھ کان لگائے رکھے تھے۔ اُسے کوئی وہاں سے ہٹا نہیں سکتا تھا کیونکہ اُسے دروازے پر ہی موجود رہنا تھا۔ اُس نے دروازے کا ایک کواڑ ذرا سا کھلا رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد اُسے اندر بلا لیا گیا تھا۔ اُس کی موجودگی میں بھی ابوالعباس اور کاکی باتیں کرتے رہے تھے۔ سب سے پہلے میں آپ کو یہ بتا رہی ہوں کہ کاہ کاکی صرف بیوی بن کر نہیں آئی۔ وہ ایک پیغام اور ایک پھندہ بن کر آئی ہے۔ ابوالعباس بھی اُسے صرف بیوی نہیں سمجھتا۔ اُسے اپنے دل کی ملکہ اور سراپا عشق کہتا ہے۔ خادمہ نے جو باتیں سُنائی ہیں وہ میں آپ کو سنا دیتی ہوں۔"

کسی بادشاہ اور ملکہ کی رات کی خادمہ کے لیے رات کی باتیں معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ خادمہ نے اکبری کو جو باتیں سنائیں وہ کچھ اس طرح تھیں۔

"ابوالعباس!" ___ کاہ کاکی نے کہا ___ "اگر تم نے میرے ساتھ صرف اس لیے شادی کی ہے کہ تمہیں تیسری بیوی کی ضرورت تھی تو مجھے بتا دو۔ میں تمہاری محبت کو سینے میں دفن کر کے اس پر آنسو بہا لوں گی۔"

"مجھے تمہاری ضرورت تھی" ___ ابوالعباس نے کہا ___ "میرے لیے بیویوں کی تو کمی نہیں ..... کیا تم جب میرے بھائی کی بیوی تھیں تو بھی مجھے اسی طرح چاہتی رہی ہو؟"

"وہ محبت کچھ اور تھی ابوالعباس!" ___ کاکی نے جواب دیا ___ "ایک بُت شکن سلطان کی بہن اپنے خاوند کو دھوکہ نہیں دے سکتی۔ تم مجھے اچھے لگتے تھے۔ تمہاری عادتیں اچھی لگتی تھیں۔"

"تو میں یہ سمجھوں کہ تم نے میری زوجیت اس لیے قبول کی ہے کہ میں تمہیں اچھا لگتا تھا؟"

"صرف اس لیے نہیں" ___ کاہ کاکی نے کہا ___ "جس طرح تمہارے لیے بیویوں کی کمی نہیں اسی طرح میرے لیے بھی خاوندوں کی کمی نہیں تھی۔ سلطنتِ غزنی میں ایک سے ایک خوبصورت اور بہادر جوان تھا لیکن تمہاری زوجیت قبول کرنے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ میں تمہارے لیے صرف محبت نہیں لائی، ایک پیغام بھی لائی ہوں۔ یہ پیغام

میرے باپ کا نہیں، خدا کا ہے ..... کیا تم اس سے انکار تو نہیں کرو گے کہ غزنی کو آنے والی نسلیں بُت شکنوں کا اور باطل کو روندنے والوں کا شہر کہا کریں گی؟ اور کیا تم اس سے انکار کرو گے کہ غزنی اپنے اردگرد کی تمام مسلمان امارتوں اور ریاستوں کے حکمرانوں کے دلوں میں کانٹا بن کر اُترا ہوا ہے اور وہ اسلام کی تاریخ کے اس درخشاں باب پر سیاہی انڈیلنا چاہتے ہیں؟"

"مجھے انکار نہیں" ___ ابوالعباس نے کہا ___ "تم جو کہہ رہی ہو یہ بالکل سچ ہے لیکن تم نے ان باتوں کے لیے آج کی رات کیوں منتخب کی ہے؟ کیا تم میرے رومانوں اور میرے اتنے پیارے خوابوں کو آج ہی رات میدانِ جنگ میں لے جانا چاہتی ہو؟"

"ہاں ..... آج ہی رات" ___ کاہ کاکی نے کہا ___ "ازدواجی زندگی کی پہلی رات بڑی مقدس ہوتی ہے ابوالعباس! یہ رات تمہارے لیے نئی نہیں، اور یہ رات میرے لیے بھی نئی نہیں۔ میں تمہیں رومانوں اور خوابوں سے محروم نہیں کروں گی۔ اگر تمہارے خواب میرے وجود سے حسین ہیں تو میں اُن کا حسن پامال نہیں ہونے دوں گی۔ مجھے دل کی بات کہہ لینے دو اور مجھے اپنے دل کی بات کہہ لینے دو۔ ابھی ساری رات باقی ہے۔ ابھی ساری عمر کی راتیں باقی ہیں۔ ذرا سی دیر کے لیے میری سُن لو .....

"آج کی رات جو ہم دونوں کے لیے مسرتوں اور رومانوں کی رات ہے، غزنی کی ہزاروں ماؤں اور ہزاروں بہنوں کے لیے بڑی ہی اُداس اور غمناک رات ہے۔ وہ اُن بیٹوں اور اُن بھائیوں کے انتظار میں جاگ رہی ہیں جو کبھی نہیں آئیں گے۔ وہ اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہندوستان گئے تھے اور حق اور باطل کے خونریز تصادم میں پس گئے۔ وہ خدا کے حضور سرفرو ہوئے کہ معابد ھرگئے، مسجدیں آباد رکھیں اور بُت خانے زمین سے ملا دیئے۔ وہ اللہ کے عظیم پیغام پر قربان ہو گئے۔ میں آج رات کی مسرتیں اُن کی نذر کرتی ہوں .....

"اور پھر اُنہیں یاد کرو جو تخت و تاج کے ہوس کاروں کی ہوس کی بھینٹ چڑھ گئے۔ ہماری سرزمین خانہ جنگی کے خون سے لال ہو گئی تھی، اور اگر آج رات تم میری باتیں غور سے نہیں سُنو گے تو یہاں بھائی کی تلوار ..... اگر دن کاٹتی رہے گی بھائیوں کی

۲۲۲

کمانوں سے نکلے ہوئے تیر بھائیوں کے سینوں میں اُترتے رہیں گے۔ آج کی رات مجھے اُن کی بھی مائیں اور بہنیں یاد آرہی ہیں جو اپنے بادشاہوں کی خواہشوں پر کٹ مرے تھے۔ تم ابھی جوان ہو ابوالعباس! میں بھی ابھی جوان ہوں۔ آؤ، تھوڑی سی دیر جوانی کے اُبال کو اور عروسی کے جذبات کو الگ رکھ کر دو چار باتیں کرلیں ....

"خوارزم نے ابھی تک غزنی پر حملے کی کیوں نہیں سوچی؟ تمہارا باپ کیوں قتل ہو گیا تھا؟ کیونکہ اُس نے غزنی پر قبضہ کرنے کی نہیں سوچی تھی۔ اُسے کیا ہو گیا تھا۔ وہ مارا اور قتل کر دیا گیا۔ تمہارے بڑے بھائی کا دماغ خراب ہو چلا تھا لیکن اُس نے میرے ساتھ شادی کر لی۔ میں نے پہلی رات اُس کے ساتھ بھی باتیں کی تھیں۔ یہ باتیں اُس کے دل میں اُتر گئیں۔"

"کیا تم نے بھی سُنا تھا کہ میرے بھائی کو تمہارے بھائی سلطان محمود نے زہر دلوایا تھا؟" — ابوالعباس نے کہا۔ "اور زہر دلوانے کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

"کیا تمہیں اس جھوٹ پر یقین آ گیا تھا؟" — کاہ کاکجی نے پوچھا۔

"مجھے شک تھا۔"

"شک بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔" — کاہ کاکجی نے کہا۔ "اپنی فوج سے چار پانچ گنا زیادہ فوج پر ٹوٹ پڑنے والا سلطان کسی کو زہر نہیں دیا کرتا۔ اُسے تمہارے بھائی کی موت کی ضرورت ہوتی تو وہ یہاں خود آتا، جُرجانیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتا اور تمہارا بھائی اُس کے قید خانے میں پڑا ہوا ہوتا۔ میں تمہیں یہ کہہ رہی تھی کہ تمہارے بھائی نے میری باتوں کا اثر لیا اور اُس نے غزنی کے ساتھ دشمنی مول لے لی۔ یہ شک مجھے بھی ہے کہ تمہارے بھائی کو ایسا زہر دیا گیا تھا جو آہستہ آہستہ بیماری کی صورت میں ظاہر ہوا اور وہ مجھے بیوہ کر گیا۔ اگر اُسے زہر ہی دیا گیا تھا تو اُن لوگوں نے دیا تھا جو غزنی اور خوارزم کو لڑانا چاہتے تھے۔"

"وہ کون ہو سکتے ہیں؟" — ابوالعباس نے پوچھا۔

"وہ ہیں تو مسلمان لیکن ان سازشوں اور خانہ جنگی کے پیچھے فرنگیوں کا ہاتھ ہے۔"

— کاہ کاکجی نے کہا۔ "یہودیوں اور عیسائیوں کا خفیہ ہاتھ ہے اور اس میں قرامطی بھی شامل ہیں جن کے مرکز اور سرغنہ کو میرا بھائی ختم کر چکا ہے۔"

"کاکجی!" — ابوالعباس نے گھبرا کر کہا۔ "میں اسی عمر میں قتل نہیں ہونا چاہتا۔"

"کہو، میں قتل ہونا چاہتا ہوں لیکن اللہ کی راہ میں" — کاکجی نے کہا۔ "میرا بھائی ہندوستان میں جا کر قتل ہونے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے۔ میں جانتی ہوں، بلکہ خدا جانتا ہے کہ تم میرے بھائی کے دوش بدوش چلو۔ میں اپنا سہاگ قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم اتنا کرو کہ سلطنت غزنی کے ساتھ اتحاد کر لو۔"

"آج کل سلطان کو ایک طاقتور اتحادی کی ضرورت ہے" — ابوالعباس نے کہا — "اس کی جنگی طاقت بہت کمزور ہو گئی ہے۔"

"یہ غلط ہے" — کاہ کاکجی نے کہا — "غزنی کی جنگی طاقت اتنی کمزور نہیں ہوئی جتنی تم سمجھتے ہو۔ غزنی میں خاصی فوج موجود ہے۔ ہندوستانیوں کے دستے بھی ہیں جنہیں ہندوستان میں نہیں لے جایا جاتا۔ انہیں یہاں لڑانے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ وہ ہمارے پاس بہت خوش ہیں اور اسلام قبول کرتے جا رہے ہیں۔ سلطنت غزنی سے ہزار ہا رضاکار عارضی طور پر فوج میں شامل ہو گئے ہیں، اور جو کمی ہے وہ جذبے سے پوری کی جاتی ہے۔ لہٰذا دل سے یہ خیال نکال دو کہ سلطان محمود کو اپنی سلطنت کے دفاع کے لیے کسی طاقتور اتحادی کی ضرورت ہے۔ البتہ تمہیں ایک مخلص اور طاقتور اتحادی کی ضرورت ہے۔"

ابوالعباس کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر سوچ کر بولا — "میں تمہارے بھائی سے اتحاد کر لوں گا لیکن اُس کی اطاعت قبول نہیں کروں گا۔ اگر اُس نے کہا کہ خطبے میں اُس کا نام لیا جائے تو اس کی اجازت نہیں دوں گا .... کاکجی! میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ تمہاری محبت کے علاوہ تمہارے ساتھ شادی کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں اندرونی اور بیرونی خطرات میں اتنا گھبر چکا ہوں کہ مجھے تمہارے بھائی کی دوستی کی ضرورت ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ دوستی کا حق ادا کرے گا۔"

"میں اس کی ذمہ داری لیتی ہوں کہ وہ دوستی کا حق ادا کرے گا" ــــ کابجی نے کہا ــــ "لیکن اصل ضرورت یہ ہے کہ اگر تمام مسلمان امارتیں کفر کے خلاف متحد نہ ہوں تو خوارزم اور غزنی اس محاذ پر دوش بدوش لڑیں۔"

"ایسا ہی ہوگا" ــــ ابوالعباس نے کہا۔

اور ابوالعباس نے رومانی اور جذباتی باتیں شروع کر دیں۔ خادمہ نے اجوری کو بتایا کہ وہ دیکھ تو نہیں سکتی تھی، اُن کی باتیں سُن سکتی تھی۔ خادمہ کا خیال تھا کہ اتنی خشک باتیں کرنے والی اور جہاد کا وعظ دینے والی عورت رومانی باتوں اور حرکتوں میں کوری ہوگی مگر اُس کی ہنسی بھی رومان انگیز تھی اور باتیں ایسی کہ ابوالعباس پر نشہ طاری ہوگیا ہوگا۔ کابجی کھلنڈری لڑکی بن گئی۔ خادمہ نے بتایا کہ اُس کی باتیں توبہ شکن تھیں۔

التگین نے خادمہ کو دینے کے لیے اجوری کو سونے کے دو دینار دیئے اور اُسے کہا کہ وہ ان دونوں کی ہر ایک بات خادمہ سے پوچھتی رہے خواہ کوئی بات کتنی ہی غیر اہم کیوں نہ ہو۔

اجوری چلی گئی تو التگین نے ابواسحاق اور خمرطاش سے کہا ۔ "ہمارا خیال صحیح نکلا۔ یہ شادی بلامقصد نہیں ہوئی۔"

"یہ اتحاد نہیں ہوگا" ــــ ابواسحاق نے کہا ــــ "خوارزم شاہ ابوالعباس کو جوانی اور رومانوں نے اندھا کر رکھا ہے۔ ہم اس کے وزیر ابوالحارث کو ہاتھ میں لیں گے۔"

"ابوالحارث بہت خطرناک آدمی ہے" ــــ التگین نے کہا ۔ "اس کے ساتھ کوئی بات نہ کرنا ۔ وہ مامونی خاندان کا پروردہ اور وفادار ہے۔ جو کچھ کرنا ہے ہمیں خود کرنا ہے۔ اگر ابوالعباس زن مرید بن گیا تو اسے زیادہ دن زندہ نہیں رہنے دیا جائے گا۔ ابوالعباس بچہ ہے۔ وہ سمجھ نہیں سکا کہ محمود نے بہن دے کر خوارزم کا سودا کیا ہے۔"

"ہمیں فوج کو ہاتھ میں لینے کی ضرورت ہے" ــــ سالار خمرطاش نے کہا ــــ "فوج خوارزم شاہ کی وفادار ہے۔"

"دارالحکومت (جرجانیہ) میں فوج تھوڑی ہے" ــــ التگین نے کہا ــــ "فوج کا زیادہ تر حصہ ہزار اسپ میں اور میرے پاس بخارا میں ہے۔ اس فوج کو اپنے اثر میں لانا ہے ..... مجھے سوچنے دو ۔ میں شاید کوئی انتظام کر لوں گا۔ خانہ جنگی کے لیے فوج کو کوئی گھاگ استاد ہی تیار کر سکتا ہے۔"

خوارزم کے دارالحکومت جرجانیہ سے پچاس میل دور جنوب میں دریا کے کنارے ہزار اسپ بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ وہاں فوج ایک مدت سے فارغ پڑی تھی۔ وہ جنگ و جدل کا زمانہ تھا مگر خوارزم کی اس فوج نے برسوں سے کوئی لڑائی نہیں لڑی تھی۔ کمانداروں اور سپاہیوں کے دماغ فارغ تھے۔ اُن کے شب و روز ہنسی مذاق، گپ بازی اور بیکار مشاغل میں گزر رہے تھے۔ فوج کا رجحان مذہب کی طرف کم ہی تھا۔

ایک روز ایک فقیر جس کی داڑھی سیاہ و سفید تھی، اور جو کندھوں سے پاؤں تک لمبے کُرتے میں ملبوس تھا جس کا رنگ سبز تھا، فوجیوں کی بارکوں کے قریب سے گزرا۔ اُس نے سر پر سبز رنگ کا صافہ لپیٹ رکھا تھا۔ صافے پر موٹے دانوں کی تسبیح لپٹی ہوئی تھی۔ صافے کے علاوہ ایسی ہی تسبیحاں جن کے دانوں کے کئی رنگ تھے، اس کے گلے میں پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں لمبا عصا اور دوسرے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ وہ دھماکہ نما بلند آواز سے بولتا جا رہا تھا ــــ "لا الٰہ الا اللہ۔ لا الٰہ الا اللہ" ــــ اس کے ساتھ ہی وہ عصا زور سے زمین پر ٹھونکتا تھا۔

فوجیوں نے اس قسم کا فقیر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سپاہیوں کے ایک ہجوم نے اسے گھیر لیا۔ وہ رُک گیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے بلند آواز سے بولا ــــ "دریا کے کنارے ڈوب جائیں گے۔ پہاڑ پھٹ جائیں گے۔ آسمان آگ برسائے گا ..... لا الٰہ الا اللہ لا الٰہ الا اللہ۔"

اُس نے اپنے گرد کھڑے سپاہیوں کی طرف نہ دیکھا اور ایک طرف چل پڑا۔ اُس نے لا الٰہ الا اللہ کے دھماکوں کے ساتھ عصا زمین پر مارا تو سپاہیوں نے اُسے راستہ دے دیا۔ بعض سپاہی اس کے پیچھے چل پڑے۔ ایک سپاہی نے اس کے ہاتھ میں چاندی کا ایک درہم دے دیا۔ چند اور سپاہیوں نے اسے دینے کے لیے جیبوں سے

درہم نکالنے۔ وہ لے بھکاری فقیر کو سمجھ رہے تھے لیکن فقیر کے ہاتھ میں جو درہم تھا وہ اُس نے دانتوں میں لے کر دوہرا کر دیا اور اسے دائیں اچھال کر دُور پھینک دیا۔ باقی سپاہیوں نے جیبوں سے نکالے ہوئے درہم اپنی جیبوں میں ڈال لیے۔ اُس کی اس بے نیازی سے سب مرعوب ہو گئے۔

دو آدمی تیز تیز چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے سپاہیوں کے ہجوم کو روک لیا۔ ان میں سے ایک نے سپاہیوں سے کہا ــــ "اسے پریشان نہ کرنا۔ اسے پیسے بھی نہ دینا۔ اس کے منہ سے جو بات نکل جائے وہ پوری ہو کے رہتی ہے۔ یہ غیب کا کوئی پیغام دے رہا ہے۔ یہ پندرہ سولہ سال بعد نظر آیا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا کہ پندرہ سولہ سال پہلے سمرقند میں زلزلہ آیا تھا۔ زلزلے سے ایک دو دن پہلے یہ فقیر سمرقند کی گلیوں میں نظر آیا تھا۔ یہ اسی طرح لاالہٰ الاّاللہ پڑھتا، عصا زمین پر ٹھونکتا اور بلند آواز سے کہتا پھرتا تھا ـــ 'سمرقند کی زمین گناہگاروں کے بوجھ سے تھک گئی ہے' ـــ اس کی پکار کو کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔ یہ وہاں سے غائب ہو گیا اور زمین اتنے زور سے ہلی کہ آدھا سمرقند تباہ ہو گیا۔ شراب خانے اور قحبہ خانے زمین سے مل گئے۔"

"اور اب یہ یہاں نظر آیا ہے" ـــ دوسرے آدمی نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا ـــ "اب معلوم نہیں دریا میں سیلاب آئے گا یا کوئی پہاڑ پھٹے گا یا آسمان سے آگ کس طرح برسے گی۔ کچھ ہوگا ضرور۔ کچھ ہونے والا ہے۔"

سپاہیوں پر خوف طاری ہو گیا۔ اُن کے رنگ زرد ہو گئے۔ کسی نے پوچھا کہ اس سے کس طرح پوچھا جائے کہ کیسی تباہی آ رہی ہے؟ کیوں آ رہی ہے؟ کیا یہ ٹل سکتی ہے؟

اَن پڑھ اور توہم پرست سپاہیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور وہ آپس میں کھسر پھسر کرتے بارکوں میں چلے گئے۔ تھوڑی سی دیر میں تمام تر فوج میں یہ دہشت ناک خبر پھیل گئی کہ ایک فقیر تباہی کا پیغام دیتا پھر رہا ہے۔ خبر جوں جوں پھیلتی گئی زیادہ سے زیادہ دہشت ناک ہوتی گئی۔ بارکوں میں یہی فقیر موضوع بن گیا اور سب اس مسئلے کا حل سوچنے لگے کہ فقیر سے کس طرح پوچھا جائے کہ کیسی تباہی آ رہی ہے اور کیوں آ رہی ہے۔

دوسرے دن خبر پھیل گئی کہ فقیر کو دریا کے کنارے دیکھا گیا ہے جہاں اُس نے چھوٹا سا ایک خیمہ لگا رکھا ہے۔ چند ایک سپاہی دریا کو چل دیئے۔ انہوں نے وہاں چھوٹا سا ایک خیمہ دیکھا جس کے قریب تین چار آدمی بیٹھے تھے۔ سپاہی ان کے قریب چلے گئے۔ خیمے کے اندر سے دھاڑ کے جیسی آوازیں آ رہی تھیں ـــ "لاالہٰ الاّاللہ۔ لاالہٰ الاّاللہ... خون کا طوفان ہے۔ روک لو۔ روک لو۔"

باہر جو آدمی بیٹھے تھے، انہوں نے سپاہیوں کو بتایا کہ وہ رات بھر یہاں رہے ہیں اور فقیر اپنا عصا ریت میں ڈبو ڈبو کر اس کی گہرائی دیکھتا رہا ہے۔ ان آدمیوں نے فقیر کے پاؤں چھو کر پوچھا کہ کیا ہونے والا ہے۔ فقیر نے آسمان کی طرف دیکھا تو تین ستارے اکٹھے ٹوٹے اور شرارے بکھیرتے بہت دُور دُور جا پھٹے۔ فقیر نے منہ اوپر کیے ہوئے کہا ـــ "ابھی وقت ہے۔ باز آجاؤ۔ خون کی طغیانی کو روک لو۔"

ان آدمیوں نے سپاہیوں کو بتایا کہ وہ اس فقیر کی کچھ خدمت کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ ان کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ سپاہی وہاں کھڑے فقیر کی آوازیں سنتے رہے اور ان آدمیوں کو فقیر کے متعلق جو کچھ معلوم تھا، پوچھتے رہے اور فقیر ان کے لیے خدا کا ایلچی بن گیا۔ یہ سپاہی جب بارکوں میں گئے تو انہوں نے فقیر کے متعلق کچھ نئی باتیں بتا کر سنسنی پھیلا دی۔ اُس روز کے بعد فقیر کا چھوٹا سا خیمہ سپاہیوں اور شہر کے لوگوں کے لیے زیارت گاہ بن گیا۔ وہ وہاں جاتے اور خیمے کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ خیمے کے اندر فقیر قرآن کی آیات بلند آواز سے پڑھتا اور للکارنے لگتا ـــ "خون کا طوفان آ رہا ہے۔ انسان انسان کو کھائے گا... بادشاہ عورت کا غلام ہو گیا ہے۔"

سلطان محمود غزنوی کے وہ دو حاکم جو اس کے نظام جاسوسی اور سراغرسانی کے سربراہ تھے، سلطان محمود کو بتا چکے تھے کہ انہوں نے ابوالعباس کی شادی کے جشن پر امیر الپتگین، سالار ابواسحاق اور سالار خمرطاش کی باتیں سنی تھیں اور ان تینوں کی نیت ٹھیک نہیں۔ اس جشن کو اڑھائی تین مہینے گزر گئے تھے۔ سلطان محمود نے ان دونوں سے کہا تھا کہ وہ ابوالعباس کے محل میں اور جرجانیہ میں اپنے چند ایک تجربہ کار آدمی

بھیج دیں جو اس سازش کا سراغ لگاتے رہیں۔ اس حکم کے تحت تین چار آدمی جرجانیہ بھیج دیئے گئے تھے مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اُن کا رابطہ کاہ کاکی کے ساتھ بھی ہو گیا تھا اور وہ انہیں یہی اطلاعیں دیتی رہی کہ ابوالعباس سلطان محمود کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

جو کچھ ہو رہا تھا وہ ہزار اسپ اور بخارا میں تھا۔ ہزار اسپ میں دریا کے کنارے فقیر لوگوں خصوصاً فوجیوں کے دلوں پر چھا گیا تھا۔ وہاں سے دو سو میل دور بخارا میں دریائے زرافشاں کے کنارے ایک اور فقیر مشہور ہو گیا جس نے وہاں ڈیرے ڈال دیئے تھے لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ چار پانچ مرد اور اتنی ہی عورتیں تھیں۔ اس فقیر کی یہ کرامات مشہور ہو گئیں کہ وہ ایک دوائی اور ایک تعویذ دیتا ہے جن سے انسان ہمیشہ جوان رہتا ہے اور اس کی عمر بڑی لمبی ہو جاتی ہے۔ ہر انسان لمبی عمر اور بڑھاپے میں بھی جوانی کا طلبگار ہوتا ہے لیکن فوجی پر چونکہ ہر وقت موت منڈلاتی رہتی ہے اس لیے وہ ایسے تعویذ کی ضرورت زیادہ محسوس کرتا ہے جو موت کو ٹال سکے۔ چنانچہ بخارا کے فوجی جوق در جوق اس فقیر کے پاس جانے لگے۔

پھر دونوں فقیروں نے لوگوں کو وعظ سنانے شروع کر دیئے۔ دونوں کے وعظوں کا لب لباب یہ ہوتا تھا کہ تم اللہ کے سپاہی ہو اور تمہارے پڑوس کی تمام ریاستیں اور امارتیں برائے نام مسلمان ہیں اور وہ تمہیں اپنا غلام بنانا چاہتی ہیں۔ اگر تم نے کسی پڑوسی پر اس لیے بھروسہ کیا کہ وہ مسلمان ہے تو تم پر ایسی تباہی آئے گی کہ تمہارا نام و نشان مٹ جائے گا۔

ان دونوں نے فقیری اور درویشی کا ایسا آثر ۔۔۔ ایک لفظ سپاہیوں کے دل میں اتر جاتا تھا۔

البتگین ایک رات اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا۔ اُس کے سامنے دو آدمی بیٹھے تھے جو خوارزم کے رہنے والے نہیں تھے اور وہ مسلمان بھی نہیں تھے۔ دونوں فرنگی تھے۔

"آخر اس ڈھونگ سے آپ کیا نتائج حاصل کرنا چاہتے ہیں؟" ـــ البتگین

نے اُن سے پوچھا۔

"آپ نے ہماری مدد کیوں حاصل کی ہے؟" ـــ ایک نے جواب دیا ـــ "صرف اس لیے کہ آپ فوج کو اپنا حامی بنا کر خوارزم شاہ بننا چاہتے ہیں مگر خوارزم کی فوج آپ کا یہ حکم ماننے کے لیے تیار نہیں کہ آپ جرجانیہ یعنی اپنے دارالحکومت پر حملہ کر کے وہاں کی فوج کو شکست دیں اور ہزار اسپ اور بخارا میں جو فوج مقیم ہے وہ اپنے بھائیوں کے خلاف لڑے۔ ہم نے یہاں آ کر جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ خوارزم کی فوج ابھی تک آپس میں لڑنا تو درکنار، اپنے کسی مسلمان پڑوسی کے خلاف بھی نہیں لڑی اور اس فوج کو یہ تربیت دی گئی ہے کہ مسلمان مسلمان کے خلاف نہیں لڑا کرتا۔ ہمیں سب سے پہلے ہزار اسپ اور بخارا میں جو دستے مقیم ہیں ان کے دلوں سے اسلام کا رشتہ توڑنا ہے....

"توہم پرستی واحد ذریعہ ہے جس سے کسی کے مذہب کو کمزور کیا جا سکتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ آنے والے وقت کے حالات اور ہونے والے واقعات جاننا چاہتا ہے۔ انسان کی دوسری کمزوری جنسی اور جذباتیت ہے جو انسان جنسی خیز باتوں کو پسند کرنے لگتا اور عقل پر جذبات کو غالب کر لیتا ہے، اُسے نہایت آسانی سے اپنے سانچے میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ انسان جتنا اَن پڑھ اور پسماندہ ہوتا ہے وہ اتنا ہی جذبات سے مغلوب ہوتا ہے۔ انسان کی تیسری کمزوری یہ ہے کہ وہ لمبی عمر چاہتا اور مرنے تک جوان رہنا چاہتا ہے....

"ہم نے آپ کے کمانداروں اور سپاہیوں کی یہ خامیاں ان دو فقیروں کے ذریعے بیدار کر دی ہیں۔ یہ دونوں فقیر اس فن کے ماہر ہیں۔ انہوں نے مذہب کا نام لے لے کر سپاہیوں کے دلوں میں مذہب کی جگہ توہم پرستی بھر دی ہے۔ دونوں فقیر آپ کے قرآن سے آیات پڑھ کر بات کرتے ہیں اور ان کی ہر بات قرآن کے اُلٹ اور اسلام کے منافی ہوتی ہے۔ ہمارے اُستادوں نے آپ کی فوج کے دلوں میں اسلام کی محبت قائم رکھتے ہوئے پڑوسی مسلمانوں کے خلاف شکوک اور وسوسے پیدا کر دیئے ہیں....

"ہم عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہمیں آپ کے مذہب کی ہر بات معلوم

ہے ۔ ہم نے آپ کے سپاہیوں پر مذہبی جنون طاری کر دیا ہے ۔ ہمارے بہت سے آدمی جو مسلمان ہی ہیں ، آپ کی چھاؤنیوں میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں ۔ وہ افواہیں پھیلاتے ہیں اور وہ ہر محفل میں کہتے ہیں کہ خوارزم کو سلطان محمود سے صرف البتگین بچا سکتا ہے ۔ خوارزم شاہ ابوالعباس اور اس کی بیوی کاہ کاجی کے خلاف اتنا زہر پھیلا دیا گیا ہے کہ سپاہی انہیں ناپسند کرنے لگے ہیں ۔ چند دنوں میں ہی آپ کی فوج بغاوت کے لیے تیار ہو جائے گی ....

آپ کے دو نائب سالار جو ابوالعباس کے کٹر حامی تھے ، انہیں ہم نے دو جوان اور بڑی ہی خوبصورت عورتوں کے ذریعے اپنے اثر میں لے لیا ہے ۔ آپ کو شاید معلوم نہیں تھا کہ یہ دونوں آپ کو اچھا نہیں سمجھتے تھے ۔ اب وہ بھی آپ کو پسند کرنے لگے ہیں ۔ اس کے علاوہ آپ کو اگر کوئی اور مدد چاہیے تو ہمیں بتا دیں ۔ ہم آپ کو مالی مدد دے سکتے ہیں ۔ اسلحہ دے سکتے ہیں ۔ جانور دے سکتے ہیں ۔"

"ابھی نہیں" ــــ البتگین نے کہا ۔ "اگر آپ نے مجھے مدد دی تو خوارزم شاہ کو پتہ چل جائے گا ۔ مجھے ایک بہانہ اور ایک موقع چاہیے تاکہ میں فوج کو اس کے خلاف بھڑکا سکوں اور اپنا حامی بنا لوں ۔ میں نے خوارزم شاہ کا تختہ الٹ دیا تو آپ سے مدد لوں گا ۔"

"اور میں ایک بار پھر کہہ دوں کہ ہمیں آپ سے کچھ نہیں لینا" ــــ دوسرے فرنگی نے کہا ۔ "ہمیں آپ کی صرف دوستی چاہیے ۔ پھر ہم آپ پر ثابت کریں گے کہ کلیسا اور کعبہ میں کتنا پیار ہے ۔ اس پیار میں سلطان محمود حائل ہے ۔ محمود کا خاتمہ ضروری ہے ۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں" ــــ البتگین نے کہا ۔ "محمود سلطنت غزنی کی توسیع چاہتا ہے ۔"

"آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ آپ کی فوج کسی مسلمان ملک کے خلاف تو نہیں لڑے گی ، یہ غزنی کے خلاف بالکل ہی نہیں لڑے گی" ــــ فرنگی نے کہا ــــ "یہ سلطان محمود کی بہن کاہ کاجی کا اثر ہے ۔ ہماری آنکھیں اس کمرے کے اندر تک دیکھ سکتی ہیں جس میں ابوالعباس اپنی پہلی دو بیویوں کو فراموش کر کے کاہ کاجی کے جادو میں اپنے ہوش کھو بیٹھتا ہے ۔

ابوالعباس غزنی کو فوجی مدد دے گا ۔ اس کے خلاف لڑے گا نہیں ۔"

دو بڑی دلکش لڑکیاں ان تینوں کو شراب پلا رہی تھیں اور البتگین پر شراب کا نشہ کم اور لڑکیوں کا خمار زیادہ طاری ہو رہا تھا ۔ وہ بار بار ان لڑکیوں کو دیکھتا تھا ۔ دونوں فرنگی اس پر خوارزم شاہی کا نشہ طاری کر رہے تھے ۔

کاہ کاجی کے پاس غزنی سے ایک نیا ملازم آیا تھا ۔ وہ جبیس نام کا ادھیڑ عمر آدمی تھا ۔ کاجی نے ابوالعباس کو بتایا تھا کہ یہ اس کا خاص ملازم تھا جسے اس کے بھائی سلطان محمود نے اس کے پاس بھیج دیا ہے ۔ ابوالعباس کو بھی یہ ملازم بہت پسند آیا تھا ۔ اس میں خاص قسم کی شائستگی ، نفاست اور ذہانت تھی ۔ وہ دوسرے ملازموں ، خدمت گاروں اور خادماؤں پر نگرانی کی اور انہیں اپنے قابو میں رکھنے کی مہارت رکھتا تھا ۔

ایک روز کاجی باغ میں بیٹھی تھی اور جبیس اس کے سامنے سر جھکائے اور ہاتھ نماز کی طرح باندھے کھڑا تھا ۔ یہ انداز ایسا تھا جیسے وہ کاجی کی بات سن رہا ہو مگر وہ سن نہیں رہا بول رہا تھا اور کاجی سن رہی تھی ۔

"کوئی گڑبڑ ضرور ہے" ــــ جبیس کہہ رہا تھا ۔ "بخارا اور ہزار اسپ سے جو اطلاعیں آئی ہیں ، ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کی فوج پر کوئی شیطانی اثر کام کر رہا ہے ۔ ہزار اسپ میں دریا کے کنارے ایک فقیر نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں جو بڑی خوفناک پیش گوئیاں کرتا ہے ۔ اس نے ایسا ڈھونگ رچا رکھا ہے کہ سپاہی اس سے متاثر ہو رہے ہیں ۔ وہ قرآن پاک ہاتھ میں رکھتا اور سپاہیوں کو درس اور وعظ دیتا ہے ۔"

"کیا یہ یقین کر لیا گیا ہے کہ وہ کوئی تارک الدنیا عالم نہیں ہے؟" ــــ کاہ کاجی نے پوچھا ۔

"وہ عالم ہو سکتا ہے تارک الدنیا نہیں ، اور وہ علم نہیں ابلیسیت پھیلا رہا ہے ۔" ــــ جبیس نے کہا ۔ "وہ غزنی کے خلاف زہر اگلتا ہے اور قرآن کی آیات پڑھ کر کہتا ہے کہ غزنی والے اور ارد گرد کی تمام مسلمان ریاستیں اور امارتیں برائے نام مسلمان ہیں اور سچے مسلمان خوارزم کے لوگ ہیں ۔"

"کیا وہ خوارزم شاہی کے خلاف بھی باتیں کرتا ہے؟" —— کاکجی نے پوچھا۔

"نہیں" جیمس نے جواب دیا —— "لیکن سپاہیوں اور کمانداروں کے خیالات میں ایسی تبدیلی دیکھی گئی ہے جو خوارزم شاہی کے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے ..... بخارا میں بھی دریا کے کنارے ایک فقیر نے چند ایک مردوں اور بڑی خوبصورت عورتوں کے ساتھ خیمے گاڑ رکھے ہیں۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دوائی اور ایک تعویذ دیتا اور کہتا ہے کہ ان سے عمر بہت لمبی ہوگی اور جوانی سدا قائم رہے گی۔ اس کے ساتھ جو جوان عورتیں ہیں وہ راتوں کو دریا کے کنارے یا جنگل میں کمانداروں کے ساتھ دیکھی گئی ہیں۔ وہاں کی فوج کی باتوں میں بھی تبدیلی دیکھی گئی ہے۔ اس فقیر کے گرد میلہ لگا رہتا ہے۔ وہ بھی وعظ کرتا اور غزنی کے خلاف زہر افشانی کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ غزنی اور خوارزم کے درمیان عداوت پیدا کی جا رہی ہے۔ ہمارے آدمیوں نے دونوں چھاؤنیوں میں سپاہیوں کے ساتھ اُٹھ بیٹھ کر اور ان فقیروں کے مرید بن کر ان کی باتیں سنی ہیں۔ وہی سپاہی جو فارغ رہ رہ کر غلیظ اور فحش باتیں یا حرکتیں کیا کرتے تھے، اب غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی باتیں کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ پتہ چلا ہے کہ وہاں بہت سی بدکار عورتیں پہنچ گئی ہیں جو سپاہیوں کو خراب کر رہی ہیں۔ ہمارے ایک آدمی نے ایسی ایک عورت سے ملاقات کی ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ یہ عورتیں صرف عصمت فروش نہیں بلکہ غزنی کے خلاف اور خوارزم شاہ ابوالعباس کے خلاف زہر پھیلانے کا ایک ذریعہ ہیں۔ ان کا تعلق ان فقیروں کے ساتھ معلوم ہوتا ہے .....

"ہمارے اس آدمی نے بتایا ہے کہ اس عورت نے اُسے دریا کے اندھیرے کنارے پر جا کر اتنے پیار سے باتیں کیں جیسے وہ لڑکپن سے چاہتی ہو۔ اس نے ہمارے آدمی سے پوچھا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ اُس نے بتایا کہ فوج کے ایک جیش کا کماندار ہے۔ یہ سنتے ہی عورت کا انداز پہلے سے زیادہ دلکش بلکہ مسحور کن ہو گیا جیسے وہ اس پر مر مٹی ہو۔ یہ عورتیں غیر معمولی طور پر حسین ہیں۔ ہمارا یہ آدمی کہتا ہے کہ اسے اپنے فرض کا احساس نہ ہوتا تو وہ ہمیشہ کے لیے اس عورت کا ہو جاتا۔ عورت نے اس پر نشہ

طاری کر کے کہا —— "تمہارا خوارزم شاہ تو زن مرید ہو گیا ہے۔ غزنی کی کاہ کاکجی نے اس کی عقل پر قبضہ کر لیا ہے اور وہ اسے انگلیوں پر نچا رہی ہے ....."

"ہمارے آدمی نے پوچھا کہ تم محل کے اندر کی باتیں کس طرح جانتی ہو؟ اُس نے کہا —— "میں محل کے حرم کی لڑکی تھی مگر جب سے ابوالعباس نے سلطان محمود کی بہن سے شادی کی ہے، غزنی سے ایک سے ایک حسین اور نوجوان لڑکی آتی ہے۔ یہ جو کاہ کاکجی ابوالعباس کو پیش کرتی ہے۔ اس کے کہنے پر حرم کی پہلی تمام لڑکیوں اور عورتوں کو نکال دیا گیا ہے" —— یہ کہ کر وہ رو پڑی اور بولی —— "تم ہی بتاؤ ہم کہاں جائیں۔ ہمارے لیے زندہ رہنے کا یہی ایک ذریعہ رہ گیا ہے۔ کیا تم مجھے پناہ میں لے سکتے ہو؟ مجھے اس غلیظ زندگی سے بچا سکتے ہو؟" —— ہمارے آدمی نے اُسے تسلی دی اور مدد کا وعدہ کیا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتی ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ امیر التونتاش کے ہاں دو اجنبی مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں جو مسلمان نہیں لگتے۔ وہ فرنگی ہو سکتے ہیں۔ یہودی ہوں گے یا عیسائی۔ اب آپ ہمیں بتائیں کہ کیا کرنا چاہیے۔ کیا آپ خوارزم شاہ کو بتائیں گی کہ ان کے خلاف کوئی سازش ہو رہی ہے؟"

"نہیں" —— کاکجی نے جواب دیا۔ "انہیں بتایا تو میں ان کے اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گی کہ مجھے یہ باتیں کس طرح معلوم ہوئی ہیں۔ ابوالعباس میرے ہاتھ میں ہیں۔ میں انہیں کہہ سکتی ہوں کہ ہزار اسپ اور بخارا کے دستوں کو دارالحکومت میں بلا لیں اور اُن کی جگہ یہاں کے دستے بھیج دیں تاکہ دستے آپس میں جگہ بدلنے پر اکتاہٹ محسوس نہ کریں لیکن میں ایسا مشورہ اس لیے نہیں دوں گی کہ جس طرح وہاں کی فوج خراب ہو رہی ہے، اسی طرح یہ دستے بھی وہاں جا کر ان فقیروں کا اثر قبول کر لیں گے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ ان دونوں فقیروں کو قتل کر دو۔ اگر یہ غزنی میں ہو رہا ہوتا تو انہیں گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اُتار دیا جاتا۔ یہاں اس سازش کو قتل سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ کیا ہمارے آدمی یہ کام کر سکتے ہیں؟"

"کر سکیں گے" —— جیمس نے کہا —— "ہمیں صرف حکم اور ہدایت کی ضرورت ہے۔"

"اور ایک آدمی غزنی کو روانہ کر دو جو سلطان کو یہ ساری باتیں بتا آئے جو تم نے مجھے

سنائی ہیں" — کالہ کابجی نے کہا۔ "اور سلطان کو یہ بھی بتا دیا جائے کہ میرے کہنے پر ان دونوں فقیروں کو قتل کیا جا رہا ہے۔"

اس سے اگلی رات ہزار اسپ سے باہر دریائے آکسس کے کنارے فقیر کے خیمے کے باہر ہجوم چھٹ رہا تھا۔ رات بہت گزر گئی تھی۔ بعض آدمی عورتوں کے ساتھ دور چلے گئے تھے جہاں انہیں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ دو آدمی سب کے چلے جانے کے انتظار میں اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔ فقیر مشعل بجھا کر خیمے میں چلا گیا اور خیمے کے باہر صرف دو آدمی رہ گئے۔ وہ اس طرح بیٹھے رہے جیسے انہیں یہیں رہنا تھا۔ ان سے کچھ دور جو دو آدمی گھوم پھر رہے تھے، وہ ان دو آدمیوں کو دیکھتے رہے۔"

"معلوم ہوتا ہے یہ فقیر کے ساتھی یا محافظ ہیں" — دور کے آدمیوں میں سے ایک نے کہا۔ "یہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

"یہ خیمے کے اندر چلے گئے تو ہم اپنا کام نہیں کر سکیں گے" — دوسرے نے کہا۔

"ایک طریقہ آزماتے ہیں" — پہلے نے کہا۔ "تم ان کے پاس چلے جاؤ اور اپنے آپ کو کماندار ظاہر کر کے ان سے فقیر کی باتیں اس طرح پوچھو جیسے تم فقیر سے بہت متاثر اور مرعوب ہو۔ میں اپنا کام کر دوں گا۔"

دوسرا آدمی ان دو آدمیوں کے پاس جا کھڑا ہوا اور اپنے ساتھی کے کہنے کے مطابق ان کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ اُس نے جب کہا کہ وہ کماندار ہے تو دونوں آدمیوں نے اس کے ساتھ دلچسپی سے باتیں شروع کر دیں۔ اس نے کہا کہ فقیر شاید سو رہا ہوگا، اس لیے ہمیں پرے چلے جانا چاہیے۔ ہماری باتیں انہیں بے آرام کریں گی۔ وہ انہیں پرے لے گیا۔ فقیر نے خیمے کے دونوں طرف کے پردے گرا لیے تھے۔

اُس کا ساتھی جو اندھیرے میں کھڑا تھا آہستہ آہستہ خیمے کی پچھلی طرف چلا گیا اور بیٹھ گیا، پھر پیٹ کے بل لیٹ کر اُس نے پردے کے نیچے سے اندر دیکھا۔ دیے کی روشنی میں اسے فقیر نظر آیا۔ وہ سجدے میں پڑا تھا اور اس آدمی کی طرف اُس کی پیٹھ تھی۔ اس آدمی نے کمر سے ایک رسی کھولی اور رسی ہاتھ میں لے کر پردے کے نیچے سے رینگتا ہوا

اندر چلا گیا۔ فقیر کو خبر نہ ہوئی۔ اس آدمی نے پاؤں پر بیٹھ کر رسی پیچھے سے فقیر کی گردن میں پھینکی۔ یہ پھندا تھا جو گردن میں پڑتے ہی تنگ ہو گیا۔ فقیر کی آواز بھی نہ نکلی۔ پھندا تیزی سے تنگ ہوتا گیا۔ فقیر بُری طرح تڑپا اور اُس کا جسم بے حس ہو گیا۔ وہ آدمی اس اطمینان سے کہ فقیر مر چکا ہے، خیمے سے نکلا اور کچھ دور تک ہاتھوں کے بل چلتا گیا۔

اُس کا ساتھی فقیر کے دو آدمیوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اُسے اُلّو کی آواز سنائی دی۔ وہ ان آدمیوں سے مصافحہ کر کے آگیا اور اپنے ساتھی سے آن ملا، پھر دونوں اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

بخارا وہاں سے بہت دور تھا۔ یہ آدمی اُسی رات وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ وہاں کے فقیر کو قتل کرنا اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ اُس کے ساتھ چند ایک آدمی بھی رہتے تھے۔ یہ دونوں آدمی اُسی وقت گھوڑوں پر بخارا کی سمت روانہ ہو گئے۔ اُن کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ دریا کے کنارے کنارے جا رہے تھے۔ ایک جگہ دریا کا پاٹ بہت چوڑا تھا جہاں دریا کی گہرائی کم ہونی چاہیے تھی۔ انہوں نے وہیں گھوڑے دریا میں ڈال دیے۔ بعض جگہوں پر گہرائی اتنی زیادہ تھی کہ گھوڑوں کو تیرنا پڑا — اُن کے سامنے دو سو میل کی مسافت تھی۔

دوسرے دن ہزار اسپ میں اس خبر نے سنسنی پھیلا دی کہ فقیر مر گیا ہے۔ یہ خبر بھی پھیل گئی کہ وہ مرا نہیں اسے مارا گیا ہے۔ شہروں کے لوگ اور فوجی دریا کے کنارے جمع ہو گئے۔ وہاں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ فقیر کو غزنی والوں نے قتل کیا ہے اور قاتلوں نے قرآن پاک کی بھی توہین کی ہے۔ اس خبر کو اس لیے سچ مان لیا گیا کہ فقیر غزنی کے خلاف باتیں کیا کرتا تھا۔ اس خبر نے چھاؤنی کو جیسے آگ لگا دی ہو۔ فرنگی تخریب کاروں اور شرپسندوں کے خفیہ گروہ نے دہشت ناک باتیں مشہور کر دیں۔ ہر طرف خوف چھا گیا کہ فقیر جس تباہی کی پیشین گوئی کیا کرتا تھا وہ اب آئی کہ آئی۔ فوج کے کماندر بھی ڈرے ہوئے اور غزنی کے خلاف بھڑکے ہوئے تھے۔

فقیر کے قاتلوں نے دو سو میل کی مسافت گھوڑوں کو تھوڑی دیر آرام دے کر اور سرپٹ رفتار پر ڈال کر چار روز میں تب تک طے کر لی جب سورج غروب ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک شہر میں گیا اور اپنے ساتھیوں سے ملا جو کسی نہ کسی بہروپ میں شہر میں رہتے اور ایوانِ امارت کی سرگرمیوں کی اطلاعیں لیتے رہتے تھے۔ ان میں سے دو آ گئے۔ انہیں بتایا گیا کہ کیا کرنا ہے۔

"اکیلے فقیر کا قتل آسان تھا" — ایک نے کہا — "یہاں ایک گروہ ہے فقیر کو ہم نے دیکھا ہے۔ رات خیمے میں اکیلا ہوتا ہے لیکن دوسروں کے خیمے اس کے ساتھ لگے ہوئے ہیں"۔

"مشکل یہی ہے کہ دوسرے جاگ اُٹھے تو ہم پکڑے یا مارے جائیں گے" — ایک نے کہا — "اپنے حلف کو یاد کرو جو غزنی سے روانہ ہونے سے پہلے ہم سے لیا گیا تھا۔ ہمیں جانیں قربان کرنی ہیں۔ اگر ہم سلطان کو دھوکہ دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں لیکن ہم خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ یہ فقیر قرآن پاک ہاتھ میں لے کر مسلمانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا رہا ہے۔ تم دیکھ چکے ہو کہ اس فتنے کے پیچھے فرنگیوں کا ہاتھ ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے اسلام کے خلاف اور اسلام کی تباہی کے لیے ہو رہا ہے۔ یہاں امیر التگین خوارزم شاہی کے لالچ میں قرآن پاک کی توہین کرا رہا ہے۔ ہمیں اپنے مذہب اور مقدس کتاب کی عظمت اور ناموس پر قربان ہونا ہے"۔

چاروں نے گھوڑے دریا کے قریب جنگل میں باندھے اور رات اُس وقت فقیر کے خیموں کی طرف گئے جب لوگ وہاں سے جا رہے تھے۔ وہ لوگوں میں گھومتے پھرتے رہے، حتیٰ کہ آخری آدمی بھی وہاں سے چلا گیا۔ اب وہاں تاریک گوشوں میں عورتوں کی سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں۔ آدھی رات کے بعد خیموں کے اندر خاموشی طاری ہو گئی۔ چاروں اس خیمے کی طرف بڑھے جس میں فقیر سوتا تھا۔ پردے گرے ہوئے تھے اور اندر روشنی تھی۔

ان میں سے ایک کی ٹھوکر کسی چیز سے لگی۔ یہ چھوٹا سا مٹکا تھا۔ اس آدمی نے بو سے پہچان لیا کہ اس میں مشعلوں اور دیوں کا تیل ہے۔ اس نے مٹکا اُٹھا لیا۔ دو آدمی فقیر کے خیمے کے پردے کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑے خنجر تھے۔ پردہ ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ فقیر نیم برہنہ تھا اور اس کے پاس ایک نیم برہنہ جوان لڑکی تھی۔ فقیر شراب کے

نشے میں بدمست ہوا جا رہا تھا۔ دونوں آدمیوں نے پردے کی رسی کھینچی اور اندر چلے گئے۔ فقیر اور لڑکی نے ادھر دیکھا مگر اُن کے منہ سے کوئی آواز نکلنے سے پہلے ہی ایک آدمی نے لڑکی کے منہ پر دوسرے نے فقیر کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دونوں کو گرا دیا اور ہاتھ دبائے رکھے۔ لڑکی ایسے تنومند مردوں کے آگے کچھ بھی نہیں تھی اور فقیر کی طاقت شراب نے سلب کر رکھی تھی۔ خنجر دونوں کے دلوں میں اُتر گئے۔ وہ دو وار دل کے مقام پر کیے گئے اور دونوں جلدی ہی ختم ہو گئے۔

ان کے دو ساتھی باہر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس تیل کا چھوٹا سا مٹکا تھا۔ ان کا کام ہو چکا تھا۔ انہیں اب نکل جانا چاہیے تھا لیکن مٹکے والے آدمی نے انتقام سے بے قابو ہو کر فقیر کے خیمے کے اندر اور دوسرے خیموں کے پردوں پر تیل چھڑکنا شروع کر دیا۔ اندر والے اتنی گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ انہیں پتہ نہ چل سکا۔ فقیر کے خیمے کے دیئے سے ایک کپڑے کو آگ لگا کر تمام خیموں کو آگ لگا دی گئی۔ تیل کی وجہ سے خیمے فوراً ہی آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ اندر والوں کی چیخ و پکار بلند ہونے سے پہلے ہی چاروں آدمی گھوڑوں پر سوار ہو کر غائب ہو گئے۔

کاہ کاکی کو جلدی ہی اطلاع دے دی گئی کہ دونوں فقیروں کا کام تمام کر دیا گیا ہے۔ مگر بخارا میں جو دستے مقیم تھے، اُن کا ردِعمل تخریبی تھا۔ وہاں بھی یہی پروپیگنڈہ کیا گیا کہ یہ غزنی والوں کی کارستانی ہے۔ فوج غزنی اور سلطان محمود کے خلاف بھڑک اُٹھی۔

سلطان محمود کو اطلاعیں دو تین دنوں کے وقفے سے ملیں۔ پہلی اطلاع اُسے وہی ملی جو کاہ کاکی کے ملازم نے اسے تفصیل سے سنائی تھی۔ اسی تفصیل سے سلطان محمود کو سنائی گئی۔ دوسری اطلاع یہ ملی کہ کاہ کاکی کے حکم سے دونوں فقیروں کو قتل کر دیا گیا ہے۔

سلطان سوچ ہی رہا تھا کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے کہ جرجانیہ سے کاکی کا بھیجا ہوا ایک اور آدمی غزنی پہنچا۔ اُس نے سلطان محمود کو بتایا کہ ابوالعباس کے صوبہ بخارا کے امیر التگین نے فرنگیوں کی پشت پناہی سے بغاوت کی تیاری مکمل کر لی ہے اور دو سالاروں ابواسحاق اور خمارتاش نے بخارا اور ہزاراسپ کے دستوں کو ابوالعباس

کے خلاف متنفر کر دیا ہے۔ ابوالعباس کی حمایت میں دو، فوج ہے جو اُس کے دارالحکومت جرجانیہ میں ہے مگر ان چند ایک دستوں کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔

سلطان محمود نے اسی وقت ابوالعباس کے نام پیغام لکھوایا جس کے الفاظ مورخوں کے مطابق کچھ اس طرح تھے ــــ "...... میرا خیال ہے کہ آپ اپنے ملک کی اس صورتِ حال کو نہیں سنبھال سکیں گے۔ آپ نوعمر لہٰذا ناتجربہ کار ہیں۔ پیشتر اس کے کہ آپ کا تختہ اُلٹ دیا جائے یا آپ باغیوں کے ہاتھوں قتل ہو جائیں، مجھے آپ کی مدد کو پہنچ جانا چاہیے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ خودمختار اور آزاد رہتے ہوئے سلطنتِ غزنی کی اطاعت قبول کر لیں اور خطبے میں میرا نام شامل کر دیں۔ میں آپ کی آزادی برقرار رکھوں گا۔ اس سے آپ کو یہ فائدہ پہنچے گا کہ آپ کو میری مدد حاصل ہوگی اور میں اپنی فوج کے بہترین دستے آپ کے دارالحکومت میں آپ کی خوارزم شاہی کی حفاظت کے لیے رکھ سکوں گا۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ آپ کو اگر مشورہ لینے کی ضرورت ہو تو اپنے وزیر ابوالحارث سے مشورہ لیجیے گا۔ اگر آپ نے اپنے امیر البتگین اور اپنے سالاروں سے مشورہ لیا تو آپ کو گمراہ کیا جائے گا۔ آپ اس قدر ناتجربہ کار ہیں کہ آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ آپ کے اردگرد کیا ہو رہا ہے اور مجھے سینکڑوں میل دور غزنی میں پتہ چل گیا ہے کہ آپ تنہا رہ گئے ہیں۔ میں اُمید رکھوں گا کہ آپ سوچنے میں زیادہ وقت صرف نہیں کریں گے۔"

مشہور مؤرخ بیہقی نے لکھا ہے کہ خوارزم شاہ ابوالعباس کو جب یہ پیغام ملا تو اُس نے اپنے وزیر اور مشیروں کا اجلاس بلایا جس میں البتگین، سالار ابواسحاق اور سالار خمرطاش بھی تھے۔ ابوالعباس نے سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے کی حمایت کی۔ اُس نے پیغام کسی کو نہ دکھایا۔ اجلاس میں صرف یہ مسئلہ پیش کیا کہ سلطان محمود نے اس کی اطاعت قبول کرنے اور خطبے میں اُس کا نام شامل کرنے کو کہا ہے۔ اجلاس میں سب نے اس کی مخالفت کی۔ بیہقی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس پیغام کی اطلاع فوج کو بھی مل گئی اور فوج نے اس کی مخالفت میں بغاوت کر دی۔ ابوالعباس نے سپاہیوں میں سونے

کے ٹکڑے تقسیم کر کے انہیں ٹھنڈا کیا۔ اجلاس ایک بار پھر بلایا گیا جس میں ابوالعباس نے سب کو بتایا کہ اُس نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر سلطان محمود خوارزم پر حملہ کرے تو ترکستان کے خوانین سے مدد لی جائے۔ لہٰذا ان کے ساتھ دوستی اور تعاون کا معاہدہ کیا جائے اور اسے خفیہ رکھا جائے۔

بیہقی نے ہی لکھا ہے کہ سلطان محمود کو اپنے جاسوسوں سے اطلاع ملی کہ ابوالعباس ترکستان کے ساتھ فوجی نوعیت کا معاہدہ کر رہا ہے۔ سلطان محمودؒ اپنی ایک لاکھ نفری کی فوج اور پانچ سو ہاتھی لے کر خوارزم کی سرحد کے قریب بلخ چلا گیا اور ابوالعباس کو پیغام بھیجا کہ وہ اس کی اطاعت قبول کرے ورنہ اُس کے ملک پر حملہ کر دیا جائے گا۔ ترکستان کے خوانین سلطان محمودؒ کے مقابلے میں ابوالعباس کو فوجی مدد دینے سے گھبرا گئے۔ انہوں نے بلخ آ کر سلطان محمود سے درخواست کی کہ وہ خوارزم پر حملہ نہ کرے۔ سلطان محمودؒ کسی کی سننے والا نہیں تھا۔ نہ مانا اور اس نے اپنا مطالبہ برقرار رکھا۔ ترکستان کے خوانین نے ابوالعباس خوارزم شاہ کو اس پر رضامند کر لیا کہ وہ سلطان کی اطاعت قبول کر لے اور خطبے میں اس کا نام شامل کر لیا جائے۔ سلطان محمودؒ اپنا مطالبہ پورا ہونے پر اپنی فوج واپس لے گیا۔

دوسرے مؤرخین نے جن میں عطبی، ابن الاثیر اور گردیزی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ خیال رہے کہ عطبی جس کا پورا نام ابونصر محمد العطبی تھا، سلطان محمود کے دور کا وقائع نگار تھا اور سلطان محمود نے اُسے کئی بار اپنا سفیر اور ایلچی بنا کر دوسرے ملکوں میں بھیجا تھا۔ اس کی کتاب "کتاب الیمینی" اس کے ذاتی مشاہدات پر لکھی گئی ہے اور محمود غزنوی کے حالات و واقعات پر ایک مستند دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے مطابق ابوالعباس سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے سے ہچکچا گیا تھا کیونکہ اُسے اپنی آزادی سلب ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اُس کے وزیر نے اُسے بتایا تھا کہ سلطان کی اطاعت قبول کرنے میں اتنا خطرہ نہیں جتنا اپنی فوج کی بغاوت میں ہے۔ ابوالعباس سے اطاعت قبول کرنے کا فیصلہ کاہ کاجی نے کرایا تھا۔

"میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ میرا بھائی آپ کی آزادی سلب نہیں کرے گا۔" — کاہی نے اُسے کہا — "وہ آپ کو اپنا اتحادی بنانا اور آپ کو بغاوت سے بچانا چاہتا ہے۔"

"میں سمجھ نہیں سکا کہ کون بغاوت کر رہا ہے" — ابوالعباس نے کہا — "مجھے اپنی فوج پر اعتماد ہے۔"

"مگر فوج میں آپ کا اعتماد ختم کر دیا گیا ہے" — کاہی نے کہا۔

"کس نے ختم کیا ہے؟"

"آپ کے امیر البتگین نے" — کاہی نے کہا — "آپ کے سُسر ابواسحاق نے خمرطاش نے اور ان کے درپردہ فرنگی دوستوں نے۔ آپ کی بادشاہی سلطان محمود کی مدد کے بغیر قائم نہیں رہ سکے گی۔ مجھ سے دھوکے فریب کی توقع نہ رکھو ابوالعباس! اپنی خوش فہمیوں کے دھوکے میں نہ رہو۔ سلطان کی اطاعت قبول کر لو۔"

ابوالعباس نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی اور خطبے میں سلطان محمود کا نام شامل کرنے کا اعلان کر دیا۔

جب یہ شاہی حکم نامہ ہزار اسپ اور بخارا پہنچا تو وہاں جیسے جنگل کو آگ لگ گئی ہو۔ البتگین نے بخارا کی فوج کے چھوٹے بڑے کمانڈروں کو بلا کر انہیں کہا کہ فقیر جس تباہی سے خبردار کرتے رہے ہیں وہ غزنی کی فوج کی صورت میں آ رہی ہے۔ ہم اس تباہی کو روک سکتے ہیں ورنہ ہم سب اور تمہاری مستورات غزنی کی درندہ صفت اور لٹیری فوج کی غلام ہو جائیں گی۔ ہندوستان سے زر و جواہرات لوٹ کر لانے والا سلطان محمود اب خوارزم کو لوٹنے اور یہاں کی بیٹیوں کو لونڈیاں بنا کر غزنی لے جانے آ رہا ہے۔ اُسے خوارزم شاہ ابوالعباس خود بلا رہا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے خوارزم شاہی ختم کر کے فوج کی حکومت قائم کرنی ہے۔ اپنے سپاہیوں سے کہہ دو کہ جو فقیر تمہیں غیب کی باتیں بتانے آئے تھے اور جنہوں نے تمہاری قسمت بدل دینے کا وعدہ کیا تھا، اُن کے قاتل تمہاری قسمت کو تباہ کرنے آ رہے ہیں۔

ہزار اسپ میں ابواسحاق اور خمرطاش نے بھی اپنے دستوں کو اسی طرح بھڑکا

دیا۔

چند دنوں بعد شام کو ابوالعباس اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا کہ ایک قاصد نے آ کر اُسے پیغام دیا کہ ترکستان کے چار خوانین آئے ہیں۔ اُن کے ساتھ امیر البتگین بھی ہے۔ انہوں نے چشمے والے باغ میں قیام کرنا پسند کیا ہے۔ امیر البتگین نے اُن کی عزت افزائی کے لیے مشورہ بھیجا ہے کہ خوارزم شاہ یہاں آ کر ان کا استقبال کریں۔

ابوالعباس نے سواری تیار کرنے کا حکم دیا۔ کاہ کاہی کو پتہ چلا کہ ابوالعباس کہیں جا رہا ہے تو دوڑی آئی اور پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ ابوالعباس نے اُسے بتا دیا۔ کاہی نے اُسے جانے سے روکا۔

"ترکستان کے مہمان آئے ہیں" — اُس نے کاہی سے کہا — "میں ان کی عزت کرنا چاہتا ہوں۔ البتگین اُن کے ساتھ آیا ہے۔"

"نہ جاؤ" — کاہی نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ "البتگین نے قاصد کیوں بھیجا ہے، خود کیوں نہیں آیا؟"

"تم گھبرا کیوں گئی ہو کاہی؟"

"خدا کے لیے نہ جاؤ ابوالعباس! میرا دل ڈوب رہا ہے۔" کاہی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "میں نے تمہیں جانے سے کبھی نہیں روکا۔ نہ جاؤ۔ مصروفیت کا بہانہ کر دو۔"

"کیا میں عورت ہوں؟"

"آج ایک عورت کی بات مان جاؤ" — کاہی کے آنسو نکل آئے — "نہ جاؤ۔ مجھے کوئی خطرہ نظر آ رہا ہے۔"

ابوالعباس نے ہنس کر کہا — "محبت میں اتنا وہمی اور جذباتی نہیں ہونا چاہیئے۔ مجھے میری حیثیت سے نہ گراؤ کاہی! وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

کاہ کاہی بہت ہی جذباتی ہو گئی تھی، یہاں تک کہ ابوالعباس باہر نکلا تو وہ اُس کے پیچھے دوڑی مگر ابوالعباس کی بگھی محافظوں کے جلو میں جا چکی تھی۔ کاہی کی جذباتی حالت ایسی کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اُس کا ملازم اور خادمہ اُسے بہلانے لگے لیکن اس کی گھبراہٹ

اور بے چینی بڑھتی گئی۔

زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ محل کے ارد گرد بہت سے گھوڑے دوڑنے کی آوازیں اور نعرے سنائی دینے لگے۔ کاہجی اس امید پر دوڑتی باہر گئی کہ ابوالعباس آ گیا ہے مگر یہ فوجی سوار تھے جو محل کو گھیرے میں لے رہے تھے اور وہ نعرے لگا رہے تھے۔ "زن مرید خوارزم شاہ کو ختم کر دیا گیا ہے.... غزنی کا غلام جہنم واصل ہو گیا.... خوارزم شاہ الپتگین زندہ باد"۔

کاہ کاہجی کا دماغ چکرا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ذرا سی دیر میں محل میں اودھم بپا ہو گیا۔ سب سے پہلے ابوالعباس کے وزیر ابوالحارث کو قتل کیا گیا۔ مشیروں کو باہر نکال کر ان کے سر تن سے جدا کر دیئے گئے۔ محل کے اندر اور باہر ہزار اسپ اور بخارا کے فوجی دستے پھیل گئے۔ الپتگین کے حکم سے لوٹ مار نہ ہوئی۔ ابوالعباس کے حامیوں کو پکڑا جا رہا تھا اور انہیں باہر لے جا کر قتل کیا جا رہا تھا۔ جرجانیہ میں جو دستے تھے، ان میں سے دو نے مزاحمت کی کوشش کی، لیکن اُن کی نفری اتنی تھوڑی تھی کہ ان سے فوراً ہی ہتھیار ڈلوا لیئے گئے۔ انہیں مزاحمت کا حکم دینے والے ایک نائب سالار اور اُس کے ماتحت کمانداروں کو قتل کر دیا گیا۔

الپتگین نے خوارزم شاہ کی حیثیت سے قصرِ شاہی میں داخل ہوا۔ وہ خود ساختہ بادشاہ تھا۔ اُس نے حکم دیا کہ تمام ملک میں اُس کی خوارزم شاہی اور ابوالعباس کی موت کا اعلان کر دیا جائے۔

ابوالعباس کو اس دھوکے سے باہر بلا کر کہ ترکستان کے خوانین آئے ہیں، قتل کر دیا گیا تھا۔ بغاوت بہت جلدی کامیاب ہو گئی۔ بیہقی اور گردیزی کے مطابق یہ واقعہ ۱۵ شوال ۴۰۷ھ (۱۷ مارچ ۱۰۱۷ء) کا ہے۔ فوج محل کی حدود میں داخل ہوئی تو کاہ کاہجی کے خاص ملازم نے جو دراصل غزنی کا جاسوس تھا، اس کو خطرے میں دیکھا اور دوڑتا ہوا اُس کے کمرے میں گیا۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی — "میں نے اُسے روکا تھا۔ اُسے موت لے گئی تھی"۔ ملازم نے اُسے تسلی دی، اور اُسے وہاں سے نکال لے جانے کی پوری کوشش کرے گا۔

کاہ کاہجی نے اپنا شاہانہ لباس اتار کر بالکل سادہ کپڑے پہن لیے اور سر پر اوڑھنی لے لی۔ ملازم نے اُسے اس لباس میں دیکھ کر کہا کہ وہ اسے ابھی نکال لے جائے گا، مگر وہ کمرے کے دروازے میں ہی پہنچے تھے کہ باغی سالار ابواسحاق کی بیٹی اگوری آ گئی۔ وہ ابوالعباس کی دوسری بیوی تھی۔

"تمہاری خوارزم شاہی ختم ہو چکی ہے کاہجی!" — اگوری نے طنزیہ کہا — "بھاگ کے کہاں جا رہی ہو! باہر نکلو گی تو قتل ہو جاؤ گی یا تمہیں فوجی گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ اب حکومت تمہاری نہیں فوج کی ہے۔ میں تمہاری حفاظت کا انتظام کر دیتی ہوں۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں حرم میں داخل کر دوں گی۔ وہاں تمہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ اگر چاہو تو میرے باپ کے ساتھ شادی کر لو۔ تم غزنی نہیں جا سکو گی"۔

"اگوری!" — کاہجی نے بے خوف آواز میں کہا — "مجھے غزنی جانے کی کوئی جلدی نہیں۔ غزنی والے یہاں آ جائیں گے" — وہ اچانک گرج کر بولی — "نکل جاؤ یہاں سے.... میں اب بھی شہزادی ہوں۔ سلطان غزنی کی بہن ہوں، اور تم کس باپ کی بیٹی ہو؟.... نمک حرام سالار کی جسے بادشاہی کی ہوس نے اپنے انجام سے بے خبر کر دیا ہے۔ جاؤ، انہیں کہو مجھے قتل کر دیں۔ مجھے قید میں ڈال دیں، پھر اپنا، اپنے باپ کا اور خود ساختہ خوارزم شاہ کا انجام دیکھ لینا"۔

اگوری ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ لیے باہر نکل گئی۔ ملازم نے کاہ کاہجی سے کہا کہ آؤ، یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔

"نہیں حبیس!" — کاہجی نے کہا — "میں فرار نہیں ہوں گی۔ میں اس فریب کار خوارزم شاہ کا سامنا کرنا چاہتی ہوں" — وہ اُدھر کو چل پڑی تو حبیس کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر وہ رک گئی اور بولی — "مجھے خدا کے سپرد کرو۔ تم معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ کوئی غزنی اطلاع دینے چلا گیا ہے یا نہیں۔ اگر کچھ پتہ نہ چلے تو تم چلے جاؤ۔ اصطبل سے گھوڑا لے لو"۔

التگین اُسی تخت نما مسند پر بیٹھا احکام دے رہا تھا جس پر تھوڑی دیر پہلے تک ابوالعباس بیٹھا رہا تھا۔ دربار میں کچھ لوگ دست بستہ کھڑے احکام سُن رہے تھے۔ سب فوجی تھے۔ شہری انتظامیہ کا کوئی ایک بھی آدمی نہیں تھا۔ وزیر ابوالحارث بھی نہیں تھا۔ دربار میں شور سا تھا۔ سب پر سناٹا طاری ہو گیا۔ التگین نے دیکھا۔ کاہ کابی اُس کی طرف آ رہی تھی۔

"اوہ! کاہ کابی!" — التگین نے زیرِ لب کہا — "اس کے متعلق تو میں نے کچھ سوچا ہی نہیں" — اُس نے کابی سے مخاطب ہو کر کہا — "کاہ کابی! میں جانتا ہوں تم جان بخشی کے لیے آئی ہو۔ تمہیں شاید احساس نہیں کہ اپنے خاوند کو تم نے مروایا ہے۔ تم نے اُس پر جادو طاری کر کے اُسے غزنی کا غلام بنایا تھا۔ خوارزم کے لوگ اور خوارزم کی فوج کسی غیر ملکی کی غلامی برداشت نہیں کر سکتی۔ قوم اور فوج مجھے گھسیٹ کر اِس مسند پر لائی ہے۔ میں اب اُنہی کے کہنے پر اس مسند سے اُٹھوں گا۔ قوم نے مجھے جو فرض سونپا ہے وہ مجھے ہر قیمت پر پورا کرنا ہے۔"

"میں جان بخشی کے لیے نہیں جان دینے کے لیے آئی ہوں" — کاہ کابی نے کہا — "میں نے جو کچھ کیا وہ اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا۔ تم نے خود بھی قرآنِ پاک کی توہین کی ہے اور فرنگیوں سے بھی کرائی ہے۔ خدا تمہیں بخشے گا نہیں۔ اپنے گناہ کو چھپانے کے لیے تم یہ جھوٹ بول رہے ہو کہ تمہیں قوم اور فوج گھسیٹ کر لائی ہے۔ اگر تم قوم کے اتنے ہی محبوب اور خدا کے اتنے ہی برگزیدہ آدمی ہو تو تم نے گلی گلی میں اور شہر پناہ کے ہر دروازے پر پہرے کیوں کھڑے کر دیئے ہیں؟ انہیں باہر کیوں نہیں آنے دیتے؟ شہر میں خاموشی کیوں ہے؟ قوم تمہارے نام کے نعرے کیوں نہیں لگاتی؟ ہر طرف فوج ہی کیوں نظر آ رہی ہے؟"

کسی درباری کی آواز گرجی — "تمیز سے بات کرو نادان! تم خوارزم شاہ سے مخاطب ہو۔"

"میرا خاوند مارا گیا ہے" — کابی کہتی چلی گئی — "خدا تو نہیں مارا گیا۔ اگر تم یہ

اُمید لے کر آئے ہو کہ فوج کے چھاتے کے نیچے بیٹھ کر خوارزم سے ہٹ نہ ہو گے تو میں تمہیں خبردار کرتی ہوں کہ وہ طوفان جلدی آئے گا جو تمہارے اس چھاتے کو اُڑا لے جائے گا۔ اس مسند پر وہی بیٹھ سکتا ہے جو اس کا اہل ہو۔ تم مامونی خاندان کے جوتے چاٹ چاٹ کر امارت کے رُتبے تک پہنچے تھے۔ اب تمہاری قسمت میں قید خانے کا تہہ خانہ لکھ دیا گیا ہے۔"

"لے جاؤ اسے" — التگین نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا — "اسے اسی کے کمرے میں رکھو اور باہر پہرہ کھڑا کر دو۔ اِسے اُسی کمرے میں جس میں اس نے پورا ایک سال ازدواجی زندگی کی راتیں گزاری ہیں، نظر بند کر دو۔ میں سلطان محمود کو پیغام بھیجوں گا کہ اگر تم نے خوارزم پر حملہ کیا تو تمہیں اپنی بہن کی چھوڑی ہوئی لاش ملے گی۔ اسے ہر حال میں رکھو لیکن اسے تکلیف نہ ہو۔ میں یہ نہیں کہلوانا چاہتا کہ خوارزم شاہ التگین نے ایک بےبس عورت پر ظلم کیا تھا۔"

"آنے والی نسلیں تمہاری قبر پر بھی لعنت بھیجا کریں گی" — کابی نے کہا — "جس فوج کو کفر کے خلاف حق کے معرکے لڑنے تھے اُس سے تم نے اپنے ہی ملک کو فتح کر لیا ہے اور اس فوج کو تم نے حکمران بنا دیا ہے۔ یہ فوج ایک دن بھی لڑنے کے قابل نہیں رہے گی۔"

کسی نے کاہ کابی کو بازو سے پکڑا اور اُسے اُس کے کمرے میں لے گئے۔

اُس وقت کے ایک مشہور مؤرخ اور مبصر الفضلی نے اپنی کتاب "آثار الوزرا" میں لکھا ہے — "چار ماہ تک التگین خوارزم کا انتہائی ظالم ڈکٹیٹر بنا رہا۔ تمام تر خوارزم پر اُس نے وحشت طاری کیے رکھی۔ اپنے آپ کو اسلام کا علمبردار اور پاسبان کہتا رہا لیکن جس کے منہ سے ذرا سی بھی مخالفانہ بات نکل جاتی تھی، اُسے قتل کرا دیتا تھا۔ فوج گلیوں میں گھومتی پھرتی رہتی۔ مخبر لوگوں کی باتیں سنتے رہتے۔ شک پر بھی لوگوں کو پکڑ کر قید میں ڈال دیا جاتا یا جلاد کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ اشیائے خورد و نوش اور آسودہ زندگی صرف فوج کے لیے رہ گئی تھی۔"

یہ چار مہینے سلطان محمود کیا کرتا رہا؟ ۔ اسے اس کامیاب بغاوت کی اطلاع آٹھویں روز مل گئی تھی۔ اس کے سامنے دو مسئلے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اتنی زیادہ فوج اور رسد سے حملہ کرنا چاہتا تھا کہ پورے خوارزم کو ایک ہی ہلے میں لے لے۔ کشمیر کی شکست کے زخم ابھی پوری طرح مٹے نہیں تھے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی بہن کو فرار کرانا چاہتا تھا۔ "آثارالوزراء" میں لکھا ہے کہ اس نے اپنی بہن کا مسئلہ اپنی مشاورتی کونسل کے سامنے رکھا۔ سب مشیر اور سالار بھڑکے ہوئے تھے۔

"میرا سینہ انتقام کی آگ سے جل رہا ہے" ۔۔۔ سلطان محمود نے مشاورتی کونسل سے کہا ۔۔۔ "میرا بہنوئی قتل ہو گیا اور میری بہن بیوہ ہو گئی ہے۔ اگر میں نے انتقامی کارروائی کا فیصلہ خود کیا تو یہ میری ذاتی رنجش کا ردعمل ہوگا۔ تاریخ یہ کہے گی کہ میں نے ذاتی انتقام لینے کی خاطر دو مسلمان فوجوں کا خون بہا دیا ہے۔ آپ صورتِ حال سامنے رکھ کر مجھے مشورہ دیں۔ یہ بغاوت فرنگیوں نے کرائی ہے اور ایک اسلامی ملک کو تباہی کے راستے پر ڈال دیا ہے۔ کچھ عرصے بعد خوارزم پر فرنگی چھا جائیں گے اور آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے نتائج غزنی کے لیے اور اسلام کے لیے کیا ہوں گے۔"

"کاہ کاہکی غزنی کی آبرو ہے" ۔۔۔ وزیر نے کہا ۔۔۔ "اسے وہاں سے نکالنا ہم سب کے لیے ضروری ہے۔ اگر ہم نے حملہ کیا تو کاہکی قتل ہو جائے گی اور اس کے ساتھ نہ معلوم کیا سلوک ہو۔ الپتگین کو پیغام بھیجا جائے کہ وہ کاہ کاہکی کو باعزت طریقے سے واپس کر دے۔ اگر یہ نہ کرے تو چھاپہ ماروں کے ذریعے اسے فرار کرایا جائے اور اس کے بعد خوارزم پر فوج کشی کی جائے۔"

سب نے اس کی تائید کی۔ کچھ اور مشورے پیش ہوئے۔ پھر ایک پلان تیار ہو گیا۔ ایک ایلچی کو اس پیغام کے ساتھ جرجانیہ بھیج دیا گیا کہ کاہ کاہکی کو باعزت طور پر رہا کیا جائے۔

غزنی اور جرجانیہ کے درمیان سات سو میل کا فاصلہ تھا جس میں آدھا علاقہ پہاڑی

تھا اور باقی ریگستان جو صحرائے غز کہلاتا ہے۔ قاصد کو جاتے اور واپس آتے ایک مہینہ لگ گیا۔ وہ کاہکی کی رہائی کے پیغام کا یہ جواب لایا کہ الپتگین کو خوارزم شاہ تسلیم کیا جائے اور اس کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا جائے۔

الپتگین نے ایلچی کو وہ کمرہ دکھایا تھا جس میں کاہ کاہکی کو رکھا گیا تھا۔ اس کے حکم پر دروازہ کھول کر اسے دکھایا گیا تھا کہ کاہکی کو قید خانے میں نہیں بلکہ اس کے اپنے کمرے میں رکھا ہوا ہے۔ یہ اطلاع ان چھاپہ ماروں کے کام آئی جنہیں یہ خطرناک کام سونپا گیا کہ وہ کاہکی کو وہاں سے فرار کرائیں۔ کاہکی کا ملازم جبیس غزنی آ گیا تھا۔ وہ اس کمرے اور اس کے گردوپیش سے اچھی طرح واقف تھا۔ چار چھاپہ ماروں کو منتخب کیا گیا۔ پانچواں جبیس تھا۔

پانچوں غیرمعمولی رفتار سے جرجانیہ پہنچ گئے۔ ان کے پاس ایک گھوڑا فالتو تھا۔ انہوں نے ایک سرائے میں قیام کیا۔ ان میں سے ایک کو جبیس نے ساتھ لیا اور اسے محل کے باہر تک لے گیا۔ شہر میں انہوں نے فوجیوں کو گھومتے پھرتے دیکھا۔ اس سے اگلے روز وہ سرائے سے نکلے تو انہوں نے خوارزم کی فوج کا لباس پہن رکھا تھا اور ان کے ہاتھوں میں جو نیزے تھے ان پر خوارزم کے جھنڈے کے رنگوں والے کپڑے کی جھنڈیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ وہاں کے سوار دستوں کا امتیازی نشان تھا۔ وہ رسالے کے سواروں کی طرح گردنیں تانے اور سینے پھلائے ہوئے جا رہے تھے۔ گھوڑوں کی چال بتاتی تھی کہ یہ فوج کے سدھائے ہوئے گھوڑے ہیں۔ شہر میں انہیں کئی جگہ فوجی ملے جن میں بعض سوار بھی تھے۔ ان پانچوں نے انہیں مسکرا کر انہی کی زبان اور انہی کے لہجے میں سلام کیا۔ شہری فوج سے اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ انہیں دیکھ کر پرے ہٹ جاتے اور سلام کرتے تھے۔ وہ خوارزم کی فوج کا لباس اور نیزوں کی جھنڈیاں اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کے گھوڑے فوج کے تھے۔ وہ خود بھی فوجی تھے اس لیے انہیں اداکاری نہ کرنی پڑی۔

جبیس کی راہنمائی میں وہ محل کے صدر دروازے تک پہنچے۔ وہ بہت بڑا خطرہ مول لے رہے تھے۔ پکڑے جانے کی صورت میں انہیں معلوم تھا انہیں کیسی سزا

ملے گی ۔۔۔ وہ خود اعتمادی سے دروازے میں داخل ہو گئے ۔ وہاں کے پہرہ داروں نے انہیں اپنی فوج کے سوار سمجھتے ہوئے نہ روکا ۔ جبیس انہیں ایک راستے سے اُدھر لے گیا جہاں کاہ کاہی کا کمرہ تھا ۔ محل کی اندرونی دنیا میں بھی کئی جگہ فوجی نظر آئے ۔ وہ اللہ کا نام لیتے بڑھتے گئے ۔

جبیس نے ایک جگہ اپنے ساتھیوں کو روک لیا اور ایک سوار اور فالتو گھوڑے کے ساتھ محل کے کسی حصے میں غائب ہو گیا ۔ وہ دونوں گھوڑوں سے اُترے اور کاہ کاہی کے کمرے والی غلام گردش میں چلے گئے ۔ آگے سنتری کھڑا تھا ۔ یہ کاہ کاہی کا کمرہ تھا ۔ جبیس نے سنتری سے کہا دروازہ کھولو ۔ خاتون کو خوارزم شاہ الپتگین کا پیغام دینا ہے ۔ سنتری نے دروازہ کھول دیا ۔ دونوں سنتری کو دھکیل کر اندر لے گئے اور تلواروں کی نوکیں اُس کے پہلو سے لگا کر اُس کی وردی اُتروائی ، پھر اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اُس کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ دیئے ۔ کاہ کاہی سے کہا کہ وہ فوراً یہ وردی پہن لے ۔

وہ جب باہر نکلے تو کاہی وردی میں ملبوس تھی ۔ چھاپہ ماروں نے دروازہ بند کر کے چٹخنی چڑھا دی اور گھوڑوں پر سوار ہو گئے ۔ فالتو گھوڑا کاہی کے لیے لے جایا گیا تھا ۔ وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملے اور فوجی شان سے فوجی ترتیب میں محل کے صدر دروازے سے بھی نکل گئے ۔ شہر سے گذرتے اُن کی چال دبی رہی ۔ وہ اُسی باوقار چال سے شہر سے بھی نکل گئے ۔ شہر جب درختوں کی اوٹ میں ہو گیا تو انہوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی ۔ کاہ کاہی گھوڑ سواری کی ماہر تھی ۔ اُس نے چھاپہ ماروں کو احساس نہ ہونے دیا کہ وہ عورت ہے اور مردوں کی طرح اتنا لمبا اور اتنا کٹھن سفر نہیں کر سکے گی ۔

سلطان محمود فوج کی کمی بہت حد تک پوری کر چکا تھا ۔ اماموں سے مسجدوں میں کچھ عرصے سے اعلان کرائے جا رہے تھے کہ فوج کی کمی پوری کرنے کے لیے رضا کاروں کی ضرورت ہے ۔ چنانچہ ہزارہا رضا کار فوج میں آ گئے ۔ وہ اپنے گھوڑے

یا اونٹ ساتھ لائے تھے ۔ جو خود نہ آ سکے انہوں نے اپنے گھوڑے دے دیئے ۔ اُس نے جب کوچ کا حکم دیا اُس وقت اُس کی فوج کی تعداد (مورخ بیہقی کے مطابق) ایک لاکھ (سوار اور پیادہ) تھی اور پانچ سو ہاتھی تھے ۔

وہ فوج کو بلخ لے گیا ۔ اس سے آگے بڑا ہی وسیع و عریض صحرا تھا ۔ سلطان نے صحرا سے پہلے کا یہ اہتمام کر رکھا تھا کہ بیس ہزار بڑی کشتیاں تیار کر کے ترمز کے مقام پر دریا کے کنارے رکھ دی تھیں ۔ دریائے اوکسس کا رُخ خوارزم کی طرف تھا ۔ سلطان کی فوج ، گھوڑے ، ہاتھی ، اونٹ وغیرہ کشتیوں میں سوار ہو گئے ۔ سامان بھی لاد دیا گیا ۔ یہ بیڑہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ روانہ ہو گیا ۔ یہ کشتیوں کا سب سے بڑا بیڑہ تھا جو کسی بادشاہ نے کبھی دریا میں ڈالا ہو ۔

یہ بیڑہ ہزار اسپ سے آگے نکل گیا اور خوارزم کے دارالحکومت جرجانیہ سے تھوڑی دور جا رکا ۔ تمام فوج کشتیوں سے اُتر آئی اور عارضی طور پر خیمہ زن ہو گئی ۔ مورخین نے لکھا ہے کہ الپتگین کو جب سلطان محمود کی آمد اور اس کی جنگی طاقت کی اطلاع ملی تو اُس نے سلطان کے پاس اپنے ایلچی صلح نامے کی شرائط کے ساتھ بھیجے مگر سلطان محمود نے صلح کی جو شرائط بتائیں وہ اتنی سخت تھیں کہ الپتگین ڈر گیا ، گھبرا گیا ۔ اُس نے خوارزم کی تمام تر فوج اکٹھی کی تو اس کی تعداد پچاس ہزار تھی ۔ اُس نے تین چار بڑے ہی قابل اور تجربہ کار سالاروں کو صرف اس لیے مروا دیا تھا کہ وہ ابوالعباس کے حامی تھے ۔ کچھ فوجی مشیر بھی اس کے ہاتھوں مارے گئے تھے ۔

جنگ کی ابتدا سلطان محمود کے لیے نقصان دہ اور بہت بری ہوئی ۔ اُس کی فوج کے ہراول دستے اس کے مشہور اور بڑے ہی تجربہ کار سالار ابوعبداللہ محمد الطائی کی زیرِ کمان فوج کے بڑے کیمپ سے دور آگے خیمہ زن تھے ۔ صبح کی نماز کا وقت تھا اور تمام تر نفری باجماعت نماز پڑھ رہی تھی ۔ خوارزم کے سالار خمر طاش کے دستے قریب ہی تیار کھڑے تھے ۔ شاید خمر طاش کو معلوم تھا کہ سلطان محمود کے حکم کے مطابق خیمہ گاہ میں فوج باجماعت نماز پڑھا کرتی ہے ۔ اُس نے یہی موقع موزوں سمجھا اور سوار دستوں سے حملہ کر دیا ۔

ابو عبداللہ محمد الطائی جس کا تاریخوں میں احترام اور اہمیت سے ذکر آیا ہے، انتہائی مشکل حالات میں معرکے لڑنے اور جیتنے والا سالار تھا۔ میدانِ جنگ میں جنگی چالوں اور اعلیٰ قیادت کے لحاظ سے سلطان محمود کا ہم پلہ تھا مگر اُس پر نماز کی حالت میں حملہ ہُوا۔ دستے نہتے تھے اور ایک جگہ جمع تھے۔ انہیں ہتھیار اُٹھانے کی مہلت نہ ملی اور سلطان محمود کی فوج کے بہترین دستے مارے گئے۔ سالار الطائی اپنے چند ایک کمانداروں اور سپاہیوں کے ساتھ بچ نکلا۔

سلطان محمود کو اطلاع ملی تو اُس نے قلب کے باڈی گارڈز کو خمرطاش کے دستوں کے تعاقب میں بھیج دیا۔ اطلاع یہ ملی تھی کہ خمرطاش، محمد الطائی کے دستوں کو کچلتا ہُوا نکل گیا ہے۔ باڈی گارڈز کا دستہ فوج کے چنے ہوئے سپاہیوں کا دستہ تھا۔ گھوڑے بھی چنے ہُوئے تھے۔ خمرطاش دور نہیں گیا تھا۔ اُس کے اور اُس کے دستوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ وہ پہلے حملے کی کامیابی پر خوش ہو رہے تھے اور ذرا آرام کے لیے رُک گئے تھے۔

یہ ریگستان تھا۔ انہیں گرد کے بادل اُٹھتے دکھائی دیئے۔ خمرطاش نے گرد سے اندازہ لگایا کہ غزنی کے بہت سے دستے جوابی حملے کے لیے آ رہے ہیں۔ اُس نے حملہ روکنے کی تیاری کا حکم دیا۔ سوار گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ سلطان کے باڈی گارڈ کا دستہ گھیرے میں لینے کی ترتیب میں ہو گیا۔ خمرطاش کے سواروں نے گھیرے سے نکلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ دوڑتے گھوڑوں کی اڑائی ہُوئی گرد سے انہیں سلطان محمود کے حملہ آور دستوں کی صحیح نفری کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر لڑنے کی بجائے پیچھے ہٹنے اور نکل بھاگنے کے لیے لڑ رہے تھے۔

اس معرکے کا فیصلہ بہت جلدی ہو گیا۔ خمرطاش پکڑا گیا اور اس کے دستے کو بہت بُری شکست ہُوئی۔

سلطان محمود نے رات کو اپنی فوج کو نئے سرے سے منظم کیا۔ فوج کے ایک حصے کو دریا کے کنارے بھیج دیا۔ اس حصے کو وہاں حکم کا انتظار کرنا تھا۔ حکم ملتے ہی انہیں

کشتیوں پر سوار ہو کر جُرجانیہ کی سمت چلے جانا اور جُرجانیہ کے قریب جا کر کشتیوں سے نکل کر شہر پر حملہ کرنا تھا۔ دوسرے دن سلطان محمود نے کوئی حرکت نہ کی۔ وہ تاثر یہ دینا چاہتا تھا کہ وہ ابھی حملے کے لیے تیار نہیں۔ التگین فنِ حرب و ضرب میں اناڑی تھا۔ اُس کا ایک سالار خمرطاش قید ہو چکا تھا۔ سالار ابواسحاق کو اُس نے دریا کے قریب کہیں ریزرو میں رکھا تھا۔ دوسرے قابل سالاروں اور نائب سالاروں کو وہ قتل کرا چکا تھا۔

وہ سلطان محمود کی چال نہ سمجھ سکا، نہ اُس نے سلطان کی فوج کی تقسیم دیکھی۔ اُس نے اپنے دشمن کی ترتیب اور تنظیم کا بھی جائزہ نہ لیا اور اس خوش فہمی میں حملہ کر دیا کہ غزنی کی فوج ابھی خیموں میں ہے۔ یہ صفر ۴۰۸ھ (۳ جولائی ۱۰۱۷ء) کا دن تھا۔ آثارالوزراء میں الفضل نے اس معرکے کی جو تفصیل لکھی ہے، اس کے مطابق التگین نے اپنی فوج کی قیادت خود کی۔ وہ سب سے آگے تھا۔ اُس نے دائیں بائیں کا خیال رکھے بغیر سامنے سے حملہ کیا۔

اُس وقت کی دیگر تحریروں کے مطابق التگین کے سپاہیوں نے بے جگری کے مظاہرے کیے اور بڑی بہادری سے لڑے۔ وہ غزنی کے خلاف نعرے لگا رہے تھے اور انہیں خدا کے بھیجے ہوئے اور غیب کی خبریں دینے والے فقیروں کا قاتل کہہ رہے تھے۔ ان کے دلوں میں سلطان محمود اور غزنی کی فوج کے خلاف بڑی کاوش سے نفرت پیدا کی گئی تھی۔ وہ نفرت میدانِ جنگ میں بے پناہ قوت بن گئی تھی۔ اگر فتح صرف بہادری سے لڑنے اور قہر و غضب سے کشت و خون کرنے سے حاصل ہو سکتی تو فتح التگین کی تھی، لیکن چالیں سلطان محمود کی نمہ تھیں۔

ایک تو سلطان نے گھوڑے سے اُتر کر دو رکعت نفل پڑھے اور خدا سے مدد مانگی، دوسرے اُس نے التگین کے دائیں پہلو پر ہاتھیوں سے حملے کا حکم دیا۔ ابھی تک ہاتھی میدانِ جنگ میں نظر نہیں آئے تھے۔ ہاتھی پہلو سے آئے۔ تمام ہاتھی چنگھاڑ رہے تھے۔ خوارزم کی فوج کبھی ہاتھیوں کے خلاف نہیں لڑی تھی۔ سپاہی گھبرا گئے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ہاتھی جتنا ہیبت ناک لگتا ہے، اتنا ہی کمزوریوں کا حامل ہے۔ ہاتھیوں

کے دائیں اور بائیں پیادہ دستے اور پیچھے گھوڑسوار تھے۔ ہاتھی دوڑے آرہے تھے
اور زمین مل رہی تھی۔ التگین نے اپنی فوج کو جوش دلایا مگر سپاہی بکھر گئے۔
دو ہاتھی قلب میں جا پہنچے جہاں التگین تھا۔ قلب نے بہت مقابلہ کیا مگر التگین
کے باڈی گارڈ دل چھوڑ گئے۔ شام تک معرکے کا فیصلہ ہو گیا۔ التگین بھاگ نکلا لیکن
اُسے پکڑ لیا گیا۔

جُرجانیہ دارالحکومت تھا۔ اس پر قبضہ لازمی تھا۔ سلطان محمود نے فوج کے اُس
حصے کو جسے اُس نے دریا کے کنارے بھیج رکھا تھا، کشتیوں میں سوار ہو کر جُرجانیہ کی
طرف جانے کا حکم بھیج دیا۔ یہ فوج جن کشتیوں میں سوار ہوئی اس کی تعداد کم و بیش چار
ہزار تھی۔ کشتیاں جب جُرجانیہ کے قریب پہنچیں تو سامنے سے تقریباً تین ہزار کشتیاں
آرہی تھیں۔ صبح طلوع ہو رہی تھی۔ یہ التگین کے سالار ابواسحاق کی فوج تھی جسے
التگین نے ریزرو میں رکھا ہوا تھا مگر اُسے آگے بلانے کی مہلت نہ ملی۔ ابواسحاق
نے اپنے طور پر دیکھ لیا تھا کہ غزنی کی کچھ فوج دریا کے کنارے حکم کا انتظار کر رہی ہے۔
وہ اس چال کو سمجھ گیا۔ اُس نے اپنی فوج کو کشتیوں میں سوار کیا اور جُرجانیہ سے
آگے آگیا۔

سلطان محمود کی کشتیاں آگے بڑھیں تو دیکھا کہ دشمن دریائی جنگ کے لیے تیار
ہے۔ دونوں فوجیں دریا میں ٹکرا گئیں۔ کشتیاں قریب کر کے سپاہی ایک دوسرے
کی کشتیوں میں کود کر دست بدست معرکہ لڑ رہے تھے۔ کشتیاں ایک دوسری سے ٹکرا
رہی تھیں۔ اُلٹ بھی رہی تھیں۔ دریا سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

سلطان محمود کو تیز رفتار قاصد نے اطلاع دی کہ دریا میں لڑائی ہو رہی ہے۔
فاصلہ میلوں کا تھا۔ پیادہ دستے اتنی جلدی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ سلطان نے گھوڑ
سوار اور شتر سوار دستوں کو بھیج دیا اور خود اُن کے پیچھے گیا۔ یہ دستے جب دریا کے
کنارے پہنچے تو دریا میں دُور دُور تک دونوں فریقوں کی کشتیاں ایک دوسری میں گڈمڈ
تھیں۔ شتر سواروں نے دریا کے کنارے سے کشتیاں پہچان پہچان کر تیر چلائے۔
بعض گھوڑسواروں نے یہاں تک شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ گھوڑے دریا میں ڈال

دیئے لیکن زیادہ گہرے پانی میں نہ گئے۔ سلطان محمود نے آکر صورتِ حال دیکھی تو
اُس نے گھوڑسواروں کو دریا سے نکل آنے کا حکم دیا۔

اُس وقت کے ایک وقائع نگار ابن اسفندیار نے لکھا ہے کہ دارالحکومت جُرجانیہ
کے لوگ چار مہینوں میں ہی التگین کی فوجی حکومت سے اس قدر بدحال ہو گئے تھے
کہ ہر کسی پر گرفتاری کا خوف طاری رہتا تھا۔ بدنظمی ایسی کہ عدل و انصاف ناپید ہو گیا۔
سپاہی کی بات حکم کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان لوگوں کو پتہ چلا کہ دریا میں غزنی اور خوارزم
کی فوج کی لڑائی ہو رہی ہے اور پھر صحرا کی لڑائی سے بھاگے ہوئے سپاہیوں سے پتہ
چلا کہ التگین اور خمرطاش پکڑے گئے ہیں تو شہر کے لوگ نیزے، بھالے، تلواریں، اور
جو ہتھیار ہاتھ لگا اُٹھا کر گھروں سے نکل آئے اور اُس فوج پر ٹوٹ پڑے جو شہر اور
محل کے دفاع کے لیے وہاں موجود تھی۔

دریا کی یہ سب سے بڑی لڑائی سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے اس طرح
ختم ہوئی کہ خوارزم کے سالار ابواسحاق کو جو دریا کے کنارے پر کہیں اپنے دستوں کو
احکام دے رہا تھا، شہر کے لوگوں کی بغاوت کی اطلاع ملی تو وہاں سے فرار ہو گیا۔
بعد میں اس کے اپنے سپاہیوں نے اُسے پکڑ کر غزنی کی فوج کے حوالے کر دیا تھا۔ لوگ
فوج کے خلاف اس قدر بھڑکے ہوئے تھے کہ ان میں سے بعض دریا پر جا پہنچے اور
غزنی کی فوج کی مدد کی۔

سب سے زیادہ بھڑکا ہوا تو سلطان محمود تھا۔ ابنِ اسفندیار اور بیہقی لکھتے
ہیں کہ سلطان دریا کے کنارے گھوڑا دوڑاتا اور تیراندازوں کو احکام دیتا تھا۔ اُس کے
منہ سے جھاگ پھوٹ رہی تھی۔ رات بھر غزنی کی فوج قیدیوں کو پکڑتی اور اپنی لاشوں
اور زخمیوں کو سنبھالتی رہی۔ سلطان بھی رات بھر جاگتا رہا۔ اُس کے پاس خوارزم
کے ایسے شہری اور فوجی حکام آگئے تھے جنہوں نے اُن افراد کی نشاندہی کی جو ابوالعباس
کے قتل میں شامل تھے اور جنہوں نے اُس کا تختہ اُلٹنے میں کوئی نہ کوئی کردار ادا
کیا تھا۔ رات سے ہی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔

اگلے روز التگین، سالار ابو اسحاق اور سالار خمرطاش کو سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس دور کے تین مبصروں اور تاریخ نویسوں — بیہقی، عطبی اور گردیزی نے اُن سزاؤں کی جو ان تینوں کو اور ان کے معاونین اور مشیروں کو سلطان نے دیں، تفصیل لکھی ہے — وہ لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کو اتنے قہر اور غضب میں کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ اُس نے ان لوگوں کو جو سزائیں دیں، ان کے تصور سے سلطان خود بھی کانپ اٹھا ہوگا۔ وہ ظالم اور جبار سلطان نہیں تھا لیکن وہ اپنے قابو میں نہیں رہا تھا۔

"تم تینوں صرف ابوالعباس کے قاتل نہیں ہو" — سلطان محمود نے ان تینوں سے کہا۔ وہ بولتا تھا تو اُس کے منہ سے تھوک کے چھینٹے اڑتے تھے۔ یہ غصے کی انتہا تھی۔ اُس کے ہاتھ بھی غصے سے کانپ رہے تھے۔ اُس نے کہا — "تم ان ہزارہا آدمیوں کے قاتل ہو جو دونوں کی لڑائی میں دونوں طرف سے مارے گئے ہیں۔ اپنی فوج کے جانی نقصان کا حساب کرو۔ یہ فوج نہ تمہاری ہے نہ میری۔ یہ اسلام کی فوج تھی۔ یہ اللہ کے سپاہی تھے جنہیں تم نے اپنے سروں پر سجانے کے لیے ایک دوسرے کا قاتل بنا دیا۔"

سلطان محمود غصے سے اُٹھ کھڑا ہوا اور گرج کر بولا — "تم نے وہ خون دیکھا ہے جو صحرا نے چوس لیا ہے؟ تم نے وہ خون دیکھا ہے جو دریا میں بہہ گیا ہے؟ تم نے ایسے تڑپ تڑپ کر مرتے زخمیوں کو دیکھا ہے؟ فرنگیوں کی امداد سے تخت پر بیٹھنے والو! حق کی بات کرنے والوں کی گردنیں کاٹنے والو! ہاتھ میں قرآن لے کر لوگوں کو فریب دینے والو! اپنے آپ کو سچا مسلمان کہہ کر سچے مسلمانوں کا خون بہانے والو! تم خدا کی موجودگی کو بھول گئے تھے۔ تم بھول گئے تھے کہ خدا اپنے مظلوم بندوں کی فریادیں سنتا ہے۔ تم نے اپنی قوم کی قسمت یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاتھوں میں دے دی۔ تمہاری عقل پر اور تمہارے ایمان پر فرنگی عورت، زر و جواہرات، شراب اور حکومت کا طلسم طاری ہو گیا تھا۔ تم نے اپنا ایمان بیچا۔ ایمان فروشو! میں بت شکن ہوں اور تم باطل کے بت ہو۔ میں تمہیں اُسی طرح توڑ کر ریزہ ریزہ کروں گا جس طرح میں نے ہندوستان کے بت توڑے ہیں

...تمہیں سرکاری خزانے سے اس لیے تنخواہیں اور روٹی ملتی رہی کہ اپنے ملک اور مذہب کے دفاع میں اپنی جانیں لڑا دو گے مگر تم نے اپنے فرائض کو نظر انداز کر کے اپنے ہی ملک پر قبضہ کر لیا اور اپنے مذہب کی آڑ میں قوم کا جینا حرام کر دیا...... انہیں باہر لے جاؤ اور انہیں کوڑے لگا دو۔"

شہر کی آبادی اُس میدان میں اُمڈ کر آ گئی جہاں التگین، ابو اسحاق اور خمرطاش کو کوڑے لگائے جانے تھے۔ اب یہ تین نہیں تھے۔ رات کو اور انہیں باہر میدان میں لانے تک اُن کے بہت سے ساتھی پکڑے گئے تھے۔ وہ بھی میدان میں اُن کے ساتھ کھڑے تھے۔ چار چار کو آگے لا کر تنومند سپاہیوں سے انہیں کوڑے لگوائے گئے۔ اُن کی چیخیں لوگوں کے نعروں میں دب گئی تھیں۔ سلطان خود بھی وہیں تھا۔ بیہقی، عطبی اور گردیزی لکھتے ہیں کہ سلطان محمود نے کوڑا زنی بند کرا دی۔ انہیں جب ہوش آیا تو انہیں ایک چبوترے پر کھڑا کر دیا گیا اور لوگوں سے کہا گیا کہ ان کے قریب سے گزر کر انہیں دیکھو۔ لوگوں نے انہیں قریب آ کر اس طرح دیکھا کہ ان پر تھوکا اور بعض نے زمین پر سے مٹی اُٹھا کر اُن پر پھینکی۔ انہیں گالیاں دیں، لعن طعن کی اور میدان کے اردگرد جا کھڑے ہوئے۔

اس کے بعد سلطان محمود نے ایسا حکم دیا کہ ہر طرف سناٹا طاری ہو گیا۔ کسی کو جیسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سلطان محمود نے حکم دیا ہے۔ حکم یہ تھا کہ ان کے بازو کندھوں سے کاٹ دو۔ سپاہی تلواریں لیے آئے۔ مجرموں نے ادھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کی، منتیں کیں، سلطان کو پکار پکار کر بخشش مانگی مگر سلطان کے اعصاب پر دونوں فوجوں کے وہ سپاہی چھائے ہوئے تھے جو ان کی طمع کے نتیجے میں مارے گئے تھے۔ تمام مجرموں کے بازو کاٹ دیئے گئے۔

سلطان نے اسی پر بس نہ کی۔ اُس نے پہلے ہی پندرہ بیس ہاتھی منگوا کر ایک طرف کھڑے کر رکھے تھے۔ اس نے حکم دیا کہ ان پر ہاتھی چھوڑ دو۔ ہر ہاتھی پر ایک مہاوت سوار تھا۔ ہاتھی دوڑتے آئے۔ مجرموں کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ ان سے

وہ آہستہ آہستہ صرف چل سکتے تھے۔ وہ ہاتھیوں سے بچنے کے لیے ادھر اُدھر ہوئے لیکن مہاوتوں نے ہاتھیوں کو گھما پھرا کر سب کو کچل ڈالا۔ تین چار بار ہاتھی ان کے اوپر سے گذارے گئے۔

اس کے بعد ان تمام کی کچلی مسلی ہوئی لاشیں اٹھوا کر ابوالعباس کی قبر تک لے جائی گئیں اور ان کی گردنوں میں رسے ڈال کر لکڑی کے اُن کھمبوں کے ساتھ لٹکا دیا جو اسی مقصد کے لیے وہاں پہلے ہی گاڑ دیے گئے تھے۔

چند دن اور کوئی نہ کوئی پکڑا جاتا رہا۔ اُس کا جرم ثابت ہونے پر اُسے یہی سزا دی گئی، پھر پکڑ دھکڑ بند کر دی گئی۔ سلطان محمود نے التنطاش کو خوارزم کا خوارزم شاہ بنا دیا اور ارسلان جاذب کو اُس کا نائب مقرر کیا اور خوارزم کو سلطنتِ غزنی میں شامل کر لیا۔ ان دونوں نے جاسوسی اور مخبری کے نظام کو جسے دیوانِ شغلِ اشرافِ مملوکات" کہا جاتا تھا خوب استعمال کیا۔

سلطان محمود کا یہ محکمہ آج کی انٹیلی جنس کا کام کرتا تھا۔ اس میں کام کرنے والوں کو مُشرف کہا جاتا تھا۔ دشمن کے ملک میں اُس ملک کے جس باشندے کو اپنا مخبر یا ایجنٹ بنایا جاتا، اُسے بھی مشرف کہتے تھے۔ بیہقی نے لکھا ہے کہ مشرفوں کو سلطان محمود بے دریغ تنخواہیں اور الاؤنس اور انعامات دیا کرتا تھا۔ ان کے اہل و عیال کو وہ الگ وظیفے دیتا تھا۔ اس مورخ کے مطابق سلطان محمود کے مُشرف اتنے ہوشیار تھے کہ اپنے دشمن ملک کے بادشاہ کی سانسیں بھی گن لیا کرتے تھے۔

الطنطاش اور ارسلان جاذب نے اس محکمے کے بڑے ہوشیار اور ذہین مُشرف غزنی سے بلائے، کچھ خوارزم سے لیے اور ان زمین دوز تخریبی کارروائیوں کا سراغ لگا لیا جو یہودیوں اور عیسائیوں نے ابھی تک جاری رکھی ہوئی تھیں۔ انہیں اور ان کے مقامی ایجنٹوں کو گرفتار کر کے ویسی ہی سزائیں دی گئیں جیسی التگین وغیرہ کو دی گئی تھیں۔ شہریوں کے بنیادی حقوق بحال کر کے اُن میں خود اعتمادی پیدا کی گئی۔

سلطان محمود جب غزنی کو واپس جا رہا تھا تو صحرا میں اُس جگہ رک گیا جہاں دونوں فوجوں کی لڑائی ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر وہاں کھڑا ادھر اُدھر دیکھتا رہا۔ وہاں ابھی تک

گدھ، گیدڑ اور کتے لاشوں کی ہڈیاں نوچ رہے تھے۔ سلطان محمود کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے فاتحہ کے لیے ہاتھ اٹھائے اور جب اُس نے ہاتھ منہ پر پھیرے تو ہاتھ آنکھوں پر ہی رہنے دیے ـــــ وہ سسکیاں لے رہا تھا۔

طوفان جو غزنی سے آیا

دِلّی کے جنوب مشرق میں تقریباً دو سو میل دور گنگا کے دائیں کنارے پر قنوج نام کا ایک شہر ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں قنوج ایک طاقتور ہندو ریاست کی راجدھانی تھی۔ وہاں کے مہاراجہ کا نام راجیا پال تھا۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ شمالی ہند میں قنوج کے راجکماروں کو باعزت مقام حاصل تھا۔ دِلّی سے اسّی پچاسی میل جنوب میں جمنا کے کنارے متھرا کا شہر ہے جو ہندوؤں کے مطابق چار ہزار سال سے مقدس چلا آرہا ہے۔ ان کا کرشن مہاراج متھرا میں ہی پیدا ہوا تھا۔ آج بھی ہر سال دُور دور سے ہندو متھرا جاتے اور عبادت کرتے ہیں۔

متھرا میں ایک بڑے مندر کے علاوہ چند اور چھوٹے مندر تھے۔ یہ تراشے ہوئے پتھروں سے تعمیر کیے گئے تھے۔ ان کے کمرے، راہداریاں اور اندرونی راستے بھول بھلیوں جیسے تھے۔ شہر کے اردگرد مضبوط دیوار تھی اور ایک قلعہ بھی تھا۔ متھرا الگ ریاست نہیں تھی۔ اس کے دفاع کی ذمہ داری قنوج کے مہاراجہ راجیا پال اور پڑوس کی ایک اور چھوٹی سی ریاست مہابن کے حکمران رائے کول چند نے سنبھال رکھی تھی۔ کچھ اور راجے اور رانے بھی تھے جنہوں نے متھرا کے دفاع کے لیے اپنی اپنی فوجی نفری دے رکھی تھی۔

متھرا سے ملحق ریاست مہابن گھنے جنگلوں کا علاقہ تھا۔ راجدھانی کا نام مہابن تھا۔ یہ بھی جمنا کے دائیں کنارے پر واقع تھا اور یہ متھرا سے پچیس میل کے لگ بھگ دُور تھا۔

سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں ان ریاستوں کی بڑی آب و تاب تھی مگر سلطان ان پر آسیب کی طرح سوار ہو گیا تھا۔ وہ تھانیسر تک کے بت توڑ کر وہاں اپنی چوکیاں قائم کر گیا تھا۔ پنجاب کا مہاراجہ بھیم پال نِڈر بھی اُس کا باجگزار تھا۔ چھوٹے چھوٹے راجے اور رانے تو سلطان محمود کے نام سے بھی ڈرتے تھے۔

۱۰۱۷ء میں جب سلطان محمود نے خوارزم کو سلطنتِ غزنی میں شامل کر لیا، متھرا میں ہندوؤں کا سالانہ اجتماع تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے تمام تر ہندوستان کی آبادی متھرا میں آگئی ہو۔ شہر میں، بڑے مندر میں اور دریا کے کنارے مرد اور عورتیں چیونٹیوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ شہر کے باہر چھوٹے بڑے ہزاروں خیمے نصب تھے۔ شہر سے دو تین میل دُور جنگل میں کہیں کہیں رنگا رنگ کپڑوں کے محل کھڑے نظر آتے تھے۔ یہ راجوں مہاراجوں کے شامیانے اور قناتیں تھیں۔ ان کے اردگرد ان کے محافظ دستوں کے خیمے تھے۔ ان کے ساتھ ہاتھی اور گھوڑے بھی تھے۔ راجے مہاراجے بھی متھرا کی پرارتھنا اور جمنا کے اشنان کے لیے آئے تھے۔

زیادہ وسیع اور دلکش قیام گاہ مہاراجہ قنوج راجیا پال کی تھی اور اتنی ہی قیام گاہ پنجاب کے مہاراجہ بھیم پال نِڈر کی تھی۔ ان کے اندر جا کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ شامیانے اور قناتیں ہیں۔ رنگا رنگ فانوسوں، قندیلوں اور ریشمی پردوں نے محل کا سماں باندھ رکھا تھا۔ راجوں مہاراجوں کی بیویاں اور ناچنے گانے والیاں بھی ساتھ تھیں مگر متھرا کے پنڈتوں کے تیور دیکھ کر کسی کو رقص و سرود کی محفل گرم کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تو ہر سال میلے کا سماں ہوا کرتا تھا۔ باہر کے آئے ہوئے لوگ بھی ناچا اور گایا کرتے تھے مگر اب چیونٹیوں جیسے اس ہجوم پر اداسی بھی طاری تھی اور دہشت بھی۔

اس اداسی اور دہشت کا باعث سلطان محمود غزنوی تھا۔ ہندوؤں کے لیے "محمود" خوف اور نفرت کا ایک نام بن گیا تھا۔ پنڈتوں کی زبان پر یہی الفاظ تھے — "وشنو دیوتا اور کرشن واسدیو کے قہر سے تم بچ نہیں سکو گے۔" پجاری اور باہر سے آئے ہوئے لوگ بھی ایک آواز سنتے تھے — "دیوی دیوتاؤں کی توہین کرا کے تم زندہ کس طرح ہو۔ تم راتوں کو سوتے اور پیٹ بھر کر کھاتے کس طرح ہو۔ جب تک تم غزنی کی اینٹ

سے اسنٹ نہیں بہا دو گے اور محمود کے خون سے کشن واسدیو کے پاؤں نہیں دھوؤ گے، دیوتاؤں کا قہر ٹلے گا نہیں۔ اب گنگا جل اور جمنا جل تمہیں پاک نہیں کر سکتا۔
کشن واسدیو (کرشن مہاراج) کے پاؤں پر ماتھے رگڑنے والے اب اس بُت کی آنکھوں میں دیکھنے سے ڈرتے تھے۔ وہ جب بُت کے پاؤں پر ماتھا رکھتے تو ان کے آنسو بہنے لگتے تھے۔ مندر کی گھنٹیوں میں بھی اداسی تھی۔ بچوں والی عورتیں اتنی ڈری ہوئی تھیں کہ اپنے بچوں کو دیوتاؤں کے قہر سے بچانے کے لیے ان کے قدموں میں اپنے زیورات اتار کر رکھ دیتی تھیں۔ مرد بُت کے آگے ہاتھ جوڑ کر قسمیں کھاتے تھے کہ وہ اپنے مندروں اور دیوتاؤں کی توہین کا انتقام لیں گے۔ بعض بلند آواز سے کہتے تھے کہ اب محمود آیا تو وہ اسے اور اس کی فوج کو زندہ واپس نہیں جانے دیں گے۔

راجیاپال مہاراجہ قنوج جب کشن واسدیو کے بُت کی پوجا کرنے اندر گیا تو اُس کا خاص محافظ جگن ناتھ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ جگن ناتھ گٹھے ہوئے دلکش جسم کا دراز قد اور خوبرو آدمی تھا۔ اُس کے چہرے پر صحت اور جوانی کی سرخی تھی۔ اُس کی مسکراہٹ میں کشش اور اُس کی آنکھوں میں جادو کا سا اثر تھا۔ وہ شہسوار تھا۔ تیغ زنی اور تیر اندازی میں اُسے جو مہارت حاصل تھی، وہ کم ہی کسی میں تھی۔ اُسے مہاراجہ راجیاپال کے پاس آئے دو سال ہو گئے تھے۔ اُس نے پہلی ملاقات میں ہی مہاراجہ کا دل موہ لیا تھا۔

یہ ملاقات جنگل میں اُس وقت ہوئی تھی جب مہاراجہ شکار کھیل رہا تھا۔ مہاراجہ نے ایک ہرن پر تیر چلایا تو ہرن تیر کمان سے نکلتے ہی بھاگ اٹھا اور تیر خطا گیا۔ اچانک جگن ناتھ سامنے آگیا۔ مہاراجہ کے محافظوں نے اُسے وہاں سے ہٹانے کو برا بھلا کہا۔ اُس نے مسکرا کر مہاراجہ سے کہا کہ میں اڑتے ہرن کو تیر سے نہ گرا سکوں تو میرا گھوڑا لے لیا جائے اور مجھے دھکے دے کر یہاں سے چلتا کیا جائے۔

ہرن جب تیز دوڑتا ہے تو اتنی لمبی چوکڑیاں بھرتا ہے جیسے اُڑ رہا ہو۔ اس کی ایک ایک جست پچیس تیس گز لمبی ہوتی ہے اور وہ زمین سے سات آٹھ گز اوپر اٹھ جاتا ہے۔ مہاراجہ راجیاپال نے دلچسپی اور مذاق کی خاطر اُسے اپنی کمان اور صرف ایک تیر

دے کر کہا کہ ہمارے ساتھ رہو۔ کوئی ہرن نظر آیا تو اُسے بھگائیں گے۔ تم دوڑتے گھوڑے سے ہرن کو ایک تیر میں گرا لینا۔ اگر تیر خطا گیا تو گھوڑا ہم لے لیں گے۔

انہیں زیادہ دور نہ جانا پڑا۔ ایک جگہ چھ سات ہرن کھڑے تھے۔ مہاراجہ کے کہنے پر اُس کے آدمیوں نے شور مچایا تو ہرن بھاگ اٹھے۔ جگن ناتھ نے ان کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ اُس کے پیچھے مہاراجہ نے بھی گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ ہرن ہوا میں اچھلنے اور اُڑنے لگے۔ جگن ناتھ نے گھوڑے کی باگ اپنے دانتوں میں پکڑ لی۔ کمان آگے کر کے اس میں تیر ڈالا اور تیر چھوڑ دیا۔ ایک ہرن اڑان نما جست سے زمین پر آیا تو اوپر نہ اٹھ سکا۔ گرا اور اٹھ کر دوڑ پڑا۔ اس کے ساتھی آگے نکل گئے۔ اور جگن ناتھ کا گھوڑا اس تک پہنچ گیا۔ تیر ہرن کی ریڑھ کی ہڈی میں اُتر گیا تھا۔

"میں بجی رائے کی فوج کا کماندار ہوں"۔۔۔ مہاراجہ راجیاپال کو اُس نے بتایا۔۔۔ "مگر بجی رائے نے ایسی بُری شکست کھائی کہ اُس کی آدھی فوج ماری گئی اور آدھی غزنی والوں کی قیدی ہو گئی۔ میرا دل پھیکا پڑ گیا۔ میں لاہور کی فوج میں چلا گیا مگر یہ فوج بھی غزنی کے مسلمانوں سے شکست کھا گئی۔ اب لاہور کا راجہ محمود غزنوی کا باجگزار ہے۔ میں سپاہی ہوں۔ کمانداری کے عہدے پر تھا۔ میں کسی غیرت مند مہاراجے کی فوج میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ قنوج کے راجپوتوں میں غیرت ہے۔ میں اس جنگل میں آپ سے ہی ملنے آیا تھا۔"

مہاراجہ نے اس کے ساتھ کچھ باتیں کیں تو اُس نے محسوس کیا کہ یہ خوبرو جوان صرف تیر اور تلوار کا دھنی نہیں، اس میں عقل بھی ہے۔ مہاراجہ اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اُسے اپنے محافظ دستے میں رکھ لیا۔ جگن ناتھ پر قومی اور مذہبی جذبات غالب تھے۔ وہ محمود غزنوی اور دوسرے مسلمانوں کے خلاف زہر آلود نفرت کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اُس کی زبان میں کچھ ایسی چاشنی تھی کہ مہاراجہ راجیاپال نے اُسے اپنا ویسا ہی ذاتی محافظ بنا لیا جیسے آج کل ملکوں کے سربراہوں کے اے۔ ڈی۔ سی ہوتے ہیں۔ اس کے لیے زرق برق لباس سلوایا گیا۔ وہ جب دربار میں مہاراجہ کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا تو اس کے پاس رنگدار برچھی رہتی تھی جس کے پھل پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔ مہاراجہ جہاں جاتا

جگن ناتھ اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ مہاراجہ کی شان و شوکت کا حصہ بن گیا تھا۔
راجیا پال کی تین رانیاں تھیں جگن ناتھ کے فرائض میں رانیوں کی حفاظت بھی شامل تھی۔
کوئی رانی کہیں جاتی تو جگن ناتھ بھی گھوڑے پر سوار گھوڑا گاڑی کے ساتھ ساتھ جاتا تھا۔ اس طرح جگن ناتھ سجاوٹ کی ایک چیز بن گیا تھا۔

مہاراجہ راجیا پال بڑے مندر میں مُبت کی پوجا کے لیے اندر گیا تو جگن ناتھ بھی اُس کے ساتھ تھا۔ مہاراجہ نے کرشن واسدیو کے پاؤں پر جو سنگِ مرمر کے تھے، ماتھا رگڑا۔ اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور عہد کیا کہ وہ محمود غزنوی کا سر اس مندر میں اس بُت کے قدموں میں کاٹے گا۔

"اور میں عہد کرتا ہوں" — جگن ناتھ نے ہاتھ جوڑ کر بُت سے کہا — "اگر ہم سلطان محمود غزنوی کو یہاں نہ لا سکے تو میں اپنا سر اپنے ہاتھوں کاٹ کر تیرے قدموں میں رکھ دوں گا۔"

مہاراجہ نے چونک کر جگن ناتھ کو دیکھا۔ جگن ناتھ آنکھیں بند کیے، ہاتھ جوڑے ہوئے بھجن گنگنا رہا تھا۔ بڑے پنڈت نے دونوں کے آگے سلگتے ہوئے لوبان کی طشتری گھمائی۔ مہاراجہ نے لوبان کی راکھ اپنے ماتھے پر لگائی۔ جگن ناتھ نے بھی انگلی سے راکھ اپنے ماتھے پر لگائی۔ مہاراجہ نے اپنے گلے سے ہار اتارا جو بہت قیمتی تھا، اور یہ بُت کے پاؤں پر رکھ دیا۔

"مہاراج!" — بڑے پنڈت نے راجیا پال سے کہا — "ہری کرشن کو ان پتھر موتیوں کی نہیں، موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے خون کے قطروں کی ضرورت ہے۔ یہ بھارت اپنے بیٹوں کا خون مانگ رہا ہے۔ بھارت ماتا کی بے عزتی کا انتقام نہ لینے والے مہاراجہ کو بن باسی ہو جانا چاہیے۔"

"ہم انتقام لیں گے" — مہاراجہ قنوج نے بُت کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا — "غزنی کے محمود کا سر اس مندر کے دروازے پر لٹکا رہا کرے گا۔"

دن کے وقت دریا پر نہانے والوں کا اتنا ہجوم رہتا تھا کہ پانی میں کہیں کھڑا ہونے

کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ عورتوں کو دور جا کر نہانا پڑتا تھا۔ دریا میں نہانا عبادت کا ایک لازمی حصہ تھا۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق گنگا اور جمنا کا پانی سارے گناہ دھو ڈالتا ہے۔ بعض ہندو پہروں پانی میں کھڑے عبادت کرتے رہتے ہیں۔ راجوں مہاراجوں کی رانیاں اور داشتائیں جو اُن کے ساتھ آئی ہوتی تھیں، وہ رعایا کی عورتوں کی موجودگی میں دریا میں نہانا پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ رات کو جایا کرتی تھیں۔

ایک شام مہاراجہ قنوج راجیا پال کی سب سے چھوٹی رانی چمپا کلی نے مہاراجہ سے کہا کہ وہ جمنا اشنان کے لیے جا رہی ہے۔ مہاراجہ اسے روک نہیں سکتا تھا۔ اُس نے جگن ناتھ سے کہا کہ وہ شام گہری ہونے کے بعد چمپا رانی کو دریا پر لے جائے۔ وہ بڑی دونوں رانیوں کو ایک رات پہلے دریا پر لے جا چکا تھا۔ خود اندھیرے میں دور کھڑا رہا تھا۔ رانیاں نہا کے آئیں تو انہیں واپس لے آیا تھا۔ چمپا ان کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ وہ نوجوان تھی اور بہت خوبصورت۔ دوسری دونوں رانیاں پرانی ہو چکی تھیں۔ مہاراجہ انہیں اس لیے ساتھ رکھتا تھا کہ وہ اُس کے بیٹوں کی مائیں تھیں۔ مہارانی چمپا غالب تھی۔ پرانی رانیاں اس سے کھچی کھچی رہتی تھیں۔

چمپا کوئی دو سال پہلے جب اُس کی عمر سولہ سترہ سال تھی مہاراجہ کے پاس تحفے کے طور پر آئی تھی۔ اس کا باپ کوئی امیر کبیر آدمی نہیں تھا۔ اس کے خاندان میں حسن کی دولت تھی اور چمپا اس حسن کا نمونہ تھی۔ مہاراجہ راجیا پال کے ایک جاگیردار کی نظر چمپا پر پڑی تو اس نے اُس کے باپ کو بہت سی رقم دے کر لڑکی بیوی کے طور پر لے لی تھی۔ شادی کی رسم ادا کی گئی تھی۔ جاگیردار چمپا کو قنوج لے گیا اور مہاراجہ کو پیش کر دی۔ مہاراجہ نے اسے حرم میں رکھنے کی بجائے اس کے ساتھ باقاعدہ شادی کر لی۔ مہاراجہ کی عمر پچاس سال سے اوپر ہو گئی تھی۔ چمپا اُس کی رگوں پر سوار ہو گئی اور پہلی دونوں رانیاں محل کی پرانی چیزوں میں شمار ہونے لگیں۔

شام کا اندھیرا گہرا ہوا تو چمپا اپنے محل نما خیمے سے نکلی۔ اس کے ساتھ ایک خادمہ بھی تھی۔ جگن ناتھ باہر انتظار کر رہا تھا۔ چمپا اپنی خادمہ کے ساتھ آگے آگے چل پڑی۔ جگن ناتھ ان کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ وہ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے خیموں اور خرخیموں

کے ڈیروں سے دور نکل گئے تو دریا کا وہ کنارہ قریب آ گیا جہاں چمپا کو نہانا تھا۔ یہ جگہ خاصی دور تھی۔ اُدھر رعایا کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ چمپا رانی نے اپنی خادمہ سے کہا کہ وہ اُدھر چلی جائے جہاں لوگوں کی عورتیں نہا رہی تھیں۔ جگن ناتھ دریا سے کچھ دور رک گیا۔

خادمہ اندھیرے میں غائب ہو گئی۔ چمپا دریا کے قریب چلی گئی اور ذرا دیر بعد واپس آ گئی۔

"اِدھر آ جاؤ جگن!" ـــ اُس نے کہا۔ "وہ چلی گئی ہے۔ میں نے اُسے کہہ دیا ہے کہ جلدی واپس نہ آئے۔"

جگن ناتھ اُس کے قریب چلا گیا۔ اندھیرا تھا اور جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ بھی تھی۔ دور دریا کے کنارے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ مرے ہوئے دو تین ہندوؤں کو جلایا جا رہا تھا۔ دریا میں دو کشتیاں بھی جا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے جلتی ہوئی دو شعلیں تیرتی جا رہی ہوں۔ چمپا نے جگن ناتھ کو اپنے قریب بٹھا لیا اور سر اُس کے زانوؤں پر رکھ کر زمین پر لیٹ گئی۔

"تم نہ ہوتے تو میں اس بڈھے مہاراجے کو زہر دے دیتی یا خود زہر کھا لیتی"۔ چمپا نے جگن ناتھ کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں الجھاتے ہوئے کہا۔ "مگر تمہیں مہاراجہ کے ساتھ اتنا پیار ہے کہ اسے تم چھوڑنا نہیں چاہتے۔ تمہیں یہ محل اور اس کی نوکری اچھی لگتی ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں رانی ہوں لیکن تم ساتھ دو تو میں تمہاری خاطر بن باسی بن کے دکھا دوں گی۔ جنگل میں کُٹیا میں رہوں گی۔ تم یہاں سے کیوں نہیں نکلتے؟ مجھے یہاں سے نکالتے کیوں نہیں؟ ہم کب تک چوروں کی طرح ملتے رہیں گے؟"

"یہ بات تم مجھے ایک سو مرتبہ کہہ چکی ہو"۔ جگن ناتھ نے کہا۔ "اور میں تمہیں ہر بار یہی کہتا ہوں کہ ذرا صبر سے کام لو۔ میں تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گا ..... اور میں پھر کہتا ہوں کہ میرے ساتھ نکل چلو گی تو یہ محل تمہیں بہت یاد آئے گا۔ میں دو گز زمین کا بھی مالک نہیں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ ہماری حیثیت مفروروں کی سی ہو گی۔ ہم جہاں پکڑے گئے وہاں قتل کر دیئے جائیں گے۔"

"تم بھیرہ سے آئے ہو جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے"۔ چمپا نے کہا۔ "اگر ہم بھاگ کر وہاں چلے جائیں اور مسلمان ہو جائیں تو کیا مسلمان ہمیں اپنی حفاظت میں نہیں رکھیں گے؟"۔ چمپا رانی نے دانت پیس کر کہا۔ "مجھے اپنے مذہب سے بھی نفرت ہوتی جا رہی ہے"۔ ـــ وہ اُٹھ بیٹھی اور بولی ـــ "میں مہاراجہ کو آسانی سے زہر پلا سکتی ہوں۔ پھر تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے؟ وہ مر گیا تو ہمیں کون پکڑے گا؟"

"وہ چتائیں جلتی دیکھ رہی ہو؟" ـــ جگن ناتھ نے اُن شعلوں کی طرف اشارہ کیا جو مرے ہوئے ہندوؤں کو چاٹ رہے تھے۔ "مہاراجہ مر گیا تو تمہیں ستی ہونا پڑے گا۔ تمہیں زندہ اپنے خاوند کی جلتی چتا پر کھڑا کر دیا جائے گا ..... مجھ پر بھروسہ کرو چمپا! میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا"۔

"تم نے بھیرہ میں غزنی کی فوج کے خلاف لڑائی لڑی ہے"۔ چمپا نے کہا۔ "کیا وہ فوج بہت زبردست ہے؟ ہمارے دیس کے راجپوت مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکتے؟"

"غزنی کی فوج بہت زبردست ہے" ـــ جگن ناتھ نے جواب دیا۔ "مسلمان فوج کی تعداد جتنی کم ہوتی ہے، وہ اتنی ہی زبردست ہوتی ہے ..... اب تو بھیم پال ٹھاکر کو بھی مسلمانوں نے گھٹنوں بٹھا دیا ہے اور اُس سے باج وصول کر رہے ہیں۔ سلطان محمود کشمیر سے شکست کھا کر واپس جا رہا تھا تو اُس کے پاس بہت تھوڑی فوج تھی اور وہ سب زخمی تھی۔ یہ فوج مہاراجہ بھیم پال کے علاقے سے گزری تو مہاراجے کو جرأت نہ ہوئی کہ اس مری ماری ہوئی فوج پر حملہ کر کے سلطان سمیت اسے قید کر لیتا"۔

"جگن ناتھ!" ـــ چمپا رانی نے کہا۔ "تم مذہب کے عاشق ہو۔ بُرا نہ جانو تو کہوں۔ ہمیں پنڈت ڈراتے ہیں کہ ہمارے جن دیوی دیوتاؤں کے بُت مسلمانوں نے توڑ دیئے اور جو مندر اجاڑ دیئے ہیں وہ قہر نازل کریں گے ..... اتنا عرصہ گزر گیا ہے، میں نے تو دیوتاؤں کا قہر کہیں گرتا نہیں دیکھا۔ ابھی تو غزنی کی فوج قہر کی طرح ہم پر ٹوٹ رہی ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ مسلمان ایسے خدا کی عبادت کرتے ہیں جو کسی کو نظر نہیں آتا۔ میرا خیال ہے کہ وہی خدا سچا ہے۔ ہم نے تھانیسر کے دشنو دیو کی بہت باتیں سُنی تھیں۔ ہم نے

سنا تھا کہ وشنو دیو کے پجاری کسی میدان میں شکست نہیں کھا سکتے مگر اس دیو کو غزنی کے سلطان سے نہ پجاری بچا سکے نہ دیو نے اپنے آپ کو بچایا.... کیا تم ان دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہو؟"

"تم اپنی زندگی سے اس قدر اکتائی ہوئی ہو کہ اپنے مذہب سے نفرت کرنے لگی ہو" — جگن ناتھ نے اس کے ریشم جیسے ملائم بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "مذہب کے خلاف جو جی میں آئے کہو، میری محبت پر شک نہ کرنا۔"

"اپنی محبت کی خاطر تم مجھے کسی بھی امتحان میں ڈال دو، پوری اتروں گی" — چپا نے کہا — "مگر اس مذہب کے نام پر میں کوئی قربانی نہیں دے سکتی۔"

خادمہ کھانستی چلی آ رہی تھی۔ چپا اٹھ کھڑی ہوئی اور چل پڑی۔ جگن ناتھ وہیں چھپا رہا۔ ذرا دیر بعد چپا نے اسے راہبوں کی طرح آواز دی اور خادمہ کے ساتھ آگے آگے چل پڑی۔

دوسرے دن مہاراجہ راجیا پال نے جگن ناتھ سے کہا کہ وہ آج چھٹی کرے اور بازار سے گھوم پھر آئے۔ جگن ناتھ نے اچھے کپڑے پہنے اور کمر سے تلوار لٹکا کر سیر و تفریح کو نکل گیا۔

جگہ جگہ جوتشیوں، نجومیوں اور سیناسیوں کے گرد مجمع لگے ہوئے تھے۔ لوگ جوتشیوں اور نجومیوں کو ہاتھ دکھا کر قسمت کا حال معلوم کر رہے تھے۔ بعض بیکار دوسروں نے مجمعے لگا رکھے تھے اور لوگوں کو جنتر منتر کر کے پیسے اکٹھے کر رہے تھے۔ کئی مداری اور کئی بہروپیے لوگوں کو کرتب دکھا رہے تھے۔

جگن ناتھ مجمعے میں ذرا سا رکتا اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک درخت کے نیچے دو سادھو بیٹھے تھے۔ ان کے صرف ستر ڈھانپے ہوئے تھے۔ ننگے جسموں پر راکھ ملی ہوئی تھی۔ سر کے بال لمبے اور راکھ سے اٹے ہوئے تھے۔ ان کی داڑھیاں بھی تھیں۔ ان کے اردگرد مجمع زیادہ تھا۔

جب جگن ناتھ اس مجمع میں جا رکا تو ایک آدمی نے سادھوؤں سے کہا — "رشی مہاراج! ہمیں ان ملیچھ مسلمانوں کے متعلق کچھ بتائیں جو سمندر پار سے آتے ہیں اور

ہمارے مندروں کا ستیاناس کر کے چلے جاتے ہیں۔"

"مسلمان ملیچھ ہیں" — ایک سادھو نے کہا — "لٹیرے ہیں۔ انہیں دھن کا لوبھ ادھر لاتا ہے۔ لوٹتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ وہ ہمارے کسی دیوی دیوتا سے نہیں ڈرتے۔ وہ نہیں جانتے کہ نارائن اور مہا بھارت نے وشنو اور واسدیو کے کرودھ کی جو خبر دی ہے وہ سچ ہے۔ دیوتاؤں کا کرودھ مسلمانوں پر ضرور پڑے گا لیکن ابھی ہم پر پڑ رہا ہے۔ غزنی کا بادشاہ محمود بڑا ظالم اور زبردست ہے۔ وہ سیلاب کی طرح آتا ہے اور اس کے سامنے کوئی فوج نہیں ٹھہر سکتی۔ ہاتھی بھی بھاگ جاتے ہیں۔ اسے دریاؤں کی طغیانی بھی نہیں روک سکتی۔ اسے پہاڑ بھی نہیں روک سکتے۔"

وہ مسلمانوں کو برا بھلا بھی کہہ رہا تھا اور ان کی دہشت بھی طاری کرتا جا رہا تھا۔ اس نے لوگوں کو غزنی کی فوج کی کچھ ایسی ہولناک باتیں سنائیں کہ سننے والوں کی آنکھیں خوف سے ابل کر باہر آنے لگیں۔ جگن ناتھ سنتا رہا۔ سادھو نے بولتے بولتے اسے دیکھا۔ ان کی نظریں ملیں۔ سادھو کی زبان ذرا سی رکی اور پھر رواں ہو گئی۔ اس نے اب اپنے سامعین کو دیوتاؤں کے کرودھ (قہر) سے بچنے کے طریقے بتانے شروع کر دیئے۔ جگن ناتھ وہاں سے ہٹ گیا۔

وہ ٹہلتے ٹہلتے ایک پرانے مندر کی سیڑھیوں پر جا رکا۔ اس نے دیکھا کہ وہی دو سادھو آ رہے تھے۔ جگن ناتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ یہ مندر خالی اور ویران تھا۔ اس کا کچھ حصہ کھنڈر بن چکا تھا۔ اسے آواز سنائی دی — "تاشقین!"

وہ رکا نہیں۔ اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اسے پھر آواز سنائی دی — "تاشقین!"

وہ سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ دونوں سادھو تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے اس تک پہنچ گئے۔ ایک نے کہا — "ابن تاشقین!"

وہ رک گیا۔ اس کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آنے لگے — "کہا بھی نہیں سن رہا۔ زبردست ہے" سادھو نے کہا۔

"ہشام سمرقندی!" — اُس نے سادھو کی طرف دیکھ کر سرگوشی کی۔ "اگر آس پاس کوئی نہیں، پھر بھی تمہیں میرا نام لے کر مجھے نہیں بلانا چاہیئے تھا۔ تم اناڑی ہو گیا! یہیں بیٹھ جاؤ۔ میں اپنی ہتھیلی پھیلا رہا ہوں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر دیکھتے رہو اور باتیں کرتے رہو... تم دونوں کے علاوہ اور کون ہے یہاں؟"

"دو آدمی اور ہیں" — ہشام نے جو سادھو کے بھیس میں غزنی کا جاسوس تھا، جواب دیا۔ "قیس کی طرح دونو مُشرف ہیں۔ وہ بھی سادھوؤں کے بھیس میں ہیں۔"

مُشرف انٹیلی جنس کے مقامی لوگوں (مخبروں) کو کہا کرتے تھے۔ سلطان محمود غزنوی کا انٹیلی جنس کا جو نظام کام کر رہا تھا اس میں مقامی مسلمانوں کو مُشرف کے طور پر رکھ لیا جاتا تھا اور انہیں بڑی اچھی اُجرت دی جاتی تھی۔ یہ سادھو دراصل غزنی کا جاسوس ہشام سمرقندی تھا۔ اُسے ملتان سے متھرا اس مشن پر بھیجا گیا تھا کہ وہاں سارے ہندوستان کے ہندو جمع ہوں گے، لہٰذا وہ مقامی مُشرف ساتھ لے جا کر وہاں سادھوؤں کے بھیس میں لوگوں میں دہشت پھیلائیں۔ ہشام کے ساتھ دوسرا سادھو ملتان کے علاقے کا قیس نام کا ایک آدمی تھا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی اور تھے جو متھرا کے ہجوم میں کہیں گم اپنا کام کر رہے تھے۔

ہشام نے جگن ناتھ کو جو دراصل امیر بن تاشقین تھا، پہچان لیا تھا۔ دونو غزنی کے علاقے کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان میں ان کی اب پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ قیس تاشقین کو نہیں جانتا تھا۔ تینوں اس علاقے کی زبان اور رسم و رواج سے بڑی اچھی طرح واقف تھے۔

"کہاں ٹھکانہ ہے؟" — ہشام نے تاشقین سے پوچھا۔ "کچھ ہاتھ لگا؟"

"میں جا رہا ہوں" — تاشقین نے کہا۔ "ہندو بن کر آیا تھا۔ اب جا رہا ہوں۔"

"آپ ہم سے چھپاتے ہیں؟" — قیس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں نے آپ کو مہاراجہ قنوج کے ساتھ دیکھا ہے۔ آپ شاید اُس کے محافظ بنے ہوئے ہیں۔ مجھے تو ذرا سا بھی شک نہیں ہوا تھا کہ آپ ہمارے آدمی ہیں۔ میں آپ کو ہیرا اُستاد مانتا ہوں۔"

"ہم تینوں کا یہاں اٹھنا ٹھیک نہیں" — تاشقین نے کہا۔ "قیس! تم ذرا الگ ہو بیٹھو۔ ہم رات کو کہیں اکٹھے ہوں گے۔"

"ہشام!" قیس کے چلے جانے کے بعد امیر بن تاشقین نے ہشام سے کہا۔ "تم بہت بڑے بیوقوف ہو۔ کیا تم مقامی لوگوں پر اُس قدر اعتماد کرتے ہو کہ تم نے مجھ جیسے آدمی کو بے نقاب کر دیا ہے؟ ... اس شخص کو تم نے کسی کام میں آزمایا ہے؟ اس نے کوئی بڑا کام کیا ہے؟"

"آدمی قابلِ اعتماد ہے" — ہشام نے کہا۔ "اسے ابھی کوئی نازک کام نہیں دیا گیا۔"

"خدا کرے یہ قابلِ اعتماد ثابت ہو" — تاشقین نے کہا۔ "لیکن ہمارا کام ہم سب کے لیے بہت خطرناک ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کام میں کس طرح اپنی خواہشات اور اپنی کمزوریوں کو دبانا پڑتا ہے۔ یہ طاقت اُسی میں ہوتی ہے جس میں ایمان ہو اور جس میں وہ جذبہ ہو جو ہم میں ہے۔ ہندوستان کے ہر مسلمان پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لوگ ایک زمانے سے ہندوؤں کے دبدبے میں رہ رہے ہیں۔ انہوں نے ہندوؤں کی تہذیب اور ان کی توہم پرستی کے اثرات قبول کر لیے ہیں۔ یہ لوگ اپنی مجبوریوں اور معذوریوں کے تحت ہندوؤں کو خوش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہاں کے مسلمان قابلِ اعتماد ہوں بھی تو بھی انہیں میرے درجے کے آدمیوں سے واقف نہیں ہونا چاہیئے۔ ہندو ذرا سی بات پر انہیں قتل کرتے اور ان کے گھر جلاتے اور ان کے گھروں میں گھس کر تلاشی لیتے ہیں۔"

"میں اسے بیکار کر دوں گا" — ہشام نے کہا۔

"اس نے مجھے مہاراجہ کے ساتھ دیکھ لیا ہے" — تاشقین نے کہا۔ "اسے کسی نے پکڑ لیا تو اذیت سے گھبرا کر یا لالچ میں آ کر مجھے پکڑوا دے گا۔ میں اس کے لیے بہت موٹا شکار ہوں۔ ذرا غور کرو کہ میں قنوج کے مہاراجہ کا ذاتی محافظ ہوں اور سب مجھے جگن ناتھ کہتے ہیں۔ مجھے جس نے پکڑوایا اُسے مہاراجہ ہیروں اور جواہرات کی صورت میں انعام دے گا۔"

"اگر تم اس شخص سے خطرہ محسوس کرتے ہو تو میں اسے آج ہی ختم کر کے اس کی لاش غائب کر دیتا ہوں" — ہشام نے کہا — "مجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔"

"محض شک میں کسی کی جان نہ لو" — تاشقین نے کہا — "اس پر نظر رکھنا اور اسے پکا کر لینا۔"

"ہمارا کام تمہیں پسند آیا؟" — ہشام نے پوچھا — "لوگوں کو ان کے اپنے پنڈتوں نے ڈرا دیا ہے۔ اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ ہم چار آدمیوں نے پوری کر دی ہے۔ یہ لوگ سادھوؤں، سنیاسیوں اور جوتشیوں کی جھوٹی باتوں کو بھی سچ مان لیتے ہیں۔ ہم نے ان کے دلوں میں ڈال دیا ہے کہ محمود غزنوی اپنے ساتھ جیسے جن بھوت لاتا ہے جو انسانوں کو کھا جاتے اور قلعوں کی دیواروں کو مسمار کر دیتے ہیں۔ یہاں کی مائیں اپنے بیٹوں کو فوج میں نہیں جانے دیں گی.... تم کیا کر رہے ہو؟"

"مہاراجہ قنوج کی نیت اور ارادے دیکھ رہا ہوں" — تاشقین نے جواب دیا — "نیت غصے میں ہے۔ جن راجوں اور مہاراجوں نے ہم سے شکست کھائی ہے انہیں برا بھلا کہتا رہتا ہے۔ یہاں سب آئے ہوئے ہیں۔ ان کا اجلاس ہو گا تب پتہ چلے گا کہ یہ لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں۔"

"سلطان ابھی کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں" — ہشام نے کہا — "معلوم نہیں تمہیں اطلاع ملی ہے یا نہیں...."

"کہ سلطان کو خوارزم میں بڑی خونریز لڑائی لڑنی پڑی ہے" — تاشقین نے ہشام کا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا — "مجھے اطلاع مل چکی ہے۔ سلطان کو لاہور سے اطلاع ملی تھی کہ مہاراجہ بھیم پال نڈر قنوج کے مہاراجہ کو سلطان سے فیصلہ کن ٹکر لینے پر آمادہ کر رہا ہے۔ مجھے یہاں یہ دیکھنا ہے کہ قنوج کا مہاراجہ کیا فیصلہ کرتا ہے۔ کیا یہ سب لوگ غزنی پر حملہ کریں گے یا سلطان کو مشتعل کر کے اپنی فوجیں کسی اور جگہ اکٹھی کریں گے اور سلطان کو شکست دینے کی کوشش کریں گے۔ مجھے یہاں کے مہاراجوں کی فوجی طاقت دیکھنی ہے اور یہ بھی کہ وہ اس طاقت کو کس طریقے سے استعمال کریں گے۔"

"شاید اسی لیے ہمیں کہا گیا ہے کہ متھرا میں ہندو اکٹھے ہوں تو ان میں غزنی کی

فوج کی دہشت پھیلائی جائے" — ہشام نے کہا۔

"تم اب چلے جاؤ" — تاشقین نے کہا — "اور مقامی مُشرفوں کو اتنا زیادہ اعتماد میں نہ لو۔ انہیں استعمال کرنے کی کوشش کرو۔"

شام ہوتے ہی اُفق پر بادل جمع ہونے لگے تھے۔ اُسی رات مہاراجوں اور راجوں کو مہاراجہ قنوج کی قیام گاہ میں اکٹھے ہونا تھا۔ ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ خوشنما قناتوں میں گھری ہوئی اور رنگارنگ شامیانوں سے ڈھکی ہوئی وہ جگہ خاصی وسیع تھی۔ ناچ گانے کا بھی انتظام تھا۔ کھانا اور شراب پیش کرنے کے لیے نیم عریاں جوان عورتیں تھیں۔ راجوں اور مہاراجوں کے ساتھ دو دو تین تین رانیاں بھی تھیں۔ بعض مہاراجوں کے ذاتی محافظ اُن کے پیچھے کھڑے تھے۔ امیر بن تاشقین بھی مہاراجہ راجیا پال کی نشست کے پیچھے جگن ناتھ کے بہروپ میں کھڑا تھا۔ کھانے کے دوران چمپا رانی اُسے کبھی کبھی دیکھ لیتی تھی مگر تاشقین مندر کے بُت کی طرح کھڑا تھا۔

کھانا ختم ہوا تو سازندوں کی آواز بلند ہوئی اور ایک رقاصہ ایک طرف سے تتلی کی طرح نمودار ہوئی۔

"بند کرو اس پاپ کو" — ایک آواز دھماکے کی طرح گرجی۔

ساز خاموش ہو گئے۔ رقاصہ وہیں سے لوٹ گئی۔ سب نے دیکھا۔ بڑے مندر کا پنڈت اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یہ اُسی کی آواز تھی۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ راجوں مہاراجوں اور اُن کی رانیوں پر سناٹا طاری ہو گیا تھا۔

"کیا تم اس کی خوشی منانے اکٹھے ہوئے ہو کہ مہاراجہ بھیم پال جو اپنے آپ کو نڈر کہلاتا ہے غزنی کے پاپی اور پلید سلطان کا باجگزار ہو گیا ہے؟" — پنڈت نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "کیا تم اپنے دیوتاؤں کی توہین پر خوشی منا رہے ہو؟ کیا تم اس لیے ناچنے والیوں کو ساتھ لائے ہو کہ تمہارے مذہب پر مسلمانوں نے گھوڑے دوڑا دیئے ہیں یا اس لیے کہ راجپوتوں کا خون سرد ہو گیا ہے؟ تم خود ناچو۔ پاؤں سے گھنگھرو باندھ لو۔ چوڑیاں چڑھا لو....."

"ہمیں معاف کردو مہاراج!" ــــ ایک راجہ نے اُٹھ کر اور ہاتھ جوڑ کر کہا ــــ "ہم آج یہ فیصلہ کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں کہ غزنی کی فوج کو ہمیشہ کے لیے شکست دینی ہے۔"

"تم سب پر ہری کرشن واسدیو کا قہر آیا ہی چاہتا ہے" ــ پنڈت نے کہا ــــ "تم نے ثابت کر دیا ہے کہ اسلام سچا اور ہندو مت جھوٹا مذہب ہے ۔ تم نے مہا بھارت میں اسلام کا بیج پھر سے بو دیا ہے ۔ تم نے محمد بن قاسم کو زندہ کر دیا ہے۔ تم دیوتاؤں کے قہر سے بچ نہیں سکتے۔"

بادل کی گرج سنائی دی ۔ پنڈت انہیں لعنت ملامت کرتا رہا ۔ بادل بار بار گرجنے لگے ۔ پنڈت راجوں مہاراجوں کو دیوتاؤں کے قہر سے ڈرا رہا تھا ۔ قناتیں بڑے زور سے ہلیں اور شامیانے اوپر کو اُٹھے ۔ اس کے بعد کپڑوں کے اس محل کو سنبھالنا مشکل ہو گیا ۔ طوفان فوراً ہی تُند ہو گیا ۔ جلتے ہوئے فانوس گر پڑے ۔ تیل بکھر گیا اور اسے آگ لگ گئی ۔ بجلی اتنے زور سے کڑکی جیسے زمین و آسمان پھٹ گئے ہوں ۔ فانوسوں نے زمین پر بچھی ہوئی دری کو آگ لگا دی تھی ۔ طوفان نے ایک طرف سے قنات گرا دی اور اسے بھی آگ لگ گئی ۔

پنڈت کی آواز سنائی دی ــــ "یہ وشنو دیو کا قہر ہے" ــــ اور سب بھاگ اُٹھے ۔

پھر مینہ برسنے لگا ۔ یہ طوفانِ باد و باراں تھا ۔ بجلی بار بار کڑکتی اور بادل بڑی زور سے گرجتے تھے ۔ طوفان کی چیخیں بڑی ہی ڈراؤنی تھیں ۔ ہاتھی چنگھاڑنے اور گھوڑے خوف سے ہنہنانے لگے ۔ بارش نے آگ بجھا دی اور طوفان شامیانے، قناتیں اور خیمے اڑانے لگا ۔ راجوں مہاراجوں کے محافظ اپنے آقاؤں اور ان کی رانیوں کو کسی محفوظ جگہ لے جانے کے لیے دوڑے ۔ مہاراجہ راجیاپال کی پکار بار بار سنائی دیتی تھی ــــ "جگن ناتھ! چمپا رانی کو مندر میں لے جاؤ۔"

مندر دُور تھا ۔ بھگدڑ اور افراتفری تھی ۔ سب قصر کی طرف دوڑے جا رہے تھے ۔ جنگل کے درخت چیخ اور چنگھاڑ رہے تھے ۔ ٹہنیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں ۔ تاشقین نے چمپا کو پہلے ہی اپنی پناہ میں لے لیا تھا اور اُسے بازوؤں میں اٹھائے ہوئے شہر کی طرف لے جا رہا تھا ۔

شہر کے اردگرد باہر سے آئے ہوئے ہندوؤں کے ہزارہا خیمے نصب تھے ۔ بعض ہندو خیموں کے بغیر آسمان تلے پڑے تھے ۔ وہ اپنا سامان طوفان کے رحم و کرم پر چھوڑ کر شہر کو بھاگے جا رہے تھے ۔ شہر والوں نے ان لوگوں کو پناہ میں لینے کے لیے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیے تھے ۔ طوفان کا زور ابھی بڑھ رہا تھا ۔ بجلی چمک کر کڑکتی تھی تو انسانوں کی چیخیں سنائی دیتی تھیں ۔ بچے چیخ رہے تھے ، عورتیں چیخ چلا رہی تھیں اور طوفان کی چیخیں انسانی چیخوں کو جیسے ہڑپ کرتی جا رہی تھیں ۔

یہ طوفان ایک قیامت تھی ۔ اس قیامت خیز طوفان میں ہشام سمرقند کا ساتھی قیس دریا کی طرف سے شہر کو آ رہا تھا ۔ وہ اکیلا تھا ۔ اُسے طوفان کے زناٹوں ، بارش کی بوچھاڑوں اور درختوں کی چیخوں میں ایک ایسی چیخ سنائی دی جو کسی بچے کی یا عورت کی معلوم ہوتی تھی ۔ قیس رُک گیا ۔ بجلی چمکی اور کڑکی ۔ اُسے اس چمک میں قریب ہی ایک درخت کے تنے کے ساتھ کوئی انسان نظر آیا اور وہی چیخ پھر سنائی دی ۔ وہ اُدھر کو دوڑا ۔ وہاں ایک عورت اکیلی بیٹھی کانپ رہی تھی ۔

"مت ڈرو" ــ قیس نے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا ــ "اب تم اکیلی نہیں ہو۔"

وہ ایک نوجوان لڑکی تھی ۔ شام کے بعد دریا پر نہانے گئی اور طوفان نے آ گھیرا ۔ سب بھاگے تو وہ اپنی ساتھیوں سے بچھڑ گئی ۔ قیس کو دیکھتے ہی اُس کے ساتھ لپٹ گئی ۔ بجلی اب کے اتنی زور سے کڑکی کہ قیس بھی جو ایک دلیر مرد تھا سُن ہو کے رہ گیا ۔ لڑکی کی چیخ بجلی کے دھماکے سے زیادہ بلند تھی ۔ بجلی قریب ہی ایک درخت پر گری ۔ لڑکی قیس کے ساتھ اس طرح اور زیادہ چپک گئی جیسے اُس کے وجود میں سما جانے کی کوشش کر رہی ہو ۔

اُدھر بڑے مندر سے سنکھ اور گھڑیال بجنے لگے ۔ سنکھ ایک نہیں بیسیوں تھے ۔ ان

کی بے سُری آوازیں ایسی تھیں جیسے بھیڑیے رو رہے ہوں۔ پنڈت اور پجاری کرشن واسدیو کے بُت کے آگے سجدہ ریز ہو گئے۔ "ہر ہر مہادیو اور جے جگدیش ہرے" کا واویلا بپا ہو گیا۔ سب اسے دیوتاؤں کا قہر کہہ رہے تھے۔ گھروں میں جنہوں نے بُت اور مورتیاں رکھی ہوئی تھیں وہ اِن کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑانے لگے مگر یہ دیوتاؤں کا قہر تھا یا خدا کا، یہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ سنکھوں کی آوازوں نے طوفان کی چیخوں کو زیادہ بھیانک بنا دیا۔

راجے، مہاراجے، اُن کے محافظ اور بڑے بڑے دلیر سورمے خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ وہ اس کو طوفان نہیں، جنوں، بھوتوں، چڑیلوں اور بدروحوں کا خونریز رام لی سمجھ رہے تھے۔ اس طوفان میں جو لگتا تھا دنیا کو ختم کرنے آیا ہے، قیس ایک ہندو لڑکی کو بازوؤں پر اٹھائے ایک پرانے ویران مندر کی طرف جا رہا تھا۔ لڑکی نے بازو اُس کے گلے میں ڈال رکھے تھے اور گال بچوں کی طرح اُس کے گالوں کے ساتھ دبائے ہوئے تھے۔ اُس پر نیم غشی طاری تھی۔ بجلی کے دھماکے سے وہ بدک کر ہوش میں آجاتی تھی۔ طوفان قیس کے پاؤں اکھاڑ رہا تھا۔ اوپر سے درختوں کے ٹہن لپک لپک کر اُسے پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ کیچڑ میں پھسلا، گرا مگر اُس نے لڑکی کو سنبھالے رکھا۔

ایک بار بادل بڑے قہر سے گرجے اور اس کے ساتھ ایسی بھیانک چنگھاڑ سنائی دی کہ قیس رُک گیا۔ اُس کی مردانگی جواب دے گئی۔ بجلی چمکی تو اُسے اپنے سامنے دو ہاتھی دکھائی دیئے جو سونڈیں اوپر کئے ہوئے چنگھاڑتے چلے آ رہے تھے۔ یہ کسی مہاراجہ کے ہوں گے۔ وہ دُور نہیں تھے۔ پچیس تیس قدموں کا فاصلہ تھا۔ دونوں ہاتھی سخت ڈرے ہوئے پہلو بہ پہلو دوڑے آ رہے تھے۔ قیس کے جسم سے کنکریوں کی بوچھاڑوں جیسی بارش اور بے پناہ تند ہواؤں نے طاقت چوس لی تھی، پھر بھی وہ بائیں کو دوڑا اور پھسل کر گر پڑا۔ لڑکی اُس کے نیچے تھی۔ ہاتھی اوپر آ گئے۔ قیس نے لڑکی کو دھکا دے کر دُور پھینک دیا اور خود کچلے جانے کے لیے تیار ہو گیا لیکن اُس نے زور دے کر لڑھکنی لی اور اتنا ایک طرف ہو گیا کہ ایک ہاتھی کا پاؤں اُس کے پہلو کے ساتھ پڑا اور ہاتھی آگے نکل گئے۔

لڑکی جو ڈر سے مری جا رہی تھی، دوڑی آئی اور قیس کے اوپر گر پڑی۔ اُس نے قیس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر ماں کی سی بیتابی سے پوچھا۔ "تم ٹھیک ہو؟ بولو.... بولو نا" ــــ اور قیس اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ ایک قدیم مندر کے کھنڈر تھے جو زمین سے خاصے بلند تھے۔ قیس اور ہشام امیر بن تاشفین سے یہیں ملے تھے۔ قیس سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ لڑکی اُس کے بازوؤں پر تھی۔ وہ اُتر گئی۔ کہنے لگی کہ وہ خود اوپر جائے گی۔ طوفان کا زور ابھی ٹوٹا نہیں تھا لیکن قیس کو ہاتھیوں کے نیچے پڑا دیکھ کر لڑکی کی جرأت اور طاقت واپس آ گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے سیڑھیاں چڑھ گئے اور تاریکی میں ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے کو نظر نہیں آتے تھے۔ لڑکی نے ٹٹول کر اُس کے پاؤں پکڑ لیے اور اُس کے پاؤں پر سر رکھ کر اُس کا شکریہ ادا کیا۔

"مجھے گناہگار نہ کرو لڑکی!" ــــ قیس نے اُس کا سر اُٹھاتے ہوئے کہا اور جذبات سے وہ اتنا مغلوب تھا کہ اُس کے منہ سے نکل گیا ــــ "ہمارے مذہب میں یہ گناہ ہے کہ انسان کسی انسان کے آگے سجدہ کرے۔ سجدہ صرف خدا کے آگے کیا جاتا ہے۔"

"تم مسلمان ہو؟" ــــ لڑکی نے چونک کر پوچھا۔

"اگر میں کہہ دوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھ سے ویسی ہی نفرت کرو گی جیسی ہندو مسلمانوں سے کرتے ہیں؟"

"نفرت؟" ــــ لڑکی نے حیرت سے کہا ــــ "تم نے....؟ .... تم نہ ہوتے تو میں زندہ نہ ہوتی.... تم مسلمان ہو تو تم یہ تو نہیں مانو گے کہ یہ دیوتاؤں کا قہر ہے؟"

"میں تمہارے مذہب کی توہین نہیں کرنا چاہتا" ــــ قیس نے کہا ــــ "لیکن یہ میرے خدا کا قہر ہے جو پتھر کے دیوتاؤں اور اُن کی پوجا کرنے والوں پر گر رہا ہے۔ یہ خدا کا اشارہ ہے۔ مجھے اسی خدا نے طاقت دی ہے کہ تمہیں ایسے سخت طوفان میں سے اٹھا لایا ہوں۔"

قیس سادھوؤں کے بھیس میں دریا کے کنارے گیا تھا۔ اُس کا کُل لباس سیلوانیل والا ایک لنگوٹ تھا۔ بارش نے اس کے جسم سے راکھ، داڑھی اور سر کے بالوں میں ڈالی ہوئی سٹی اور راکھ دھو ڈالی تھی۔ لڑکی نے اس سے پوچھا کہ وہ ننگا کیوں ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ دریا میں نہانے گیا تھا۔ طوفان کپڑے اُڑا کر لے گیا اور وہ اسی طرح بھاگ آیا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ متھرا کا میلہ دیکھنے آیا تھا۔ اُس نے لڑکی سے پوچھا کہ وہ کہاں کی رہنے والی ہے۔ اُس نے بلند شہر کی کوئی جگہ بتائی۔ اُس کا پورا کنبہ آیا ہُوا تھا۔ اس کا باپ بھی ساتھ تھا۔ انہوں نے اس شہر سے باہر اپنا خیمہ نصب کیا تھا۔ قیس نے اُسے بتایا کہ اب وہاں خیمہ ہوگا نہ اُس کا کنبہ اور رات اسی کھنڈر میں گزارنی ہوگی۔

"میں تمہیں ایک بات کہنا چاہتی ہوں" ــــ لڑکی نے رُک رُک کر کہا۔ "تم مرد ہو اور میں نوجوان لڑکی ہوں۔ میری ابھی شادی نہیں ہوئی ..... ہمیں رات یہیں گزارنی ہے"

ــــ لڑکی کے لہجے میں التجا تھی۔ قیس سمجھ گیا۔ اُس نے کہا ــــ "میں تمہیں اپنے لیے نہیں تمہارے ماں باپ کے لیے اُٹھا لایا ہوں ..... میں تم سے ایک وعدہ لیتا ہوں۔ کسی کو یہ پتہ نہ چلنے دینا کہ میں مسلمان ہُوں، ورنہ ہندو میرے ساتھ بہت بُرا سلوک کریں گے۔ میں اپنا نام جگدیش بتاؤں گا"

لڑکی جس نے اپنا نام اُوشا بتایا تھا، کیا ہر شرط ماننے کو تیار تھی۔ اُس نے بڑا پکا وعدہ کیا۔ پھر رات گزرنے لگی۔ اُوشا کی آنکھ بار بار کھلتی تھی۔ اُسے اب طوفان کا نہیں، اُس مرد کا ڈر تھا جس کے ساتھ وہ اس کھنڈر میں تنہا تھی۔

آخری بار اُوشا کی آنکھ کھلی تو کمرہ روشن تھا۔ کوئی کھڑکی اور روزن نہیں تھا۔ دروازے کے کواڑ نہیں تھے۔ دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ قیس دروازے میں بیٹھا اُسے دیکھ رہا تھا۔ رات کا طوفان رات کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا تھا۔ قیس کے چہرے پر حیرت تھی اور ایسی ہی حیرت اُوشا کے چہرے پر بھی تھی۔ قیس اس لیے حیران تھا کہ اُس نے اس قدر خوبصورت اور اتنی دلکش لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی اور اُوشا اس لیے حیران

تھی کہ قیس جوان آدمی تھا جس کے جسم کے پٹھے گوشت سے بھرے ہوئے اور بہت اچھے لگ رہے تھے اور اس جوان مرد نے رات اتنی جوان لڑکی کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔

"اب تمہارے ماں باپ کو تلاش کرنا ہوگا" ــــ قیس نے کہا ــــ "اٹھو چلیں"

اُوشا اُسے ابھی تک حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ابھی اُٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں تشکر کے علاوہ کوئی اور تاثر بھی تھا۔ قیس کے دوبارہ کہنے کے باوجود وہ نہ اٹھی۔ قیس کھڑا ہُوا اُس کے قریب جا بیٹھا۔

"تم نے مجھے زندگی دی ہے" ــــ اُوشا نے کہا ــــ "کیا مجھے باقی زندگی کا سکھ دے سکتے ہو؟"

قیس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"میرے لیے یہ واقعہ معمولی نہیں کہ رات تم نے مجھے طوفان سے بچایا ہے" ــــ اُوشا نے کہا ــــ "اور بات یہ بھی معمولی نہیں کہ تم نے میری عزت بھی بچائی ہے مگر تم مجھے اُس بوڑھے سے نہیں بچا سکو گے جس کے ساتھ میری شادی کی بات ہو رہی ہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو ..... ہندو عورت کی زندگی مرد کے قدموں میں بسر ہوتی ہے۔ ماں باپ جس کے ساتھ چاہیں باندھ دیں اور خاوند مر جائے تو عورت اُس کے ساتھ زندہ جل جاتی ہے یا اسے ہردوار یا یہاں متھرا بھیج دیا جاتا ہے۔ میں اپنی ایک بیوہ سہیلی سے مل ہوں۔ وہ دو سال سے یہاں ہے۔ کہنے کو وہ پاک زندگی بسر کر رہی ہے۔ زیادہ وقت عبادت میں گزارتی ہے مگر اُس کی راتیں کسی نہ کسی پنڈت کے کمرے میں گزرتی ہیں ..... مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ تمہاری باندی بن کے رہوں گی"

قیس کیا کرتا! ــــ ایک جوان آدمی تھا۔ اتنی حسین لڑکی اُسے اپنا آپ پیش کر رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے اوپر جبر کیے ہوئے تھا۔ لڑکی نے اُس کی زنجیریں توڑ دیں۔ اُس نے کہا ــــ "میں امانت میں خیانت نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن تمہاری خواہش کو بھی نہیں ٹال سکتا ..... اُوشا! میرے دل سے پوچھو تو میں تمہیں کسی کے بھی حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ تم میرے دل میں اُتر گئی ہو ..... اُٹھو۔ چلو چلیں"

وہ جب باہر آئے تو مندر کی بلندی سے انہیں بڑا ہی بھیانک منظر دکھائی دیا۔ جہاں خیموں کی بستی تھی وہاں اب ویرانہ تھا۔ یہ لوگ ادھر اُدھر اپنا سامان ڈھونڈ رہے تھے۔ خیمے گرے ہوئے اور پھٹے ہوئے تھے۔ درختوں سے ٹہن ٹوٹے ہوئے تھے اور پانی ہی پانی تھا۔ قیس اُدشا کو ساتھ لے کر سیڑھیاں اُتر گیا۔ وہ تھوڑی ہی دور گئے ہوں گے کہ انہیں بڑی ہی بلند آواز سنائی — "اُدشا!"

دونوں رُک گئے۔ اُدشا نے کہا — "میرا باپ ہے۔ اب ہم بھاگ نہیں سکیں گے۔"

ایک دراز قد، چوڑے چکلے سینے والا آدمی جس کی گھنی مونچھیں اُس کے آدھے چہرے پر پھیلی ہوئی تھیں، دوڑتا آیا اور ادشا کو گلے لگا لیا۔ اُدشا نے اُسے قیس کے متعلق بتایا کہ اس کا نام جگدیش ہے اور اُسے اس نے بچایا ہے اور رات اُس نے اُسے اس مندر کے ایک کمرے میں رکھا اور اس پر پہرہ دیتا رہا ہے۔ ادشا نے رات کی ساری بات سنا دی۔

اُدشا کے باپ نے قیس کو گلے لگا لیا اور بولا — "منہ سے مانگو۔ کیا انعام دوں۔ سونا مانگو، میرا گھوڑا مانگو۔"

"میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے" — قیس نے کہا۔ "انعام کا کوئی لالچ نہیں۔ اگر انعام دینا ہی ہے تو مجھے اپنا بیٹا بنا لیں۔ آپ نے اپنی بیٹی کسی کو تو دینی ہے۔ یہ کرم مجھ پر کریں۔ اپنی بیٹی سے پوچھ لیں کہ میں کیسا آدمی ہوں۔"

اُدشا کا باپ خاموش ہو گیا۔ کچھ سوچ کر بولا — "میں تم جیسے بہادروں کی قدر کرتا ہوں۔ تمہارا جسم بہت خوبصورت ہے۔ یہ مرد کا جسم ہے۔ میں فوجی عہدیدار ہوں۔ میں خاندانی سپاہی ہوں۔ میں اپنی بیٹی تمہیں دے کر تمہیں فوج میں لے جانا پسند کروں گا لیکن ایک فوجی عہدیدار سے بات چل رہی ہے۔ میں زبان سے پھر نہیں سکتا۔ کچھ اور مانگو۔"

"آپ کون سی فوج میں ہیں؟" — قیس نے پوچھا۔

"بلند شہر کے راجہ کی فوج میں" — اُدشا کے باپ نے جواب دیا۔

قیس نے کسی خیال سے اس کے ساتھ فوجوں کی باتیں شروع کر دیں۔ اُدشا کے باپ نے سلطان محمود کی بات چھیڑ دی اور اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اُسے شکست دینے کے لیے زندہ ہے۔ وہ چونکہ خاندانی اور پیدائشی فوجی تھا اس لیے وہ فوجوں اور لڑائیوں کی باتیں کرتا رہا، مگر قیس کے دل و دماغ پر ادشا سوار تھی۔ اس کے باپ نے جب لڑکی دینے سے انکار کر دیا تو قیس کو یوں لگا جیسے اُس کے سینے سے اُس کا دل نکالا جا رہا ہو، یا جیسے اُس سے اتنی حسین لڑکی چھینی جا رہی ہو۔ اس کی فطری کمزوریاں اور نفسانی خواہشات اُس کے جذبات اور اُس کی عقل پر غالب آگئیں۔ اگر ادشا کا باپ اُسے دھتکار دیتا یا ادشا کو ساتھ لے کر وہاں سے چلا جاتا تو قیس اس کیفیت سے دوچار نہ ہوتا۔ یہ شخص اس کے ساتھ بڑے پیارے انداز میں دوستانہ باتیں کر رہا تھا اور قیس سوچ رہا تھا کہ وہ اس شخص کو کس طرح راضی کرے۔

اُدشا کے باپ نے غزنی کے جاسوسوں کا ذکر کیا اور کہا — "یہ لوگ ہم میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ وہ محمود کو راز کی ایسی باتیں بتاتے ہیں کہ وہ ہم پر وہیں ضرب لگاتا ہے جو ہماری کمزور رگ ہوتی ہے۔ ہماری فوج میں غزنی کے جاسوسوں کو پکڑنے کا انعام مقرر کیا گیا ہے۔ اگر مجھے کوئی مسلمان جاسوس نظر آجائے تو میں اُسے زندہ اپنے راجہ کے حوالے نہیں کروں گا۔ اُس کا سر کاٹ کر لے جاؤں گا۔"

قیس کا دماغ پھر گیا۔ ادشا باپ کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس مسکراہٹ نے قیس پر نشہ طاری کر دیا۔ کہنے لگا — "اگر میں آپ کو دو تین جاسوس پکڑوا دوں تو آپ مجھے وہ انعام دے دیں گے جو میں نے مانگا ہے؟"

"تم کیسے پکڑواؤ گے؟"

"مجھ سے اور کچھ نہ پوچھیں" — قیس نے کہا — "آپ انہیں پکڑیں اور انہیں زندہ رکھیں۔ ان کے ذریعے آپ غزنی کے بہت سے جاسوس پکڑ سکیں گے۔"

"کب؟" — ادشا کے باپ نے قیس کے کندھے پر ہاتھ مار کر پوچھا۔ "کہاں ہیں وہ؟"

"ابھی... آج ہی" — قیس نے جواب دیا — "وہ یہیں ہیں۔ اگر نہ ملیں تو آپ میری گردن کاٹ سکتے ہیں۔"

"اور اگر مل گئے اور وہ واقعی جاسوس نکلے تو اپنی بیٹی کا ہاتھ متھرا کے بڑے مندر میں تمہارے ہاتھ میں دے دوں گا لیکن راجہ سے انعام میں خود لوں گا۔ مجھے ترقی مل جائے گی۔ مجھے زیادہ آدمیوں کی کمان مل جائے گی۔"

"مجھے منظور ہے۔" قیس نے کہا۔ "میرے ساتھ چلو۔"

قیس تمام رات غائب رہا تھا۔ ہشام اور اس کے دو اور ساتھی اُسے صبح سے ڈھونڈ رہے تھے۔ انہوں نے سادھوؤں کے بھیس میں طوفانی رات ایک مندر میں گذاری تھی۔ قیس شام کو واپس نہیں آیا تھا۔ اب ساتھی اُسے ڈھونڈ رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک ہندو فوجی عہدیدار کو ساتھ لیے اُنہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ اب وہاں کسی کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ لوگ شہر بھر معلوم نہیں کہاں کہاں جا چھپے تھے۔ ہر طرف کیچڑ اور پانی تھا۔

دوپہر کے وقت ہشام سمرقندی کو اپنا ایک ساتھی ملا۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے قیس کو دیکھا ہے۔ وہ سادھوؤں کے بھیس میں نہیں بلکہ اُس نے ایسے کپڑے پہن رکھے ہیں جو اُس کے اپنے معلوم نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ ایک آدمی ہے جو شکل و صورت، قد بُت اور تلوار سے فوجی معلوم ہوتا ہے۔ اگر وہ فوجی نہیں تو بھی آدمی مشکوک ہے اور وہ ہندو لگتا ہے۔ ہشام نے اُسے کہا کہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہہ دے کہ غائب ہو جائیں۔

اُن کے اس ساتھی نے قیس کو دیکھا اور خود اُسے نظر آئے بغیر وہاں کھسک آیا تھا۔ یہ لوگ ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھتے اور ضرورت سے زیادہ احتیاط کیا کرتے تھے۔ قیس کو اُوشا کا باپ اپنے ساتھ لے گیا تھا اور جہاں رات کو اُس نے اپنے کنبے کے ساتھ پناہ لی تھی، وہاں اُسے اپنے کپڑے پہنائے تھے اور اُسے اُس کے ساتھیوں کی تلاش میں لے گیا تھا۔

ہشام کو تاشقین کی باتیں آئیں۔ اُس نے کہا تھا کہ مقامی مُشیروں پر اتنا زیادہ اعتبار نہیں کرنا چاہئے کیونکہ ہندوؤں کے زیرِ سایہ رہتے ہوئے یہاں کے مسلمان ہندوؤں

کا اثر جلدی قبول کرتے ہیں۔ ہشام نے اپنی جگہ جا کر اپنے جسم سے راکھ دھوئی، سر اور داڑھی کے بال صاف کیے، کپڑے پہنے اور سر پر ہندوؤں کے طرز کی پگڑی باندھ لی۔ اُس نے کُرتے کے اندر خنجر چھپا لیا اور قیس کی تلاش میں نکل پڑا۔

بہت دیر بعد اُسے قیس نظر آگیا۔ وہ اُوشا کے باپ کے ساتھ ایک قدیم عمارت کے بیرونی برآمدے میں ستون کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہشام دوسری طرف سے اس کھنڈر میں داخل ہوا اور دبے پاؤں اُس کمرے تک چلا گیا جس کے برآمدے میں قیس بیٹھا تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی جس کے کواڑ نہیں تھے، ان دونوں کی پیٹھ پیچھے تھی۔ ہشام اس کھڑکی کے پیچھے بیٹھ گیا۔

"آپ مایوس نہ ہوں، وہ نظر آجائیں گے۔" قیس اُوشا کے باپ سے کہہ رہا تھا۔ "وہ تین ہیں، تینوں کو پکڑوا دوں گا۔"

"لیکن پوچھنے کے متعلق میں اب بھی نہیں مان رہا کہ وہ مہاراجہ قنوج کا ذاتی محافظ ہے۔" اُوشا کے باپ نے کہا۔ "تم کہتے ہو کہ تم اُس کے سامنے نہیں جاؤ گے۔ اور میں سوچتا ہوں کہ میں مہاراجہ کے خاص آدمی پر کس طرح الزام عائد کردوں کہ وہ غزنی کا جاسوس ہے ... وہ مہاراجہ قنوج سے بڑا دانشمند آدمی ہے۔"

"میں اُسے پکڑنے کا طریقہ بھی سوچ لوں گا۔" قیس نے کہا۔

ہشام نے اپنے کُرتے کے نیچے سے خنجر نکالا۔ اس کی نوک زہر میں بجھی ہوئی تھی۔ جسم پر اس کی خراش ہی کافی تھی۔ اس کا زہر سارے جسم میں پھیل جاتا تھا۔ ہشام کھڑا ہوگیا۔ فاصلہ صرف پانچ چھ قدم تھا۔ اُس نے پوری طاقت سے خنجر پھینکا۔ خنجر قیس کی پیٹھ میں اتر گیا۔ وہ اٹھا، چکرا کر گر پڑا۔ ہشام اُس کمرے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اُوشا کا باپ سمجھ گیا کہ خنجر کس طرف سے آیا ہے۔ وہ کھنڈر کے اندر دوڑا گیا۔ ہشام دوسری طرف جا نکلا۔ اُوشا کا باپ کھنڈر میں قاتل کو ڈھونڈ رہا تھا۔ ہشام برآمدے میں آیا اور قیس کی پیٹھ سے خنجر نکال کر اُسی طرف چلا گیا جدھر سے آیا تھا۔ اُوشا کا باپ اُسے کھنڈر کے اندر اور باہر ڈھونڈتا رہا۔ قیس مر چکا تھا۔

اُس رات بڑے مندر کے پنڈت نے تمام راجوں، مہاراجوں کو مندر میں بلایا۔

"میں نے آپ سب کو سونے اور چاندی کا یہ انبار دکھانے کے لیے بلایا ہے" — پنڈت نے انہیں سونے کے زیورات اور نقدی کے ڈھیر دکھاتے ہوئے کہا۔

"کل رات میں آپ کے پاس تھا جب طوفان آیا تھا۔ مجھے دوسرے پنڈتوں نے جو اس وقت ہری کرشن کی پوجا کر رہے تھے، بتایا ہے کہ دیوتا کی آنکھیں پہلے سفید ہوئیں پھر سرخ ہو گئیں، پھر ان آنکھوں سے شرارے نکلے اور فوراً بعد بادل کی ہیبت گرج سنائی دی۔ گھنٹیاں اپنے آپ بجنے لگیں۔ دیوتا کی آنکھوں کا رنگ قرمزی ہو گیا اور بجلی کڑکنے لگی، پھر طوفان آ گیا....

"یہ وہ وقت تھا جب مہاراجہ قنوج کے فانوس گر پڑے تھے اور آگ لگ گئی تھی۔ کیا آپ دیوتاؤں کے اس اشارے کو نہیں سمجھتے؟ رات کا طوفان دیوتاؤں کا قہر تھا۔ رات کو کئی لوگ مندر میں جمع ہو گئے تھے۔ یہ لوگ رات بھر یہاں ماتھے رگڑتے رہے ہیں۔ مجھے صاف اشارہ ملا ہے کہ جب تک غزنی کے سلطان کا سر کاٹ کر ہری کرشن واسدیو کے قدموں میں نہیں رکھا جائے گا، یہ قہر ہم پر پڑتا رہے گا۔ رات کو کئی لوگ مارے گئے ہیں۔ یہی انجام آپ کا ہوگا...

"میں اپنے لوگوں کو بتا رہا ہوں کہ جب تک اسلام کے لیے ہندوستان کا راستہ کھلا ہے، دیوتاؤں کی آنکھیں آگ برساتی رہیں گی۔ میں نے لوگوں کو بتایا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے شکست دینے کے لیے بہت بڑی فوج کی اور مالی مدد کی ضرورت ہے۔ یہ دیکھو، عورتوں نے اپنے زیورات اور مردوں نے اپنی نقدی میرے آگے ڈھیر کر دی ہے۔

میں یہ دولت آپ کے حوالے نہیں کروں گا۔ آپ کی فوجیں جب غزنی کی فوج کے خلاف لڑ رہی ہوں گی اس وقت میں آپ کو آپ کی فوجوں کے اخراجات سے آزاد کر دوں گا۔ تمام خرچ متھرا کے اس مندر سے پورا ہوگا۔ آپ کی شکست میری شکست ہے۔ دیوتا مجھ سے جواب مانگیں گے کہ میں نے آپ کے دلوں میں اپنے مذہب کی برتری اور محبت اور اسلام کی نفرت پیدا نہیں کی...

"فتح وہ لوگ حاصل کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں اپنے دشمن کی اور اس کے مذہب کی نفرت ہو۔ نفرت ایک قوت ہوتی ہے۔ مسلمان اتنی دور سے آ کر ہمیں اس لیے شکست

دے جاتے ہیں کہ ان کے دلوں میں ہماری نفرت بھری ہوئی ہے۔ وہ ہمارے مذہب کو جھوٹا سمجھتے ہیں۔ اب آپ کو ثابت کرنا ہے کہ مذہب ہمارا سچا ہے۔ آپ کو غزنی کی فوج پر قہر بن کر گرنا ہے۔"

پنڈت نے راجوں مہاراجوں کو اسلام کے خلاف بھڑکا کر مژدہ سنایا کہ ہری کرشن واسدیو نے اسے اشارہ دیا ہے کہ اب مسلمانوں کو فیصلہ کن شکست ہوگی۔ پنڈت بیٹھ گیا تو لاہور کے مہاراجہ بھیم پال، قنوج کے مہاراجہ راجیا پال، اوجین کے راجہ کول چند کے علاوہ بلند شہر اور چند اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے راجوں کی وہ تاریخی کانفرنس ہوئی جس کے بعد سلطان محمود غزنوی کو ہندوستان پر تاریخی یلغار کرنی پڑی۔ اس نے اپنی تاریخ کی ایک ایسی پیش قدمی کی جسے آج تک تاریخ دان اور فن حرب و ضرب کے یورپی مبصر خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔ ایک مؤرخ سر آرل سٹین نے لکھا ہے — "محمود غزنوی غزنی سے متھرا تک قلعے سر کرتا، تیز و تند طغیانی کی طرح آیا اور متھرا اور قنوج کو اجاڑ گیا۔"

اس وقت کی تحریروں سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ اس کی ان فتوحات کے پیچھے اس کی انٹیلی جنس (دیوان شغل اشراف مملوکات) کا ہاتھ تھا۔ اس نے ان مہاراجوں کی تیاری کی اطلاع قبل از وقت اور مکمل معلومات مل جانے پر برق رفتار پیش قدمی کی اور انہیں آ دبوچا۔

لاہور کا مہاراجہ بھیم پال نندہ اور کالنجر (کوٹل کشمیر) کا راجہ جانکی بھی سلطان محمود کے باجگزار تھے اور ان میں یہ معاہدہ ہوا تھا کہ بھیم پال غزنی کے خلاف کوئی جنگی کارروائی نہیں کرے گا اور بوقت ضرورت غزنی کی فوج کو ہندوستان میں جس مدد کی ضرورت ہوئی، دے گا۔ یہی معاہدہ کالنجر کے راجہ نے کیا تھا۔

یہ دونوں مہاراجے ۱۰۱۸ کے موسم برسات میں متھرا کے بڑے مندر میں بہت سے راجوں مہاراجوں کے ساتھ بیٹھے سلطان محمود کو فیصلہ کن شکست دینے اور غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا منصوبہ تیار کر رہے تھے۔ بھیم پال نندہ نے اس کانفرنس

میں صاف کہہ دیا کہ اس منصوبے میں وہ پیش پیش نہیں ہوگا، درپردہ ساتھ ہوگا۔

اُس نے وجہ یہ بیان کی کہ سلطان محمود کے خلاف جتنی لڑائیاں اُس کے خاندان نے لڑی ہیں، وہ اور کسی نے نہیں لڑیں اور ہر بار اُسے اپنا نقصان اپنے ذرائع سے پورا کرنا پڑا ہے اور اُس نے مجبور ہو کر سلطان محمود کے ساتھ صلح اور باج کا معاہدہ کیا ہے۔

اس منصوبے کی قیادت مہاراجہ قنوج راجیا پال کو دی گئی۔ مورخوں نے لکھا ہے کہ اتنی بڑی سکیم کی قیادت کا اہل مہاراجہ قنوج ہی تھا۔ اُس کے پاس جنگی فہم و فراست بھی تھی، جنگی طاقت بھی تھی اور شمالی ہند میں قنوج کی گدی احترام کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، لہٰذا مشترکہ کمان اسی کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ منصوبہ کچھ اس طرح بنا کہ تمام راجوں مہاراجوں کی آدھی آدھی فوجوں کی ایک مشترک فوج بنائی جائے اور باقی نصف متعلقہ قلعوں میں تقسیم کر دی جائے تاکہ سلطان محمود جوابی حملہ کرے یا کسی اور راستے سے آجائے تو قلعہ بند فوج اُسے روکے۔ مشترک فوج کے لیے طے پایا کہ پشاور کی طرف پیش قدمی کرے اور سلطان محمود کو پشاور کے قریب (درہ خیبر کی سمت) میدان میں للکارا جائے اور اس سے پہلے فوج کا کچھ حصہ پہاڑیوں میں جگہ جگہ گھات میں بٹھایا جائے جو اُس کی جنگی طاقت کو پہاڑیوں میں ہی کمزور کر دے۔

اس منصوبے پر سب نے اتفاق کیا۔ سب نے کرشن واسدیو کے بت کے سامنے کھڑے ہو کر حلف اٹھایا کہ وہ اس منصوبے کی کامیابی کے لیے جان اور مال کی قربانی دیں گے۔

امیر بن تاشقین مہاراجہ قنوج کے ذاتی محافظ کی حیثیت سے وہاں موجود تھا۔ تین چار اور مہاراجوں کے ذاتی محافظ بھی اندر بتوں کی طرح کھڑے تھے۔

متھرا سے تقریباً ایک سو میل دور شمال مشرق میں دریائے گنگا میں گرنے والے ایک چھوٹے دریا رام گنگا کے کنارے بلند شہر واقع ہے۔ اُس دور میں یہ چھوٹی سی ایک راجدھانی تھی اور اس کا نام بارن یا برن ہوا کرتا تھا۔ اس کا راجہ ہردت بھی اس کانفرنس میں موجود تھا۔

"ہم نے سلطان محمود کو شکست دینے کا بڑا اچھا منصوبہ بنا لیا ہے"۔۔۔ راجہ ہردت

نے کہا۔۔۔ "لیکن کسی نے بھی اس پہلو پر توجہ نہیں دی کہ مسلمان ہر بار کیسے فتح حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ بھی سوچیں کہ اُن کے پاس کونسا جادو ہے جو ہم میں نہیں..... میں ان کی ایک خوبی بیان کروں گا۔ غزنی کے جاسوس بہت تیز اور ہوشیار ہیں۔ وہ غزنی کی فوج کی سب سے بڑی طاقت ہیں.... اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہاں بھی غزنی کے جاسوس موجود ہیں اور ہماری باتیں سُن رہے ہیں۔ رات طوفان میں کچھ جانیں ضائع ہوئی ہیں اور آج غزنی کا ایک جاسوس اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ میری فوج کے ایک عہدیدار نے اتفاق سے ایک جاسوس سے اُس کا اصل روپ معلوم کر لیا تھا۔ اس جاسوس نے اپنے تین ساتھیوں کو پکڑوانا چاہا مگر معلوم نہیں کدھر سے ایک خنجر آیا اور یہ جاسوس ہلاک ہو گیا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے جاسوس کیسے ہیں اور ان کی نظر کہاں تک پہنچتی ہے"۔

راجہ ہردت نے اوشا کے باپ سے سنا ہوا تھا اور اوشا کا سارا واقعہ سُنا دیا، پھر کہنے لگا۔۔۔ "مرنے والے نے ایک ایسے جاسوس کی نشاندہی کی تھی جس کا ابھی نام نہیں لیا جا سکتا کیونکہ اُسے ایسی حیثیت حاصل ہے کہ الزام غلط ہوا تو ہم میں نفاق پیدا ہو جائے گا"۔

ہردت نے انکھیوں امیر بن تاشقین کی طرف دیکھا جو بت بنا کھڑا تھا۔ وہ اندر سے لرز گیا مگر بت کی طرح کھڑا رہا۔ راجوں مہاراجوں نے ہردت سے کہا کہ وہ اُس جاسوس کا نام لے لیکن اس نے کہا کہ وہ پہلے اپنے طور پر سراغرسانی کرے گا، پھر اس جاسوس کو سب کے سامنے کھڑا کر دے گا۔

یہ محفل برخاست ہوئی تو مہاراجہ قنوج نے راجہ ہردت کو ساتھ لے لیا اور اُس سے پوچھنے لگا کہ چونکہ اُسے مشترکہ کمان دے دی گئی ہے، اس لیے اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کسے جاسوس سمجھ رہا ہے جسے یہاں اتنی اونچی حیثیت حاصل ہے کہ وہ اُس پر الزام لگانے سے ڈرتا ہے۔ ہردت اُسے ٹالتا رہا کیونکہ تاشقین ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ مہاراجوں کے خیمے اُڑ جانے کی وجہ سے اُن کے لیے مکان خالی کرا لیے گئے تھے۔ مہاراجہ

قنوج اپنی رہائش گاہ میں پہنچا تو اُس نے تاشقین کو جسے وہ جگن ناتھ سمجھتا تھا، چھٹی دے دی اور وہ ہر دت کو اپنے ساتھ اندر لے گیا۔

چمپا مہاراجہ کی لاڈلی رانی تھی۔ وہ اُس کے انتظار میں تھی۔ اُس نے مہاراجہ اور راجہ ہر دت کو شراب کے پیالے پیش کیے اور مہاراجہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ہر دت نے چمپا کی طرف دیکھا تو راجیپال اشارہ سمجھ گیا۔ اُس نے چمپا سے کہا کہ ایک ضروری بات کرنی ہے اس لیے وہ کچھ دیر کے لیے دوسرے کمرے میں چلی جائے۔ چمپا چلی تو گئی لیکن تجسس نے اُسے دروازے کے ساتھ ہی روک لیا اور وہ باتیں سننے لگی۔

"میں جو بات کرنے لگا ہوں، وہ اُس قسم کے مطابق ہے جو ہم سب نے مندر میں کھائی ہے" — راجہ ہر دت نے کہا — "مجھے میرے عہدیدار نے بتایا ہے کہ آپ کا یہ ذاتی محافظ جگن ناتھ نہیں امیرین تاشقین ہے اور یہ غزنی کا بڑا ہی دانشمند اور ہر فن مولا جاسوس ہے۔ میرے عہدیدار کو یہ بات اُس جاسوس نے بتائی تھی جو قتل ہو گیا ہے... آپ کو میری بات اچھی نہیں لگی ہو گی۔"

"آپ کی بات مجھے بُری نہیں لگی" — مہاراجہ راجیپال نے کہا — "لیکن میں مان نہیں سکتا کہ کوئی اجنبی مجھے اس طرح دھوکہ دے سکتا ہے۔ میں آپ کے الزام کو ٹالوں گا نہیں۔"

"اگر آپ سننے کی ہمت رکھتے ہیں تو میں ایک بات اور بھی کہنا چاہتا ہوں" — راجہ ہر دت نے کہا — "آپ کے لیے حسین لڑکیوں کی کمی نہیں۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ چمپا رانی اور آپ کے ذاتی محافظ کا در پردہ دوستانہ ہے۔ اگر آپ چھوٹی رانی کی خادمہ سے پوچھیں جو اُس کے ساتھ پرسوں رات دریا پر گئی تھی تو آپ کو حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ لڑکی اس جاسوس کے ساتھ مل کر آپ کے لیے ایک حسین دھوکہ بنی ہوئی ہے۔"

"ذرا کھل کر بتائیں کہ آپ کو یہ باتیں کس طرح معلوم ہوئی ہیں" — مہاراجہ راجیپال نے کہا — "میں خادمہ کو آپ کے سامنے بلاؤں گا اور صبح آپ میرے محافظ اور میری رانی کی لاشیں دیکھ لینا۔"

"اُس عہدیدار کو میں نے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے" — راجہ ہر دت نے کہا — "وہ باہر

کھڑا ہے۔ آپ اُس کی زبانی جاسوسوں کے متعلق سن سکتے ہیں" — اور اُس نے چمپا اور تاشقین کی دوستی کی تفصیل سنانی شروع کر دی۔

چمپا وہاں سے دبے پاؤں باہر نکل گئی اور تاشقین کے کمرے میں جا پہنچی۔

"فوراً نکلو اور گھوڑا نکالو" — چمپا نے اُسے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا — "ہم دونوں کا راز کھل گیا ہے۔"

"کیسا راز؟" — تاشقین نے پوچھا — "کیا کہہ رہی ہو؟"

"بلند شہر کا راجہ ہمارے مہاراجہ کو بتا رہا ہے کہ تم جگن ناتھ نہیں، غزنی کے مسلمان ہو۔ معلوم نہیں اُس نے تمہارا کیا نام بتایا ہے... اور اُس نے مہاراجہ کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ میری اور تمہاری در پردہ دوستی ہے۔ وہ میری خادمہ کو بلا رہے ہیں... کیا یہ صحیح ہے کہ تم مسلمان ہو؟"

"کیا تم مجھے پکڑوانے آئی ہو یا مجھے یہاں سے نکل جانے کو کہنے آئی ہو؟"

"مجھ سے کچھ بھی نہ چھپاؤ" — چمپا نے کہا — "میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ فوراً نکلو اور مجھے ایک چادر دو جو میں اپنے اوپر ڈال لوں۔ جلدی کرو۔"

"وہ ٹھیک کہتے ہیں چمپا!" — تاشقین نے کہا — "میں مسلمان ہوں۔ میرا نام تاشقین ہے۔ کیا اب بھی میرے ساتھ چلو گی؟ مسلمان ہو جاؤ گی؟"

"میں تمہارے ساتھ چلنے اور تمہارے ساتھ مرنے کے لیے آئی ہوں" — چمپا نے کہا — "مجھے چادر دو۔"

تاشقین نے ایک چادر چمپا کو دی۔ تلوار کمر سے باندھی اور خنجر بھی کمر بند سے اُڑس لیا۔ دونوں اصطبل کی طرف چل پڑے۔ اُدھر مہاراجہ راجیپال نے گرج کر حکم دیا کہ اُس کے محافظ اور چمپا رانی کو فوراً حاضر کیا جائے۔

تاشقین نے چمپا کو ایک جگہ اندھیرے میں کھڑا رہنے کو کہا اور خود اُس جگہ چلا گیا جہاں گھوڑے بندھے تھے۔ اُس کی حیثیت ایسی تھی کہ اُس کا حکم فوراً مانا جاتا تھا۔ اُسے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ اُس نے سائیس سے کہا کہ اس کے گھوڑے

کی زین وغیرہ جلدی لائے۔

اُدھر مہاراجہ کو بتایا گیا کہ چپا رانی معلوم نہیں کہاں ہے۔ مہاراجہ نے حکم دیا کہ دونوں کو فوراً تلاش کرو۔ اگر وہ بھاگنے کی کوشش کریں تو انہیں ہلاک کر دیا جائے۔
اس حکم پر دس بارہ محافظ جو مہاراجہ کے پہرے پر رہتے تھے، دوڑ اٹھے۔ ایک جلتی مشعل سے انہوں نے تین چار مشعلیں جلالیں اور ساتھ لے گئے تھے۔

تاشقین کا گھوڑا تیار ہو گیا۔ وہ اس پر سوار ہوا اور وہاں پہنچا جہاں چپا اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ اُس نے چپا کو اپنے پیچھے سوار کرلیا مگر گھوڑا موڑا تو آگے سے مشعلیں آ رہی تھیں۔ شہر کا دروازہ کھلا تھا مگر اب اُدھر سے نکلنا مشکل تھا۔ اُس نے گھوڑا دوسری طرف موڑا۔ اسے محافظوں کی للکار سنائی دی کہ رک جاؤ ورنہ تیر آ رہے ہیں۔
وہ نہ رکا۔ اُسے چپا کی چیخ سنائی دی۔ وہ اتنا ہی کہہ سکی کہ میری پیٹھ میں دو تیر اُتر گئے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ گھوڑے سے گر پڑی۔

گھوڑا بڑے زور سے ہنہنایا اور رکنے لگا۔ تاشقین سمجھ گیا کہ گھوڑا بھی تیروں کا نشانہ بن گیا ہے۔ گھوڑا بے لگام ہونے لگا تو تاشقین دوڑتے گھوڑے سے کودا۔ اُس کے قریب سے تیر گزر گئے۔ وہ ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ اپنے تعاقب میں آنے والوں سے پہلے ہی وہ گلی کے دو تین موڑ مڑ گیا۔ اسے چپا کا کوئی غم نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ مر چکی ہو گی۔ اُسے اس لڑکی کے خون کا بدلہ نہیں لینا تھا۔ وہ جس فرض کے لیے یہاں آیا تھا، اُسے وہ پورا کر نا تھا۔ اُسے غزنی پہنچنا تھا۔
اُسے معلوم تھا کہ شہر کی دیوار کا ایک حصہ دریا کے بالکل ساتھ ہے اور رات کی بارش سے دریا میں آیا ہوا پانی دیوار کو چھو رہا ہو گا۔ گلیوں میں اس کے تعاقب میں آنے والے شور مچاتے جا رہے تھے۔ تاشقین اُس چوڑی ڈھلان تک پہنچ گیا جو دیوار کے اوپر جاتی تھی۔ نیچے کے شور سے دو سنتری جو دیوار پر پہرہ دے رہے تھے، اُس کے راستے میں آ گئے۔ اُس نے ان کے قریب جا کر تلوار نکالی اور ایک کے پیٹ میں اتار دی۔ دوسرا بھاگ اٹھا۔ مشعل بردار محافظ ڈھلان تک آ گئے۔ تاشقین دیوار پر دریا کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے دیوار بہت اونچی تھی۔ اُس نے

دریا میں چھلانگ لگا دی۔
متھرا سے غزنی تک کا ہوائی فاصلہ سات سو میل ہے۔ راستے میں سات بڑے دریا آتے ہیں۔ آدھے سے زیادہ راستہ پہاڑی علاقوں سے گزرتا ہے۔ تاریخ دان لکھتے ہیں کہ یہ تین مہینوں کی مسافت تھی۔

سلطان محمود غزنوی خوارزم کو اپنی سلطنت میں شامل کر چکا تھا۔ خوارزم کی فوج کو اُس نے غزنی کی فوج میں مدغم کر لیا تھا اور اُس نے بھرتی کی مہم تیز کر دی تھی۔ اس کی بہت سی فوج ضائع ہو چکی تھی۔ اُس نے مسجدوں میں اعلان کروائے تھے کہ ہندوستان جو محمد بن قاسم کے دور میں اسلامی ملک بنتا جا رہا تھا، ہندوؤں کا بُت خانہ بن گیا ہے اور وہاں اسلام کے سرچشمے کو بند کرنے کے جنگی منصوبے بن رہے ہیں۔ ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اسلام کا پیغام دور دور تک پہنچائیں اور ہندوستان سے بُت خانوں کا خاتمہ کریں۔ یہ ایک ایسی شیطانی قوت ہے جسے وہیں نہ دبایا گیا تو یہ اسلام کی بقا کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائے گی۔
مسجدوں میں امام اسی موضوع پر وعظ دیتے اور لوگوں کو فوج میں شامل ہونے کے لیے تیار کرتے تھے۔ یہ وعظ قرآن اور احادیث کے حوالوں سے بھی ہوتے تھے اور جذباتی انداز سے بھی۔ سلطان محمود کا یہ پیغام مسجدوں اور مدرسوں میں اور سرکاری انتظامات کے تحت سلطنت کے گوشے گوشے میں پہنچایا گیا!
"سلطانی ایک بڑا نازک فرض ہے جو خدا نے مجھے سونپا ہے۔ سلطان کا کام صرف حکومت کرنا نہیں ہوتا۔ اس کے فرائض میں شامل ہے کہ قوم کو خوشحال اور باوقار رکھے اور اولیت اس کو ہے کہ جنگی طاقت اتنی تیار کرے کہ اپنے دین کے دشمنوں کے پاس خواہ کتنی ہی جنگی طاقت ہو، وہ سر نہ اٹھا سکیں اور اگر اُس کے پڑوس میں مسلمانوں پر کفار ظلم و تشدد کر رہے ہوں تو ان کی نجات کے لیے خود بھی جائے اور قوم کو بھی اس جہاد کے لیے تیار کرے ..... مجھے قوم کے تعاون کی ضرورت ہے۔ غزنی کے شیر دل آؤ ہم اپنی زندگی میں یہ فرض پورا کر جائیں۔"

سلطان محمود غزنوی جس قدر قابل جرنیل تھا، اتنا ہی قابل ناظم تھا۔ ہندوستان سے وہ جو زروجواہرات لے جاتا تھا، انہیں وہ لوگوں کی فلاح وبہبود اور تعلیم و تربیت پر خرچ کیا کرتا تھا۔ اس کا کچھ حصہ وہ فوج کے سپاہیوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ چونکہ لوگ خوشحال تھے اس لیے وہ سلطان کے اشاروں پر سرگرم عمل ہو جاتے تھے۔ اب ۱۰۱۷ء کے آخر میں اُس نے اپنی سلطنت میں فوجی بھرتی کا جنون طاری کر دیا۔ وہ اپنے سالاروں سے کہنے لگا تھا — "مجھے اپنے والد محترم کی یہ وصیت پوری کرنی ہے کہ ہندوستان کے بت خانے ختم کر کے وہاں اسلام پھیلانا ہے۔ مجھے خواب میں بھی یہی اشارہ ملا تھا۔ میرے پیرو مرشد شیخ ابوالحسن خرقانیؒ نے بھی یہی حکم دیا ہے۔ میری عمر تھوڑی رہ گئی ہے اور مہم بڑی دور کی ہے۔"

سلطان ہندوستان کی خبروں کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ وہ یہ سننے کے لیے بیتاب رہتا تھا کہ ہندوستان کے راجے مہاراجے اُس کے خلاف جنگی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ۱۰۱۷ء کا سال ختم ہو چکا تھا۔ ۱۰۱۸ء کے تین مہینے گزر گئے تھے۔ اسے کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔

ایک روز اُسے بتایا گیا کہ ہندوستان سے امیر بن تاشتقین نام کا ایک آدمی آیا ہے۔

"تاشتقین آگیا ہے؟" — سلطان نے اچھل کر اُٹھتے ہوئے کہا — "فوراً بلاؤ۔"

جب تاشتقین اندر آیا تو سلطان حیرت سے پیچھے ہٹ گیا۔ یہ زرد رُو، مریل چہرہ جس پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی، تاشتقین کا نہیں تھا۔ اس کی کمر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ اُس سے پاؤں پر کھڑا نہیں ہُوا جا رہا تھا۔ سلطان نے اُسے سہارا دے کر بٹھایا اور اُس کے لیے مشروب اور کھانا لانے کو کہا۔

"تین مہینوں کا سفر ڈیڑھ مہینے میں طے کیا ہے" — تاشتقین نے ہانپتی آواز میں کہا — "متھرا میں گرفتار ہو چلا تھا۔ خدا نکال لایا ہے ... ہندوستان کا نقشہ لا دیجئے ... گھوڑے سے چوری کرتے اور دوڑا دوڑا کر مارتے پہنچا ہوں۔ ایک آدمی کو گھوڑے کی خاطر قتل کرنا پڑا۔ ایک دریا بغیر گھوڑے کے تیر کر پار کیا۔ گھوڑے پر ہی سوتا رہا ہوں۔"

اس نے مشروب پیا اور سانسوں کو سنبھالتے ہوئے اُن [illegible] اور راجوں کے نام بتائے جنہوں نے مندر میں کانفرنس کی تھی۔ سلطان کو ان کا منصوبہ بتایا اور نقشے پر اُسے دکھانے لگا کہ متھرا، قنوج، بلند شہر اور مہابن کہاں کہاں ہیں اور اس علاقے میں گھنے جنگل کے علاوہ گنگا اور جمنا بہت مشکل پیدا کریں گے۔ پھر اُس نے نقشے پر وہ چھوٹے چھوٹے قلعے دکھائے جن میں مہاراجوں نے مشترکہ فوج کی نصف نفری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"وہ پشاور کے اُس میدان میں آکر لڑنا چاہتے ہیں جہاں آپ بھیم پال نڈر کے باپ جے پال کو شکست دے چکے ہیں" — امیر بن تاشتقین نے کہا — "وہ ملتان کی پہاڑیوں تک اپنے دستے ہمارے انداز سے گھات میں بٹھائیں گے۔ اگر ہماری فوج آگے نکل گئی تو چھوٹے چھوٹے قلعوں کی فوج ہمارا راستہ روکے گی۔"

"لاہور کے بھیم پال کے کیا ارادے ہیں؟" — سلطان محمود غزنوی نے پوچھا۔

"وہ آپ سے ڈرتا بھی ہے اور اس منصوبے میں بھی پوری طرح شامل ہے۔"

"اُسے ایسا ہی کرنا چاہیے" — سلطان نے کہا — "اُسے اپنی شکست کو فتح میں بدلنا چاہیے۔ ہندوستان کے راجپوت دلیر لوگ ہیں۔ غیرت والے بھی ہیں ... کیا تم بتا سکتے ہو کہ ان کی فوجیں کب تک اکٹھی ہو سکیں گی اور وہ پیشقدمی کب تک کریں گے؟"

"کم از کم ایک سال لگے گا" — تاشتقین نے کہا — "متھرا کے پنڈت انہیں جلدی کرنے کو کہہ رہے تھے۔"

"ہم ان کا انتظار ملتان اور پشاور میں نہیں کریں گے" — سلطان نے کہا — "ان سے ہماری ملاقات متھرا اور قنوج میں ہو گی ... تاشتقین! پورا ایک مہینہ آرام کرو۔ تم بہت زیادہ انعام کے مستحق ہو۔ یہ تمہیں تھوڑی دیر میں مل جائے گا۔"

"دشمن کو تیاری کی حالت میں جا پکڑو" — سلطان محمود اپنے سالاروں اور نائب سالاروں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں بتا رہا تھا — "دشمن کو حملہ کرنے کی مہلت نہ دو۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہند کے مہاراجے کس طرح اکٹھے ہو رہے ہیں اور وہ فوج کو کس طرح تقسیم کر رہے ہیں۔ ہم اس وقت انہیں جا دبوچیں گے جب ان کے دستے مشترکہ

فوج بنانے کے لیے سفر کی حالت میں ہوں گے۔ ہمارا سب سے بڑا شکار متھرا ہوگا۔ یہ ہمیں تاشتین نے مجھے بتایا ہے کہ متھرا کے بت بہت مقدس سمجھے جاتے ہیں اور متھرا ہندوؤں کے کرشن مہاراج کا جائے پیدائش ہے۔ کرشن ان کا پیغمبر تھا۔ تاشتین نے بتایا ہے کہ اُس کا بت سنگِ مرمر کا ہے اور اس کی آنکھیں نہایت خوشنما اور بیش قیمت ہیروں کی ہیں۔ سارے ہند کے ہندو اس بت کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔۔۔

"ہمیں فوراً کوچ کرنا ہے۔ ہم پنجاب میں سے نہیں گزریں گے۔ وہاں کا مہاراجہ بھیم پال ہمارا باجگزار ہے مگر اُس کی نیت ٹھیک نہیں۔ ہم کشمیر کی اُن پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ جن کے دامن میں پنجاب واقع ہے، گزریں گے۔ ذہن میں رکھیں کہ ہمارے راستے میں سات دریا آئیں گے۔ پہاڑ اور جنگل آئیں گے۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ ہم اپنے ملک سے بہت دور جا کر لڑیں گے۔ ہمیں نہ کمک ملے گی نہ رسد۔ رسد ہمیں راستے سے پوری کرنی ہے"

سلطان محمود نے ہندوستان کا نقشہ جو اُس نے اپنے ہاتھ سے چادر جتنے بڑے کپڑے پر بنا رکھا تھا، سب کے سامنے رکھتے ہوئے یہ بتایا کہ پیش قدمی کا راستہ یہ ہوگا اور متھرا پر براہِ راست حملہ نہیں ہوگا۔ پہلے اردگرد کی ریاستوں کو ختم کیا جائے گا۔

"لیکن یہ مہم آسان نہیں ہوگی" ___ سلطان نے کہا۔ "ہم جان کی بازی لگا رہے ہیں۔ مہاراجہ قنوج مہاراجہ بھیم پال سے مختلف ہے۔ سنا ہے وہ لڑنا اور اپنی فوج کو لڑانا جانتا ہے۔ ہمارے آدمیوں نے متھرا میں جہاں لاکھوں ہندو جمع تھے غزنی کی فوج کی ایسی دہشت پھیلائی ہے کہ وہاں کے لوگ بھگدڑ مچا دیں گے مگر یہ نہ بھولنا کہ کسی کے مذہب پر اور مقدس مقام پر حملہ ہو تو وہ جان کی بازی بھی لگا دیا کرتا ہے"

سلطان محمود نے دیگر ہدایات دیں اور تیاری کے لیے صرف تین دن دے کر چوتھے روز کوچ کا حکم دے دیا۔

سلطان محمود نے بروز ہفتہ ۲۷ ستمبر ۱۰۱۹ء (۱۳ جمادی الاول ۴۰۹ھ) غزنی سے کوچ کیا۔ مورخوں میں اس کی جنگی طاقت کے متعلق کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ علبی نے (۔) کی فوج کی تعداد گیارہ ہزار باقاعدہ فوج اور بیس ہزار رضا کار لکھی ہے جو صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ فرشتہ نے تعداد ایک لاکھ سوار اور بیس ہزار پیادہ لکھی ہے۔ فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان نے یہ فوج ترکستان، خوارزم، خراسان اور چند اور بڑی علاقوں سے اکٹھی کی تھی۔ پروفیسر محمد حبیب نے مورخوں کے حوالے سے فوج کی تعداد ایک لاکھ سوار اور پیادہ اور بیس ہزار رضا کار لکھی ہے۔

یہ فوج کئی میل لمبی تھی اور رفتار بہت تیز۔ یہ فوج دریائے سندھ اور جہلم اس حالت میں پار کر گئی کہ دونوں دریاؤں میں طغیانی تھی۔ مورخ لکھتے ہیں کہ بیل گاڑیوں اور گھوڑا گاڑیوں کے لیے کشتیوں کے پل بنائے گئے مگر فوج نے انسانی پل بنا کر دستے پار کر دیئے۔ دریائے راوی دور اُوپر سے اُس جگہ سے پار کیا گیا جہاں پاٹ بہت چوڑا ہو جاتا تھا اور دریا کئی شاخوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

سلطان نے اس سے آگے کسی ذمہ دار گائیڈ کی ضرورت محسوس کی۔ اُس نے اپنا ایک ایلچی کالنجر (موجودہ کوٹلی) کے راجہ کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ اُسے قنوج تک ایک رہبر کی ضرورت ہے۔ ایلچی کے ساتھ سلطان نے ایک محافظ دستہ بھیجا۔

"سلطانِ غزنی محمود نے سلام بھیجا ہے" ___ ایلچی نے راجہ کالنجر سے اُس کے دربار میں کہا ___ "سلطان نے وہ معاہدہ یاد دلایا ہے جس کے تحت آپ غزنی کی فوج کی مدد کرنے کے پابند ہیں۔ سلطان نے کہا ہے کہ میری منزل کہاں اور ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری فوج کو اپنے ہاں آنے پر مجبور نہیں کریں گے۔ اگر آپ آزاد اور خود مختار رہنا چاہتے ہیں تو میری ضرورت فوری طور پر پوری کر دیں۔ رہبر ایسا بھیجیں جو دھوکہ نہ دے۔ دھوکے کی صورت میں میں اسے اپنے خلاف اعلانِ جنگ سمجھوں گا"۔

راجہ سوچ میں پڑ گیا۔ ایلچی نے کہا ___ "سلطان کے ساتھ جو فوج ہے آپ کی ریاست [illegible]"

راجہ نے اُسی وقت اپنے بیٹے شاہی کو (جسے بعض مورخوں نے ثنالی لکھا ہے) ایلچی کے ساتھ روانہ کر دیا۔ سلطان نے اُسے ساتھ لے لیا اور اُسے قنوج تک چھوٹے سے چھوٹے راستے سے لے چلنے کو کہا۔ راستے میں کئی قلعے تھے۔ سلطان محمود نے ہر قلعے کا محاصرہ کر کے قلعہ داروں سے کہا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں۔

بیشتر قلعہ داروں نے اوپر سے سلطان کی فوج دیکھی تو سفید جھنڈا لہرا دیا۔ سلطان نے ہر قلعے سے اپنی ضرورت کا سامان لے لیا اور بعض اہم قلعوں میں اپنی کچھ نفری چھوڑ دی اور قلعے کے ہندوستانی دستے کو گاڑیاں دھکیلنے اور سامان اٹھانے کے لیے ساتھ لے لیا۔ سبط ابن الجوزی اور عنصری لکھتے ہیں "سلطان محمود کی اس قدر دہشت تھی کہ اس کے آگے قلعے اور چھوٹے بڑے شہر اور قصبے جیسے اپنے آپ فتح ہوتے جا رہے تھے۔"

سر آرل سٹین نے لکھا ہے "جن گھنے جنگلوں میں ہوا بھی راستہ بھول جاتی ہے ان میں سے سلطان اپنی فوج گزار کر لے گیا۔ اس نے پنجاب کے پانچ دریا جیسے اڑ کر پار کیے ہوں، اور وہ بلند شہر تک سمندر کی موجوں کی مانند پہنچ گیا۔"

سلطان محمود نے متھرا کو اپنی سکیم کے مطابق نظر انداز کر دیا اور ۲ دسمبر ۱۰۱۸ء (۲۰ رجب ۴۰۹ھ) کو دریائے جمنا پار کیا۔ اس کے سامنے سرساوا (جو اس وقت شارود کہلاتا تھا) کا قلعہ آ گیا۔ اس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا لیکن محاصرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہاں کا راجہ اپنے کنبے کو ساتھ لے کر بھاگ گیا۔ اس کی فوج نے بغیر لڑے ہتھیار ڈال دیئے۔ سلطان کو قلعے سے تیس ہاتھی ملے۔ اسے اس علاقے میں ایک اڈے کی ضرورت تھی۔ اس نے اسی قلعے کو رسد گاہ بنا لیا۔ قلعے سے دس لاکھ درہم خزانہ ہاتھ آیا۔

سرساوا سے سلطان نے بلند شہر کا رخ کر لیا جو وہاں سے کم و بیش ایک سو میل دور تھا اور وہاں پہنچنے کے لیے ایک تو دریائے گنگا عبور کرنا تھا، دوسرے راستہ گھنا تھا۔ چونکہ سلطان کو ایک اڈہ مل گیا تھا اس لیے اس نے رسد کے قافلے کو ساتھ گھسیٹنے کی بجائے صرف فوج ساتھ لی۔ قیدیوں سے کشتیوں کا پل بنوایا اور دونوں دریا پار کر کے بلند شہر کو محاصرے میں لے لیا۔

بلند شہر کا حکمران راجہ ہردت تھا جس نے مہاراجہ قنوج کو بتایا تھا کہ اس کا ذاتی محافظ جگن ناتھ سلطانی جاسوس ہے اور جے پال ثانی کے ساتھ اس کی در پردہ دوستی ہے۔ دوسرے راجوں مہاراجوں کے ساتھ اس نے بھی متھرا کے مندر میں حلف اٹھایا تھا کہ مذہب اور بھارت کے لیے جان و مال کی قربانی دے گا مگر اس کے شہر میں لوگوں کو اطلاع ملی کہ

شہر کو غزنی کی فوج نے محاصرے میں لے لیا ہے تو لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ سارے شہر پر دہشت طاری ہو گئی۔ یہ غزنی کے جاسوسوں کی پھیلائی ہوئی دہشت تھی۔ سلطان نے قلعے کے دروازے پر اپنے آدمی بھیج کر اعلان کرایا کہ ہتھیار ڈال دو، ورنہ شہر کو ملبے میں بدل دیا جائے گا۔

ابھی دروازے کو ٹکریں مار کر توڑنے کے لیے سامنے کھڑے کر دیئے گئے۔ راجہ ہردت نے ایسی بزدلی کا مظاہرہ کیا کہ قلعے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آ گیا۔ اس کے پیچھے دس ہزار نفری کی فوج بھی ہتھیاروں کے بغیر باہر آ گئی۔ ہردت کو سلطان کے پاس لے گئے۔

"میں اپنی، اپنے کنبے اور اپنی فوج کی سلامتی چاہتا ہوں۔" راجہ ہردت نے سلطان سے کہا۔ "میں اور یہ دس ہزار فوجی اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہمیں اپنے مذہب میں قبول کر لیں۔"

زیادہ تر مورخین نے لکھا ہے کہ یہ دس ہزار افراد صرف فوجی نہیں تھے۔ ان میں شہریوں کی تعداد زیادہ تھی۔ انہوں نے ہردت کو مجبور کیا تھا کہ وہ شہر کو تباہی سے بچانے کے لیے صلح کر لے ورنہ وہ اپنے زیر اثر فوجیوں کے ساتھ دروازہ کھول دیں گے۔ ایک مورخ گردیزی نے لکھا ہے کہ راجہ ہردت دھوکہ دے کر بھاگ گیا تھا۔

سلطان محمود نے ان دس ہزار افراد کو قلعے میں پابند کر دیا، اور رات کے وقت اس نے فوج سے دریائے گنگا عبور کرایا مگر اس نے متھرا کا رخ نہ کیا بلکہ متھرا کو نظر انداز کر کے مہابن کی طرف پیش قدمی کی۔ اسے اطلاع ملی تھی کہ مہابن کے راجہ کول چند نے اپنی فوج جنگل میں لڑائی کے لیے تیار رکھی ہوئی ہے۔ کول چند کو گھنے جنگل کا فائدہ حاصل تھا۔ اس کی فوج میں ہاتھی بھی تھے جنہیں اس نے حملے کے لیے تیار رکھا ہوا تھا۔

سلطان محمود نے اپنی فوج کا زیادہ تر حصہ جنگل کے دونوں پہلوؤں میں بھیج دیا اور صرف ہراول کے دستے جنگل کے اندر اس انداز سے بھیجے جیسے وہ دشمن سے بے خبر ہوں۔ یہ دستہ جنگل کے وسط میں پہنچا تو کول چند نے حملے کا حکم دے دیا۔ سلطان کا دستہ گھوڑسوار تھا، گھنے جنگل میں بکھر گیا۔ یہ گھنے جنگل کی لڑائی تھی جس میں تیر انداز زیادہ مؤثر ثابت

نہیں ہو رہے تھے۔ مسلمان گھوڑ سوار پھرتی سے اِدھر اُدھر ہو جاتے تھے۔

اچانک کُول چند کی فوج پر دائیں بائیں اور عقب سے قیامت ٹوٹ پڑی۔ ہراول دستہ ایک طرف ہو گیا۔ ہندوؤں کی فوج کے لیے اب کٹ مرنے اور بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ سر آرل سٹین نے اس لڑائی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے — "اتنے گھنے جنگل میں غزنی کی فوج بالوں میں کنگھی کی طرح پھر گئی۔ آگے دریائے جمنا تھا جو اس فوج نے عبور کیا تھا۔ کول چند کی فوج دریا میں کود گئی اور بہت کم نفری زندہ رہی۔ ان میں سے جو کنارے پر آتا تھا اُسے سلطان تیر انداز ختم کر دیتے تھے۔"

راجہ کُول چند کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس کے خوبصورت محل میں گئے تو اُس کے چوبدار نے بتایا کہ راجہ کی ایک بیوی اور ایک بچہ تھا۔ اُس نے دونوں کو تلوار سے قتل کیا اور اپنا خنجر اپنے دل میں گھونپ لیا ہے۔ چوبدار نے اندر لے جا کر تینوں کی لاشیں دکھائیں — راجہ کُول چند کے ایک سو پچاسی جنگی ہاتھی غزنی والوں کے ہاتھ لگے۔

متھرا کے متعلق امیر بن التنتین نے سلطان محمود کو بتایا تھا کہ اس کے اردگرد دیوار بہت مضبوط ہے لیکن اس کا دفاع مہاراجہ قنوج کی فوج کے ایک مدد دستے کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ مہابن کی فوج کی ذمہ داری میں متھرا کا دفاع بھی تھا۔ مہر ساوا اور بلند شہر والے اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے تھے کہ کسی بیرونی حملہ آور نے متھرا پر حملہ کیا تو وہ لٹیرے متھرا تک نہیں پہنچنے دیں گے۔ وہ جمنا کو متھرا کا قدرتی دفاع کہا کرتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سلطان محمود نے نہایت دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے متھرا کے اردگرد کے قلعے سر کیے پھر مہابن کی فوج کو راستے سے ہٹایا اور اطمینان سے متھرا کی طرف بڑھا۔ اُس نے متھرا کو دُور سے دیکھا تو عش عش کر اُٹھا۔ بعد میں اُس نے غزنی کے گورنر کو متھرا کی خوبصورتی اور ہندوؤں کے قدیم فنِ تعمیر کے متعلق خط میں لکھا تھا — "یہاں کی عمارتیں یہاں کے عقیدتمندوں کے عقیدوں کی طرح مضبوط ہیں۔ زیادہ تر سنگِ مرمر کی ہیں۔ بہت سے مندر ہیں جو تھوڑے سے عرصے میں تعمیر نہیں ہوئے ہوں گے۔ ان کی تعمیر پر کروڑوں دینار صرف ہوئے ہوں گے اور ان کی تعمیر دو صدیوں میں مکمل ہوئی ہو گی ..... میں اس شہر کے حسن کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔"

سلطان محمود کی فوج کا نقصان بہت کم ہُوا تھا۔ وہ خود اعتمادی سے متھرا کی طرف بڑھا جا رہا تھا۔ مہابن کی فوج کے بھگوڑے متھرا پہنچ گئے تھے اور انہوں نے لوگوں میں خوب دہشت پھیلائی تھی۔ اس سے پہلے ہشام اور اُس کے ساتھی دہشت پھیلا چکے تھے۔ مہابن کے شکست خوردہ سپاہیوں نے متھرا میں یہاں تک کہا کہ غزنی کی فوج کے آگے درخت اُکھڑ جاتے ہیں۔ ان افواہوں کا یہ اثر ہُوا کہ شہر کی آبادی دفاع میں لڑنے کی بجائے مندروں میں اکٹھی ہو گئی۔ سنکھ اور گھنٹیاں بجنے لگیں۔

غزنی کی فوج نے شہر کا محاصرہ کیا تو نہایت معمولی مزاحمت ہوئی۔ شہر کے دروازے کھل گئے اور سلطان محمود شہر میں داخل ہو کر سب سے پہلے بڑے مندر میں گیا جہاں کرشن واسدیو کا بُت رکھا تھا۔ بہت خوبصورت بُت تھا۔ اس کی آنکھوں میں بیش قیمت ہیرے لگے ہوئے تھے۔ پانچ بُت سونے کے تھے۔ ان کی بھی آنکھیں ہیروں کی تھیں۔ ان سب ہیروں کی قیمت فرشتہ کے مطابق پچاس ہزار دینار تھی۔ ایک اور بُت سونے کا تھا۔ اس میں چار سو مثقال وزنی ہیرے جیسا پتھر جڑا ہُوا تھا۔ اس بُت کو پگھلایا گیا تو ۹۸۳۰۰ مثقال خالص سونا نکلا۔ ایک مثقال ساڑھے چار ماشے کا ہوتا ہے۔ ایک سو بُت چاندی کے تھے۔

سلطان محمود نے پتھر کے بُت توڑ ڈالے اور سونے چاندی کے بُت پگھلا دیئے۔ ہندو مت کے اس مرکز کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کے لیے سلطان محمود بیس روز متھرا میں رہا۔ شہر جلتا رہا اور خالی ہوتا رہا حتیٰ کہ متھرا کھنڈروں کا شہر بن گیا۔

مہاراجہ قنوج نے اپنا دفاع مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ اب اُس کی باری تھی۔